نقوشِ ماجدی

نعیم الرحمٰن صدیقی ندوی

نقوشِ ماجدی

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے مختصر سوانح، ان کی تصانیف کی مکمل فہرست، ممتاز اہل علم کی نگاہ میں ان کا مرتبہ، چند تصانیف ماجدی کا مطالعہ و تعارف اور مولانا کے علمی و ادبی آثار پر مختصر مضامین کا مجموعہ

نعیم الرحمٰن صدیقی ندوی

صدق فاؤنڈیشن، لکھنؤ

بار اول

۱۴۳۵ھ - ۲۰۱۴ء

نام کتاب	:	نقوشِ ماجدی
نام مؤلف	:	نعیم الرحمٰن صدیقی ندوی
صفحات	:	۳۰۴
تعداد اشاعت	:	۱۰۰۰
کمپوزنگ	:	عامر کمپیوٹر اینڈ پرنٹرس لکھنؤ، 9305202797
طباعت	:	نعمانی آفسیٹ پریس، لکھنؤ
قیمت	:	-/200 روپے

اسٹاکسٹ

مکتبة الشباب العلمية

شباب مارکیٹ، ندوہ روڈ، لکھنؤ-۲۰

فون نمبر: 0522-3253912, 9696437283, 9198621671

ناشر

صدق فاؤنڈیشن

خاتون منزل، حیدر مرزا روڈ، گولہ گنج، لکھنؤ-۲۲۶۰۱۸

Mobile: 9335929670, Email: nrsiddiqui@rediffmail.com

یہ کتاب

اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ

کے

جزوی مالی تعاون

سے شایع ہوئی ہے۔

انتساب

راقم آثم بہ صد ادب وخلوص یہ اوراق اپنے خاندانی بزرگوں خصوصاً

والدماجد شیخ محمود الرحمٰن صدیقیؒ

(وفات: ۱۱؍جنوری ۲۰۱۴ء)

ابن شیخ محمد قدیر الزماںؒ

والدہ ماجدہ صدیقہ خاتونؒ

(وفات: ۱۵؍جون ۲۰۱۰ء)

بنت حبیب احمد قدوائیؒ

مایہ سکون عائشہ قدسی قدوائی

اپنے تمام بھائی بہنوں

(جن میں حقیقی، چچازاد، ماموں زاد، پھوپھی زاد اور خالہ زاد سب شامل ہیں، اس امید کے ساتھ کہ ان میں سے کوئی سعید روح فخر خاندان بلکہ فخر المتاخرین مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے مشن کو فروغ دے۔

ع ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی)

اور مادر درس گاہ

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ زادها اللہ شرفاً وعظماً وصانها اللہ عن الشرور والفتن.

(جس سے مولانا دریابادی کو بے حد محبت اور عقیدت تھی)

کی جانب منسوب کرتا ہے۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف

قطعہ تاریخ تالیف کتاب

یہ محنت ایک صدیقی کی محنت
عبارت ہے خلوص واقعی سے
جسے دیکھو یہ کہتا ہے "جہاں میں
١٥٩
چراغاں ہے نقوش ماجدی سے"

١٨٥٤ + ١٥٩ = ٢٠١٣ء

_____ رئیس الشاکری

فہرست

باب اول

باب دوم

باب سوم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش گفتار

مایہ ناز مفسر قرآن اور ممتاز ادیب وصحافی مولانا عبدالماجد دریابادیؒ (۱۹۷۷ء-۱۸۹۲ء) عہد حاضر کے ایک باکمال اور توفیق یافتہ اہل قلم تھے۔ ان کو رب کریم نے علم کی دولت، قلم کی امانت اور وقت کی قدر کرنے جیسی بہترین نعمتوں سے مالا مال کیا تھا۔ انہوں نے ایک طرف تو قرآنیات اور اسلامیات کے باب میں بیش بہا خدمات انجام دیں تو دوسری طرف انہوں نے صحافت، فلسفہ، نفسیات، سوانح نگاری اور ادب کے دیگر گوشوں کو بھی اپنے قیمتی رشحات قلم سے بھرپور نوازا۔

مولانا دریابادی کے اسلوب میں رقت سامانی، حزن آفرینی اور عبرت زائی کے عناصر خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کی ہر تحریر میں شگفتگی، رعنائی اور سلاست پائی جاتی ہے۔ موضوع جیسا بھی ہو وہ اپنے قلم کی جولانی، خیال کی رعنائی اور طرز ادا کی دل آویزی کو روکتے نہیں تھے۔ ان کی نثر کا ہر پہلو اپنے اندر بے پایاں دل کشی رکھتا ہے۔ بقول نظیری ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جا ست

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ ایک زندہ، متحرک، روشن ضمیر، چشم کشا، حقیقت شناس اور آفاق بیں عالم کی طرح اپنے گردوپیش سے پوری طرح باخبر رہتے تھے۔ ان کی طبیعت میں ہمہ گیری، خودداری، خوداعتمادی، صاف گوئی، بے باکی، حق شناسی، اسلام اور اسلامی تہذیب وثقافت سے اٹوٹ محبت، وقت کی پابندی، مغربی تہذیب وتمدن اور لادینی و

غیر اسلامی کلچر سے نفرت پوری طرح رچی بسی ہوئی تھی۔ ان خصوصیات کا اثر ان کے قلم صدق رقم سے جھلکتا ہی نہیں چھلکتا بھی تھا۔

ایک سچے آدمی کی علامت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے باطن کے خلاف گواہی نہیں دیتا اور اپنے ضمیر کی آواز کو خاموش نہیں کرتا۔ مولانا دریابادی کی شخصیت اسی کلیے سے عبارت تھی اور اس کا اظہار ان کی تمام تحریروں میں واضح طور پر ہوتا ہے۔

اپنی عمر کے ابتدائی چند برسوں میں عبدالماجد فلسفی کے نام سے مشہور دبستان شبلی کے اس ذہین وفطین طالب علم پر رب ماجد کا خصوصی فضل وکرم یہ ہوا کہ اپنی عمر کے پختہ دور میں بندۂ ماجد خانقاہ اشرفی کا دلق پوش ہوکر اسلامی علوم وافکار اور ادب صالح کی اشاعت کرتا ہوا دنیائے فانی سے رخصت ہوا۔

ارشاد خداوندی ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا۔ (سورہ مریم: ۹۶) یعنی: بے شک جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے خدائے رحمٰن ان کے لیے (لوگوں کے دل میں) محبت پیدا کر دے گا۔

مفسر دریابادیؒ کی قابل رشک زندگی مذکورہ آیت ربانی کی روشن تفسیر تھی۔ انہوں نے اپنی حیات مستعار کا ہر لمحہ اسلام کی حقانیت کے اثبات، اس کی سربلندی کی کوشش اور قرآن کریم کی خدمت کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ رب ماجد نے بندہ ماجد کی اپنے دین مبین کی خدمت قبول کی اور ان کی یاد اپنے بندوں کے دلوں میں باقی رکھی۔ چناں چہ مولانا دریابادیؒ کی وفات کے بعد ہی سے ان کے سوانح سے لوگوں کو واقف کرانے اور ان کے پیام اور افکار کی نشر واشاعت کا جو سلسلہ شروع ہوا، وہ بفضلہٖ آج بھی ختم نہیں ہوا ہے۔

مولانا دریابادیؒ اور ان کی جلیل القدر خدمات پر لکھنے والے متعدد ہیں۔ ان کے حالات کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس پر سیر حاصل بحث نہ ہو چکی ہو۔ اس لیے اب کوئی نئی بات لکھنا مشکل ہے، لیکن راقم آثم کا ماجدی سوانح نگاروں کے سلسلۃ الذہب میں شامل ہونا گو تابع مہمل ہی کی حیثیت سے سہی، باعث صد افتخار اور لائق ہزار شکر ہے۔ یہی جذبہ

ان اوراق کی تالیف وتدوین کا محرک ہوا ع

بلبل ہمیں کہ قافیہ گل شود بس است

آیندہ اوراق میں بیسویں صدی مسیحی کے اسی گوہر شب تاب کے حالات وعلمی مآثر کو بیان کیا گیا ہے۔ استفادے میں سہولت کی خاطر اس کتاب کو تین ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ باب اول میں مولانا دریابادی کے مختصر سوانح، ان کے قلمی شاہ کاروں کی فہرست، ان کے افکار وکمالات اور شخصیت پر تحریر کردہ کتب، ان پر تحقیقی کام کی فہرست، ان کا مجد علمی اہل علم کی نگاہ میں۔ باب دوم میں صدق فاؤنڈیشن لکھنؤ کی شایع کردہ چند تصانیف ماجدی کا مطالعہ وتعارف۔ باب سوم میں مولانا کی تفسیر، ادب اور صحافت پر تین مضامین پیش کیے گئے ہیں۔

راقم آثم کی اس حقیر کاوش کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھنے اور اس کو اپنے بیش قیمت ''مقدمے'' سے اہل علم کی بارگاہ میں وقیع بنانے کے لیے استاد گرامی قدر برکۃ العصر ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب حسنی ندوی دامت برکاتہم صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی خدمت اقدس میں سپاس گزاری کا نذرانہ پیش ہے۔

اسی کے ساتھ راقم مولانا دریابادی کی علمی وادبی وراثت کے امین اور اس کے فروغ واشاعت میں سرگرم عمل ان کے نبیرگان خال معظم ڈاکٹر عبدالرحیم صاحب قدوائی مدظلہ پروفیسر شعبہ انگریزی علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، ڈائرکٹر یو۔جی۔سی اکیڈمک اسٹاف کالج مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ اور خال محترم ڈاکٹر محمد شافع صاحب قدوائی مدظلہ چیرمین شعبہ صحافت وابلاغ عامہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کا بے حد شکر گزار ہے کہ ان حضرات نے اپنے گراں قدر ''دیباچے'' اور ''پیش لفظ'' سے اس کتاب کو مزین کر کے اس کو جہان علم وادب میں استناد واعتبار بخشا۔ رب کریم ان کو اس کا بہترین صلہ دے۔ آمین

راقم آثم ڈاکٹر محمد شافع صاحب قدوائی کا سپاس گزار ہے کہ انہوں نے کتاب کی زبان وبیان کے سلسلے میں مفید مشورے دیے۔ ان اوراق کی تالیف وتدوین کے سلسلے میں

راقم کو اہلیہ عائشہ قدسی قدوائی سلمہا لیکچرر شعبہ عربی کرامت حسین مسلم گرلس پی. جی. کالج لکھنؤ سے گونا گوں اعانت ملی۔ برادر عزیز فیض الرحمٰن صدیقی سلمہٗ نے ویب سائٹس کی تلاش اور ان کو جمع کرنے میں تعاون کیا۔ کہنہ مشق اسلامی شاعر مولانا رئیس الشاکری ندوی کا شکریہ بھی واجب ہے کہ انہوں نے از راہ نوازش ایک قطعہ تاریخ تالیف بھی مرحمت فرمایا۔ یہ قطعہ ص ٦ پر درج ہے۔ ان اوراق کی کمپوزنگ اور ان کو قابل اشاعت بنانے کے لیے برادرم حشمت علی کی خصوصی توجہ قابل تعریف ہے۔ اسی طرح راقم مولانا اعجاز احمد ندوی کا بھی شکر گزار ہے کہ کتاب کی تیاری میں ان سے مدد ملی۔ کتاب کی اشاعت میں محترمی ایس. رضوان صاحب سابق سکریٹری اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ کی مخلصانہ اعانت حاصل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ تمام معاونین کو بہترین بدلہ عطا فرمائے۔ آمین

راقم نے فخر خاندان مولانا عبدالماجد دریابادیؒ سے بے پایاں محبت وعقیدت کے اس حقیر نذرانے کو خوب سے خوب تر بنانے کے لیے ان کی خودنوشت سوانح حیات ''آپ بیتی''، منشی برج بھوکھن لال محبؔ کی کتاب ''تاریخ دریاباد'' ڈاکٹر تحسین فراقی کے تحقیقی مقالے ''عبدالماجد دریابادی احوال وآثار'' اور محترمی عبدالعلیم صاحب قدوائی کی کتاب ''مولانا عبدالماجد دریابادی - حیات وخدمات'' نیز متعدد ویب سائٹس سے خصوصی استفادہ کیا ہے۔

رب ماجد سے دعا ہے کہ بندۂ ماجد کی شخصیت والاصفات اور ان کے علمی مآثر کے تعارف کے سلسلے میں راقم آثم کی اس کوشش کو قبولیت اور مقبولیت کا خلعت عطا ہو۔ آمین

سپردم بہ تو مایہ خویش را
تو دانی حساب کم وبیش را

ہیچمداں
نعیم الرحمٰن صدیقی ندوی
صدر
صدق فاؤنڈیشن لکھنؤ

خاتون منزل، لکھنؤ
۵ ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ / ٦ فروری ۲۰۱۴ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم
صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ

الحمد للّٰہ و کفیٰ و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ اما بعد!

گزشتہ اسلامی صدی کی رہنما شخصیتوں میں ایک نام حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کا بھی ہے جنہوں نے ایک فلسفی اور ادیب و ناقد اور صحافی کی حیثیت سے پہچان بنائی اور اپنے قلم میں وہ طاقت پیدا کی جس سے انہوں نے نوجوانوں کے ذہنوں سے اسلام سے متعلق شکوک و شبہات کو دور کیا اور مستشرقین کی طرف سے اسلام پر حملوں کا جواب دیا اور استعماری طاقتوں کے خلاف زبردست قلمی جہاد چھیڑا، اور ملک کی آزادی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اس سلسلہ میں انھیں پہلے مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی اور پھر حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے زیادہ قربت رہی اور حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے تو ان کا تعلق ایک تلمیذ سعید و مسترشد رشید کا تھا اور انہی سے انہیں قرآن مجید کا ذوق بھی حاصل ہوا اور تفسیر لکھی۔ دوسری طرف انہوں نے علامہ شبلی نعمانی سے ادب و تحقیق میں استفادہ کیا اور ان کے نمایاں شاگردوں مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالباری ندوی اور دوسرے ہم عمر علماء مولانا سید مناظر احسن گیلانی وغیرہ کی رفاقت و صحبت سے بھی مستفید ہوئے اور عصری تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ وہ دینی علوم میں دستگاہ رکھنے والے عالم بن گئے، اور اپنی کتابوں، تحریروں اور مقبول عام رسالہ ''صدق'' کے ذریعہ جو پہلے ''سچ'' کے نام سے نکالا تھا ملک و ملت کی تعمیر میں حصہ

لیا، اور مغربی تہذیب، کمیونزم اور ملحدانہ افکار کا زبردست مقابلہ کیا، اور پھر ایسی تفسیر قرآن کی انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں ضرورت محسوس کر کے جس میں دوسرے ادیان خاص طور پر یہودیت ونصرانیت کا تقابلی مطالعہ بھی ہو چنانچہ ان کی یہ تفسیر جس میں انہوں نے دوسرے ادیان کی کتب اور تفسیر کے اہم مصادر ومراجع کا مطالعہ کر کے ایسی تفسیر لکھی جو انگریزی میں چار جلدوں میں اور پھر مزید تفصیل کے ساتھ اردو میں سات جلدوں میں شایع ہوئی۔ مولانا کے یہاں وقت کی بڑی قدر تھی اور وہ ذرا بھی وقت ضائع ہونے نہیں دیتے تھے اور ملنے ملانے میں بھی اس کا لحاظ کرتے۔ سبھی اہل علم اور اہل دین ان کی قدر کرتے تھے اور دین وملت کو ان کی ذات سے جو نفع پہنچ رہا تھا اس کی اہمیت کو سمجھتے تھے، اس لیے ان کی وفات کو سبھی نے بڑے علمی، ادبی، دینی وملی خسارہ کے طور پر محسوس کیا اور ان سے متعلق رسائل وجرائد اور مجلّات نے خصوصی اشاعتیں پیش کیں، اور بعض نے ان کے متعلق تحقیقی مقالات لکھے اور ڈاکٹریٹ بھی کیا اور الگ سے بھی ان کی فکر ودعوت پر کتابیں لکھی گئیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔

اس وقت میرے پیش نظر ان سے متعلق ایک اہم پیش کش انہی کے خاندان کے نور چشم، مولانا نعیم الرحمٰن صدیقی ندوی کی ہے جو انہوں نے ''نقوش ماجدی'' کے نام سے ترتیب دی ہے، جس میں مولانا دریابادی کے مختصر سوانح کے ساتھ ان کی تصانیف کی ایک جامع فہرست اور بعض اہم تصانیف کا تعارف وجائزہ اور ان کے علمی آثر پر بعض مضامین کا انتخاب ہے۔

امید ہے اس معتبر کتاب سے جو انہی کے گھر کے ایک علمی ذوق رکھنے والے فرد کے قلم سے نکلی، لوگ مستفید ہوں گے، اور نوجوانوں کی شخصیت سازی میں بھی یہ کتاب مفید ثابت ہوگی۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور مبارک کرے۔ آمین

محمد رابع حسنی ندوی
ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

۲۴ ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

ڈاکٹر عبدالرحیم قدوائی مدظلہ
پروفیسر شعبہ انگریزی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
ڈائرکٹر یو.جی.سی. اکیڈمک اسٹاف کالج، علی گڑھ

"نقوش ماجدی" کے اولوالعزم مصنف حافظ نعیم الرحمٰن صدیقی ندوی صلاحیت اور صالحیت کا ایک قابل رشک پیکر ہیں۔ ان کی صلاحیت بلکہ مہارت کا ثبوت یہ کہ اب تک موصوف نے مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی ۱۵ سے زائد تصانیف کو جدید علمی معیارات کے مطابق مرتب اور مدون کر کے شایع کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔ اس شوق طباعت میں بھی ان کی طباعی اس طور پر جلوہ گر کہ مولاناؒ کی بعض نایاب اور ناپید تصانیف کو اپنے کارآمد توضیحی حواشی سے مزین کرتے ہوئے انھیں از سر نو زیور طبع سے آراستہ کیا اور دین وادب کے تشنگان کو اس چشمۂ صافی سے سیراب ہونے کی سبیل پیدا کی۔ ان کی اس کوہ کنی کا ایک حالیہ درخشاں مظہر ان کی تالیف "تفسیر ماجدی: نقد ونظر" (۲۰۱۳ء) ہے جو مولاناؒ کی بلند پایہ تفسیر کے محاسن کو محیط متعدد تنقیدی، علمی مقالات پر مشتمل ہے۔ چوں کہ مولاناؒ کا سلسلہ کسی معروف دینی ادارے/تنظیم/تحریک/مکتب فکر سے نہ تھا کہ ان کا قلم ہمیشہ اسلام کی ترجمانی کے لیے وقف رہا، اسی باعث مولاناؒ کی بیش قیمت تصانیف بشمول "تفسیر ماجدی" کی ان کی حیات میں کماحقہ پزیرائی نہیں ہوئی حتی کہ ان کی تصانیف کی

بآسانی اشاعت تک ممکن نہ تھی۔ اس ضمن میں اندوہ ناک باب ان کی اردو اور انگریزی تفاسیر کے نظر ثانی ایڈیشن کا ان کی حیات میں عدمِ اشاعت کا ہے۔ اس میں دخل قارئین کی بے توجہی سے کہیں زیادہ ہمارے دینی اور علمی حلقوں کے مزاج اور ماحول کا ہے کہ شخصیت پرستی اور گروہ بندی کا عفریت ہمارے اوپر مسلط ہے۔ یہاں اصل مذکور فاضل مصنف کی جواں ہمتی ہے۔ اس کا خوش گوار بلکہ تحیر آمیز تجربہ مجھے یہ ہوا کہ موصوف نے ''تفسیر ماجدی'' (انگریزی) کے ملخص ایڈیشن کو حسنِ سلیقہ اور برق رفتاری سے اپنے ادارے صدق فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام ۲۰۰۶ء میں شایع کر کے ہند و پاک کے قارئین کو اس اہم تفسیر سے فیض یاب ہونے کا زریں موقع بہم پہنچایا۔ اصلاً یہ ایڈیشن مفکر اسلام مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی ایماء پر انگلستان کے معروف دعوتی اور علمی ادارے اسلامک فاؤنڈیشن سے اس غرض سے شایع ہوا تھا کہ تقابل ادیان کو محیط اس تفسیر کے مطالعے سے دیارِ فرنگ میں مقیم نومسلموں کو ایقان کی بے بہا دولت میسر آئے۔ مجھے برائے العین علم تھا کہ اسلامک فاؤنڈیشن کو اس کی طباعت میں خاصا وقت بھی لگا اور زرِ کثیر بھی صرف کرنا پڑا۔ یہ محض فاضل مصنف عزیزم نعیم الرحمٰن سلمہٗ کے حوصلے اور اخلاص کی برکت تھی کہ اس کا ہندوستانی چربہ انتہائی قلیل مدت میں اور واجبی قیمت پر منظرِ عام پر آ گیا۔

مولانا دریابادیؒ کی ایمان بخش تصانیف سے بالخصوص اور اشاعت دین اور دعوت اسلام کے اعلیٰ اور ارفع مقصد سے بالعموم عزیزم نعیم الرحمٰن صدیقی کا اشتغال ان کی صالحیت پر دال ہے۔ حفظِ قرآن مجید کی سعادت سے سرفرازی کے علاوہ وہ اشاعت اسلام میں اپنے دور طالب علمی سے اب تک منہمک رہے ہیں۔ اس پُرفتن مادیت پرستی کے دور میں اسلام کی توضیح اور ترویج سے وابستگی بڑی قابل قدر ہے۔ اپنے اسی مقصد کے حصول کے لیے وہ ابتدا سے ندوۃ العلماء لکھنؤ جیسے موقر اسلامی ادارے سے منسلک رہے ہیں اور ان کا قلم اسلام کی ترجمانی کے لیے وقف رہا ہے۔ صالحیت محض منبر اور محراب اور معروف دینی سانچوں تک

محدود نہیں۔ علمی اور قلمی جہاد کے کارزار میں صالح افراد خال خال ملتے ہیں۔ عزیزم سلّمہٗ کا شمار ان ہی سعید ارواح میں ہے۔ یہ امر بھی عزیزم سلّمہٗ کی صالحیت کا آئینہ دار ہے کہ مولانا دریابادیؒ کی میراث علمی کے تحفظ اور فروغ کو انجام دیتے ہوئے انھوں نے اپنے قابل احترام اسلاف کا اتباع کیا بلکہ اپنے مخصوص رنگ میں وہ ان پر سبقت لے گئے۔

عزیزم سلّمہٗ کے پردادا شیخ محمد نعیم الزماں صاحب (م ۱۹۴۴ء) اور دادا شیخ محمد قدیر الزماں صاحب (م ۱۹۸۷ء) مولانا دریابادیؒ کے قریبی عزیز اور اس سے بڑھ کر ان کے مزاج شناس اور قدرداں تھے۔ عزیزم سلّمہٗ قدردانی کی اس خاندانی بلکہ پشتینی روایت کے امین ہیں۔ اقدارِ صالحہ کے تسلسل کی کیسی پُرمسرت اور روشن مثال!

ابتدا میں ذکر عزیزم سلّمہٗ کی صلاحیت کا تھا۔ ترتیب وتدوین، سلیس اور شگفتہ نثر نگاری، اخذ اور استنباط، جمع وترتیب، نکتہ آفرینی اور نکتہ سنجی کی ان کی گوناگوں صلاحیتوں کا مظہر یہ تصنیف ہے۔ بہ اعتبار صنف یہ مولانا دریابادیؒ کی سوانح ہے کہ اس کے مطالعے سے مولاناؒ کی شخصیت، فکروفن اور کتابیات کی مکمل اور مستند تصویر سامنے آجاتی ہے۔ مولاناؒ پر مزید مطالعے کے لیے مآخذ اور حوالوں کی نشان دہی اس پر مستزاد۔

لکھنؤ کے امتیازات متعدد ہیں۔ یہ مشہور عطریات کے لیے بھی رہا ہے۔ ''نقوش ماجدی'' ایسا عطر مجموعہ ہے جس میں مولاناؒ کے علمی کمالات اور خود مصنف کے جذبۂ اخلاص اور حسن ترتیب کا عطر بھی کھنچ آیا ہے۔ اللّٰہم زد فزد۔

عبدالرحیم قدوائی
مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
sulaim_05@yahoo.co.in

۲۵ فروری ۲۰۱۴ء

پیش لفظ

ڈاکٹر محمد شافع قدوائی مدظلہ
چیرمین شعبہ صحافت وابلاغ عامہ
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مادی فتوحات اور جہاں بانیوں سے قطع نظر انسانی تاریخ فراموشی اور استحضار کی ازلی کش مکش سے عبارت ہے۔ تغیر اور تبدل فراموش کاری کے عمل کو سرعت آفریں بنادیتا ہے اور انسان عہد حاضر اور مستقبل کی ترغیبات کا اس قدر خوگر ہو جاتا ہے کہ اسے ماضی کی طرف راجع ہونے کی چنداں ضرورت محسوس نہیں ہوتی مگر دل پرخوں کی ایک گلابی سے سرشار اور صلے وستائش کی تمنا سے بے پرواہو کر علمی وادبی اکتسابات اور تخلیقی کمالات کی نئی منزلیں سر کرنے والے استحضار اور حافظے کی فتح کو بھی یقینی بناتے ہیں اور ان اشخاص کو یاد کرنا انسانی زندگی کو زیادہ بامعنی اور خوش گوار بنانے کا بہجت انگیز تجربہ بن جاتا ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کے فقید المثال علمی، ادبی اور مذہبی اکتسابات کو یاد کرنا اپنے ماضی کی روشن اور بلیغ وراثت سے خود کو حسی سطح پر مربوط کرنا ہے اور ناسپاسی ہوگی اگر عزیزی نعیم الرحمٰن صدیقی کی تازہ ترین تصنیف ''نقوش ماجدی'' کی تحسین نہ کی جائے کہ انہوں نے مابعد جدید دور میں جب صداقت بھی ایک اضافی شے تصور کی جانے لگی ہے، مرد حق آگاہ اور عالم بے بدل پر ایک مبسوط کتاب لکھی ہے، ان کی یہ کاوش تعارفی بھی ہے اور تجزیاتی بھی اور مولانا دریابادی کی قاموسی شخصیت کے مختلف ابعاد کا معروضی طور پر احاطہ کرتی ہے۔

برصغیر کے علمی، ادبی اور مذہبی حلقے اور بین الاقوامی سطح پر مشرقی علوم اور اسلام سے متعلق کتابوں کا شائق انگریزی داں طبقہ مولانا دریابادی سے واقف ہے مگر ادھر ۲۰ برسوں

میں ادبی اور صحافتی حلقوں میں مولانا کے گراں قدر کارناموں سے واقفیت کم ہوتی جارہی ہے، ہر چند کہ مولانا کی اردو اور انگریزی تفسیر اور ان کی مذہبی کتابیں بدستور مقبول ہیں اور ان کے متعدد ایڈیشن تواتر کے ساتھ شائع ہورہے ہیں۔ عزیزی نعیم الرحمٰن صدیقی نے مولانا دریابادی کے سوانحی کوائف، مذہبی تصانیف، تفسیری، ادبی اور صحافتی کارناموں اور تراجم سے قارئین کو بیک وقت واقف کرانے اور مولانا کی گراں قدر تصانیف کے مشمولات اور ان کے مباحث سے کماحقہ آگاہ کرنے کی غرض سے یہ کتاب بڑے سلیقے سے مرتب کی ہے۔ مولانا کی ''آپ بیتی'' میں ان کے خاندانی حالات، شخصیت کی نشو ونما اور ان کے ذہنی ارتقاء اور تصنیفی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے اور پروفیسر تحسین فراقی نے اپنے تحقیقی مقالے ''عبدالماجد دریابادی احوال وآثار'' میں مولانا سے متعلق عام تفصیلات یکجا کردی ہیں، مگر اس کتاب کا اختصاص یہ ہے کہ مصنف نے موصولہ اطلاعات کو محض یکجا نہیں کیا بلکہ بعض بہت اہم اضافے بھی کیے ہیں۔ مثلاً مولانا نعیم الرحمٰن صدیقی نے لکھا ہے کہ مولانا دریابادی کی تصنیفی زندگی کا آغاز محض پانچ برس کی عمر سے ہوتا ہے اور انہوں نے ۱۸۹۷ء کی ایک تحریر کا حوالہ دیا ہے جس میں مولانا دریابادی نے اپنے نام کے ساتھ بطور تخلص ''شیر'' لکھا تھا۔ اسی طرح مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا اشرف علی تھانوی سے مولانا کی ارادت کا عام طور پر ذکر کیا جاتا ہے مگر مصنف نے اس ضمن میں مولوی عبدالاحد کسمنڈوی اور مولانا عابد حسین فتح پوری کا بھی ذکر کیا ہے۔ اسی طرح مولانا کے سوانحی کوائف میں بعض اہم گوشوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔ راقم الحروف کی والدہ مولانا کی منجھلی بیٹی تھیں اور وہ ان کی سب سے زیادہ مزاج شناس تھیں، ان کا قیام زیادہ تر دریاباد میں والد کے ساتھ رہتا تھا۔ مولانا دریابادی اپنے مکاتیب کی ایک نقل اپنے پاس رکھتے تھے اور یہ کام زیادہ تر میری والدہ حمیرا خاتون (متوفی ۲۰۰۵ء) کرتی تھیں۔ یہی خطوط مکتوبات ماجدی (۷ جلدیں) کی صورت میں شائع ہوئے ہیں۔ مولانا کا جب انتقال ہوا تو میری عمر ۷ ابرس تھی اور میرے بچپن کا زیادہ تر وقت دریاباد میں گزرا۔ ہم لوگ انہیں ابا کہتے تھے اور انہوں نے بچپن ہی سے مجھے لکھنے پڑھنے کی طرف راغب کیا۔ اسی زمانے سے انسائیکلوپیڈیا پڑھنے کی تلقین کی اور انگریزی وہ خود پڑھاتے

تھے۔ مجھ پر بڑی شفقت فرماتے تھے اور یہ بات تو لوگوں کے علم میں ہے کہ مولانا شاعری بھی کرتے تھے۔ اگر اسے تعلّی پر محمول نہ کیا جائے تو عرض کروں کہ ایک بار ابا نے میرے نام کی رعایت سے ایک سجع بھی کہا تھا۔

''دارد امید شفاعت بہ محمد شافع''

مولانا دریابادی ایک کثیر التصنیف تھے۔ مولانا نعیم الرحمٰن صدیقی نے کتابوں کی مکمل فہرست بھی شامل کی ہے مگر مولانا کی کتابیں اکثر دو ناموں سے شائع ہوئی ہیں لہٰذا انہیں الگ تصنیف نہیں کہا جاتا ہے۔ ''اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں'' مولانا کی زندگی میں شائع ہوئی، یہی کتاب میرے والد حبیب احمد قدوائی اور پھر بعد میں چچا عبد العلیم قدوائی نے شایع کی۔ ان کا اندراج دو کتابوں کے طور پر نہیں کیا جانا چاہیے تھا۔ مصنف نے بڑی دقت نظر کے ساتھ سوا ایسی کتابوں کا ذکر کیا ہے جن میں مولانا دریابادی کا ذکر ہے۔ اردو کے بعض اہم ناقدوں مثلاً سید عبداللہ، ظ. انصاری، ممتاز حسن، سلیم احمد اور سردار جعفری وغیرہ نے بھی مولانا دریابادی کا ذکر کیا ہے، ان کا بھی اندراج ہونا چاہیے تھا۔ ساہتیہ اکادمی سے شایع ہونی والی ہندوستانی ادبیات کی انسائیکلوپیڈیا میں بھی مولانا کا ذکر ہے۔ مصنف نے کتابوں اور رسائل کے خصوصی نمبروں کے علاوہ کئی Websites اور wikipedia کا بھی حوالہ دیا ہے جہاں مولانا کا تذکرہ موجود ہے۔ یوٹیوب پر بھی مولانا سے متعلق خاصا مواد موجود ہے۔

نقوش ماجدی کے مندرجات پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے نہ صرف تحقیقی ژرف نگاہی کا ثبوت دیا ہے بلکہ معروضی محاسبے کا بھی لحاظ رکھا ہے۔ زیرِ نظر تصنیف یقیناً ماجد فہمی کی ایک اہم کڑی ہے جس کے لیے عزیزی نعیم الرحمٰن صدیقی مبارک باد کے مستحق ہیں۔ توقع ہے کہ علمی و ادبی حلقوں میں اس کتاب کی قرارِ واقعی پزیرائی ہوگی۔

محمد شافع قدوائی
علی گڑھ

یکم مارچ ۲۰۱۴ء

باب اول

اقلیم علم وادب کے صاحبقراں

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے مختصر سوانح

اصل نام: عبدالماجد
قلمی نام: (مولانا) عبدالماجد دریابادیؒ
تاریخ پیدائش: ۱۶ر مارچ ۱۸۹۲ء مطابق ۱۶ر شعبان المعظم ۱۳۰۹ھ
جائے پیدائش: محلّہ مخدوم زادگان، قصبہ دریاباد (ضلع بارہ بنکی اتر پردیش)
والد ماجد کا نام: مولوی عبدالقادر (ڈپٹی کلکٹر)

خاندانی پس منظر

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ قدوائی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ اس خاندان کے مورث اعلیٰ قاضی القضاۃ شیخ معزالدین ملقب بہ قدوۃ العلم والدین یا عرف عام کے مطابق قاضی قدوہ تھے جو نسلاً اسرائیلی تھے۔ ان کا سلسلہ نسب حضرت ہارون علیہ السلام سے ہوتا ہوا لاوی بن حضرت یعقوب علیہ السلام سے جا ملتا ہے۔ قاضی قدوہ اندازاً دسویں صدی مسیحی میں ہندوستان آئے تھے۔ ان کی نسل میں دس پشتوں کے بعد ایک بزرگ مخدوم شیخ محمد آبکشؒ (متوفی ۸۸۰ھ، ۱۴۷۶ء) گزرے ہیں ان کی گیارہویں پشت میں مفتی مظہر کریم دریابادی (متوفی ۱۲۸۹ھ، ۱۸۷۳ء) تھے جو مولانا دریابادیؒ کے حقیقی دادا

تھے۔ وہ شاہ جہاں پور میں عدالت کلکٹری میں سرشتہ دار فوج داری بھی تھے اور صاحب افتاء مفتی بھی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی حمایت و نصرت کے لیے حریت پسندوں کی میٹنگیں انہی کے مکان پر ہوتی تھیں۔ فتوائے جہاد کا اجرا مفتی مظہر کریمؒ کے دستخط سے ہوا۔ انگریزی حکومت نے اس کی پاداش میں ان کو سزا عبور دریائے شور (جزائر انڈمان میں قید) کی دی تھی۔ وہاں انہوں نے جغرافیہ کی مشہور کتاب مراصد الاطلاع علی اسماء الامکنۃ والبقاع (از صفی الدین عبدالمومن بن عبدالحق البغدادی متوفی ۷۳۹ھ) کا ترجمہ اردو میں کیا۔ اس کے صلے میں ان کی سزا میں تخفیف کر دی گئی۔

مولانا دریابادیؒ کے والد بزرگوار مولوی عبدالقادر (پیدائش ۱۸۴۸ء) تھے۔ انہوں نے فرنگی محل کے اساتذہ خصوصاً مشہور عالم اور شیخ طریقت مولانا محمد نعیم فرنگی محلی (متوفی ۱۹۰۰ء) سے دینی تعلیم حاصل کی۔ باقاعدہ عالم نہ تھے لیکن درس کی اکثر کتابیں پڑھ لی تھیں جس کی بنا پر عملاً عالم کے درجے میں آچکے تھے۔ مولوی صاحب موصوف کو مطالعے اور مضمون نگاری کا شوق تھا اور وہ اس وقت کے مشہور اخباروں مثلاً روزنامہ اودھ اخبار لکھنؤ، سہ روزہ ریاض الاخبار گورکھپور اور ہفتہ وار مشرق گورکھپور میں مذہبی و نیم مذہبی عنوانات پر اکثر مضامین لکھا کرتے تھے۔ وکالت کا امتحان پاس کیا لیکن اس سند سے کبھی کام نہ لیا۔ ملازمت کی ابتدا اسکول میں فارسی کی تدریس سے کی۔ ہردوئی میں نجی طور پر ایک برطانوی باشندے کو فارسی پڑھائی۔ اس نے خوش ہو کر اپنی خصوصی سفارش سے انہیں عدالت فوج داری کی سرشتہ داری دلا دی۔ اس کے بعد یہ اپنی دیانت، جفاکشی اور فرض شناسی سے تحصیل داری کے عہدے تک پہنچ گئے۔ پھر ہردوئی، بارہ بنکی، لکھیم پور کھیری، گونڈہ، بستی، گورکھپور، فیض آباد اور سیتاپور میں ڈپٹی کلکٹر رہے۔ ۱۹۰۴ء میں سیتاپور کے ڈپٹی کلکٹر کے عہدے سے پنشن پائی۔ نہایت دین دار اور ایمان دار مسلمان تھے۔ ۱۹۱۲ء میں حج کے لیے گئے۔ ۱۲؍ ذی الحجہ کو منیٰ میں بیمار ہوئے۔ مکہ معظمہ لائے گئے جہاں ۱۴؍ ذی

الحجہ ۱۳۳۰ھ مطابق ۲۲ر نومبر ۱۹۱۲ء کو انتقال ہوا اور وہاں کے گورستان جنت المعلیٰ میں صحابی رسولؐ حضرت عبدالرحمٰن بن ابوبکرؓ کے جوار میں دفن ہوئے۔

مولانا دریابادی کی ابتدائی تعلیم

۱۸۹۵ء میں مولانا دریابادی کے والد ماجد لکھیم پور کھیری میں ڈپٹی کلکٹر تھے، وہیں مولانا کی بسم اللہ خوانی ہوئی۔ اس کے بعد انہوں نے قواعد بغدادی، ناظرہ قرآن مجید اور اردو و فارسی کی متداول کتابیں پڑھیں، جن میں مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کی ریڈریں، کریما، گلستاں، بوستاں اور سکندر نامہ قابل ذکر ہیں۔ ''کیمیائے سعادت'' کے بعض اجزا کا مطالعہ کیا، ابتدائی خانگی تعلیم میں عربی کی شد بد حاصل کی۔ عربی کے پہلے استاد لکھنؤ کے ایک ذی استعداد شیعہ عالم حکیم محمد ذکی تھے اس کے بعد مزید عربی تعلیم مولانا محمد عظمت اللہ فرنگی محلی سے حاصل کی۔

مزید تعلیم

۱۹۰۱ء میں جب مولانا کا سن ۹ برس تھا تو اسکول میں درجہ سوم میں ان کا داخلہ ہوا۔ انہوں نے درجہ سوم اور چہارم تک برانچ اسکول میں اور پنجم سے درجہ دہم تک تعلیم سیتاپور ہائی اسکول میں حاصل کی۔

اعلیٰ تعلیم

مولانا دریابادی جولائی ۱۹۰۸ء میں کیننگ کالج لکھنؤ (موجودہ لکھنؤ یونی ورسٹی) میں ایف اے (First Year in Art) میں داخل ہوئے۔ اختیاری مضامین منطق، تاریخ اور عربی تھے۔ انٹر میڈیٹ کا امتحان سکنڈ ڈویزن میں پاس کیا۔

انہوں نے جولائی ۱۹۱۰ء میں اسی کالج میں بی اے سال اول میں داخلہ لیا، مضامین، انگلش ٹیکسٹ، جنرل انگلش، فلسفہ اور عربی تھے۔ ۱۹۱۲ء میں بی اے کا امتحان بھی

سکنڈ ڈویزن میں پاس کیا۔

اس کے بعد مولانا نے ایم اے (فلسفہ) کے لیے ایم اے او کالج علی گڑھ (موجودہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) میں داخلہ لیا، سال اول کے امتحان میں شومئی قسمت سے ناکام ہونے کے بعد اسی مضمون میں سینٹ اسٹیفنس کالج، دہلی میں داخلہ لیا لیکن نومبر ۱۹۱۲ء میں والد بزرگوار کے انتقال کے سبب سلسلۂ تعلیم منقطع کر دینا پڑا۔

دیگر احوال

بیسویں صدی مسیحی کا ابتدائی زمانہ خالص عقل پرستی کا زمانہ تھا جس سے مولانا دریابادیؒ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔ مزید برآں کیننگ کالج کی تعلیم، جہاں انہوں نے مذہب بے زاروں اور ملحدوں کی تصنیفات پڑھیں۔ اس کے نتیجے میں مذہبی واخلاقی اقدار پران کے اعتقاد کی بنیادیں متزلزل ہوگئیں۔ اس کے علاوہ بے قید مطالعے کے ان کے شوق نے تشکیک والحاد کی تخم ریزی کی، جس کے سبب ۱۹۰۹ سے ۱۹۱۸ء کی آخری سہ ماہی تک ان پر مذہب بے زاری اور الحاد کا غلبہ رہا۔

الحاد وتشکیک کے بحرظلمات میں ایک دہائی تک سرگرداں رہنے کے بعد رب ماجد کے فضل وتوفیق سے بندۂ ماجد عہد الست میں کی ہوئی اپنی بیعت اول پر واپس آگئے۔

اس عرصے میں مولانا کو مذہب سے قریب لانے اور اسلام کی عظمت وحقانیت کا راسخ نقش بٹھانے میں اکبرالٰہ آبادیؒ، مولانا محمد علی جوہرؒ، مولانا عبدالباری ندویؒ، علامہ سید سلیمان ندویؒ اور ڈاکٹر بھگوان داس کا نہایت اہم کردار ہے۔ اس کے علاوہ بیان القرآن مؤلفہ محمد علی لاہوری، علامہ شبلی کی سیرت النبیؐ، مثنوی مولانا روم، منطق الطیر، نفحات الانس، مکتوبات مجدد سرہندی، تفسیر بیضاوی، تفسیر کشاف اور بھگوت گیتا جیسی کتابیں بھی اسلام کی طرف مولانا کی مراجعت میں بے حد ممد ومعاون ثابت ہوئیں اور بالآخر وہ اسلام کے دائرے میں واپس آگئے۔ اس کے بعد عبدالماجد بی۔اے۔ اور عبدالماجد فلسفی کے نام

سے مشہور اس اہل قلم کو مالک لوح و خالق قلم نے اپنے دین متین کی نگہ بانی و پاس بانی، اپنے کلام مبین کی شرح و ترجمانی اور اسلامی روایات کی حدی خوانی کی نعمت جاودانی سے سرفراز فرمایا۔ چناں چہ دریاباد کی یہ مشت خاک عالم ربانی، عارف یزدانی اور مقبول بارگاہ صمدانی مفسر قرآن مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام سے چاردانگ عالم میں مشہور ہوئی۔

تصنیفی خدمات

مولانا دریابادی کی تحریری مشق کا آغاز ۱۸۹۷ء میں ہوا جب کہ ان کی عمر محض پانچ برس تھی۔ انہوں نے اس وقت اپنے عم محترم مولوی عبدالرحیم (متوفی دسمبر ۱۸۹۷ء) کے نام ایک خط لکھا تھا جس میں اپنے نام کے ساتھ ''شیر'' تحریر کیا تھا۔ مولانا کے عم محترم فارسی کے ادیب اور اردو کے ظریف الطبع انشا پرداز تھے۔ اس کے بعد ۱۹۰۰ء میں جب صوبے کے ہندو نواز اور ہندی پرست لفٹنٹ گورنر انٹونی میکڈانلڈ (Antony Mc. Donald) نے اردو رسم خط پر ضرب لگائی تو اردو نوازوں نے لکھنؤ میں ایک عظیم الشان احتجاجی جلسہ کیا۔ ہشت سالہ مولانا نے اس جلسے سے متعلق دو بڑے لمبے مکتوب اپنے ایک ہم سن عزیز کو لکھ کر باندے بھیجے۔

بالائے سرش زہوش مندی
می تافت ستارۂ بلندی

مولانا کی مضمون نگاری اور تصنیفی زندگی کا باقاعدہ سلسلہ ۱۹۰۴ء میں جب کہ وہ ساتویں درجے کے طالب علم تھے اور عمر کے بارہویں برس میں تھے ایک مضمون سے شروع ہوا۔ ان کا یہ مضمون اس وقت کے مشہور روزنامہ ''اودھ اخبار'' لکھنؤ میں شایع ہوا۔ مولانا نے یہ مضمون اپنے نام سے نہیں بلکہ ایک فرضی نام سے تحریر کیا تھا۔

۱۹۰۸ء میں مولانا نے دو عالمانہ مقالے ''محمود غزنوی'' اور ''غذائے انسانی'' لکھے جو وکیل بک ٹریڈنگ ایجنسی امرت سر نے ۱۹۱۰ء میں کتابی شکل میں شایع کیے ۱۹۱۳ء

میں نفسیات کے موضوع پر سائیکالوجی آف لیڈرشپ (The Psychology of Leadership) نامی کتاب انگریزی میں لکھی جولندن (انگلستان) کے ناشر کتب ٹی فشر ان ون (T. Fisher Un Win) نے نومبر ۱۹۱۵ء میں شایع کی۔

۱۹۲۵ء میں مولانا دریابادیؒ، مولانا ظفر الملک علویؒ اور مولانا عبدالرحمٰن نگرامی ندویؒ کے اشتراک میں ہفتہ وار 'سچ' لکھنؤ کا اجرا ہوا۔ یہ جریدہ مولانا دریابادی کی آخر عمر تک 'صدق' اور 'صدق جدید' کے نام سے نکلتا رہا۔

اس کے علاوہ انہوں نے قرآن اور متعلقات قرآن، حدیث، تصوف، سوانح، آپ بیتی، فلسفہ ونفسیات، سفرنامے، تراجم اور متفرق عنوانوں پر مشتمل چھوٹی بڑی، ستر سے زائد کتابیں تصنیف کیں۔ جن میں اسلام سے ان کی گہری وابستگی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے، خصوصاً تفسیر ماجدی (انگریزی، اردو) جو مفسر دریابادی کے مجتہدانہ انداز، مسحور کن اسلوب اور دل آویز منطقی استدلال کے ساتھ ساتھ مسلک جمہور کی پوری ترجمان ہے۔

تفسیر ماجدی کے ساتھ ساتھ مولانا کی کتابوں میں جو بہت زیادہ مشہور ہوئیں، وہ سفر حجاز، ذکر رسولؐ، حکیم الامت-نقوش وتاثرات، محمد علی: ذاتی ڈائری کے چندورق، تصوف اسلام، انشائے ماجد، آپ بیتی، مناجات مقبول وغیرہ ہیں۔

شوق

مولانا دریابادی نے فٹ بال، کرکٹ اور ٹینس جیسے کھیل بچپن میں کھیلے لیکن مطالعے اور مضمون نگاری کا شوق سب پر غالب رہا۔ ایسا لگتا تھا کہ مولانا کو مطالعے سے عشق نہیں بلکہ اس سے ''نسبت تعبدی'' حاصل ہے۔

ملازمت ومعیشت

مولانا عبدالماجد دریابادی کی تعلیم کی تکمیل ۱۹۱۳ء میں ہوئی۔ اس کے بعد ان

کو قدرتاً فکر معاش ہوئی۔ مولانا ایک زمین دار خاندان کے فرد تھے لیکن ان کے والد ماجد کا ذریعہ معاش اعلیٰ سرکاری ملازمت تھا۔ وہ ۱۹۰۴ء میں ڈپٹی کلکٹری سے وظیفہ یاب ہوئے۔ اس کے بعد وہ ۱۹۱۲ء میں حج بیت اللہ کے لیے عازم ہوئے۔ کعبہ مقصود کے حج کے بعد بجائے وطن واپسی کے وہیں رب کعبہ کے حضور میں حاضر ہو گئے۔ والد ماجد کی ناگہانی وفات کا اثر زیر تعلیم مولانا دریابادیؒ پر قدرتی طور پر ہوا۔ انہوں نے ۱۹۱۳ء میں کیننگ کالج لکھنؤ کے شعبہ فارسی میں اسسٹنٹ پروفیسری کے لیے کوشش کی۔ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر کیمرن ان سے خوش تھے۔ مولانا شبلی نعمانی نے بھی اس جگہ کے لیے ان کے حق میں ایک پرزور سفارشی خط لکھا تھا لیکن وہ ملازمت مولانا دریابادی کو نہ مل سکی۔ اس کے بعد انہوں نے پوسٹ آفس اور ریلوے میں افسر گریڈ کے لیے کوششیں کیں لیکن ناکام ہوئے۔ ماہ نامہ ادیب الٰہ آباد اور ماہ نامہ الناظر لکھنؤ سے قلمی رابطہ رکھا جس سے خفیف آمدنی ہوتی رہی۔ عارضی طور پر علامہ شبلی نے اپنی جلیل القدر کتاب سیرت النبیؐ کے اسٹاف میں شامل کیا۔ اس سے کچھ آمدنی ہوئی۔ انجمن ترقی اردو نے فلسفہ جذبات کی رائلٹی دی۔ ۱۹۱۵ء میں محکمہ تعلیمات میں ایک اعلیٰ عہدے کی ملازمت کے لیے کوشش کی۔ راجہ محمود آباد نے سفارش کی لیکن کامیابی نہ ملی۔ ۱۹۱۶ء میں علی گڑھ کے صاحب زادہ آفتاب احمد خاں نے مولانا دریابادی کو ایجوکیشنل کانفرنس میں لٹریری اسسٹنٹ کے طور پر ملازمت دی، لیکن ان کو یہ ملازمت بہ وجوہ راس نہ آئی۔

۱۹۱۷ء میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کی طلبی پر مولانا حیدر آباد گئے۔ وہاں ان کو سرشتہ تالیف و ترجمہ عثمانیہ یونی ورسٹی میں فلسفہ و منطق کے مترجم کی حیثیت سے ملازمت ملی۔ وہ یکم ستمبر ۱۹۱۷ء سے جولائی ۱۹۱۸ء تک اس شعبے میں رہے۔ اگست ۱۹۱۸ء میں وہاں سے استعفیٰ دے دیا۔

اسی زمانے میں مولانا نے دارالمصنفین اعظم گڑھ کے لیے ''مکالمات برکلے'' کا اردو ترجمہ کیا اور ماہ نامہ معارف اعظم گڑھ کے لیے معاوضے پر لکھنا بھی شروع کیا۔ اس

وقت وہ معارف کے معاون مدیر تھے۔ یہ سلسلہ تقریباً ساڑھے تین برس قائم رہا۔ ۱۹۲۲ء میں مولانا نے معارف کی ادارت سے استعفیٰ دے دیا۔

اسی زمانے میں انگلستان کے مشہور استاد پروفیسر گیڈس Geddes نے جوان دنوں بمبئی یونی ورسٹی میں تھے، مولانا کو عمرانیات (Sociology) کے استاد کی حیثیت سے اپنی ماتحتی میں بلایا مگر مولانا وہاں نہ گئے اور معذرت لکھ کر بھیج دی۔

۱۹۱۹ء کے اوائل میں نظام حیدرآباد نے مولانا کا وظیفہ علمی مقرر کیا۔ سقوط حیدرآباد کے بعد ۱۹۵۱ء میں مولانا نے وزیراعظم ہند پنڈت جواہر لال نہرو سے مل کر اس پنشن کو حکومت اتر پردیش کے خزانے میں منتقل کرا دیا۔

۱۹۲۱ء میں رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہرؒ (متوفی ۱۹۳۱ء) نے مولانا دریابادی کو اپنی قائم کردہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی کے شعبہ فلسفہ کی سینیر پروفیسر شپ کی پیش کش کی لیکن مولانا دریابادی نے یہ پیش کش قبول نہ کی۔

شاید مولانا ملازمت کے لیے پیدا ہی نہیں ہوئے تھے۔

شادی

مولانا کا عقد مسنون شیخ زادگان بجنور ضلع لکھنؤ کے ایک ممتاز فرد شیخ محمد یوسف الزماں رئیس شہر باندہ جو مولانا کے حقیقی خالہ زاد بھائی تھے، کی صاحبزادی عفت النساء کے ساتھ ۲؍جون ۱۹۱۶ء کو لکھنؤ میں ہوا۔

اولاد

مولانا دریابادیؒ کے کئی بیٹے اور بیٹیاں ہوئیں، کچھ تو ابتدا ہی میں گزر گئیں، جب کہ چار صاحب زادیاں رافت النساء (وفات: ۱۹؍دسمبر ۱۹۹۶ء زوجہ حکیم عبدالقوی دریابادیؒ) حمیرا خاتون (وفات: ۱۶؍اپریل ۲۰۰۵ء زوجہ حبیب احمد قدوائی) زہیرا خاتون (وفات: ۱۲؍جنوری

۲۰۰۵ء زوجہ ڈاکٹر محمد ہاشم صاحب قدوائی مدظلہ) اور زاہدہ خاتون (وفات: ۱۳۰ر ستمبر ۱۹۹۳ء زوجہ جناب عبدالعلیم صاحب قدوائی مدظلہ) ان کے انتقال کے بعد تک زندہ رہیں۔

بیعت وارادت

مولانا دریابادیؒ کی الحاد سے اسلام کی طرف مراجعت میں تصوف کی کتابوں نے بھی اہم کردار ادا کیا تھا۔ انہوں نے کچھ عرصہ مروجہ تصوف کو اپنایا مگر ۱۹۲۸ء میں تھانہ بھون جا کر حکیم الامت اشرف العلماء حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ کے حسب ارشاد اور ان کے مواجہے میں شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کے دست حق پرست پر باضابطہ بیعت کی، گو کہ رشد و ہدایت کا اصل مرکز مرشد تھانویؒ ہی رہے۔

موثر، محسن اور عزیز شخصیتیں

مولانا دریابادی کی سیرت و کردار، عادات و اطوار اور نظریات و افکار پر متعدد شخصیات اثر انداز ہوئیں۔ انہوں نے ان موثر، محسن اور عزیز شخصیتوں کا ذکر اپنی خودنوشت سوانح حیات ''آپ بیتی'' کے باب نمبر ۴۵ میں کیا ہے۔

آیندہ سطور میں ان شخصیات کی مختصر فہرست پیش ہے:

گھریلو زندگی میں

والد بزرگوار مولوی عبدالقادر (ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر سیتاپور، متوفی ۱۹۱۲ء)، عم محترم مولوی عبدالرحیم (متوفی ۱۸۹۷ء)، والدہ ماجدہ (وفات ۱۹۴۱ء)، بڑی بہن (وفات ۱۹۴۵ء)، برادر بزرگ ڈپٹی کلکٹر مولوی عبدالمجید (ریٹائرڈ ایڈیشنل سٹی مجسٹریٹ لکھنؤ، متوفی ۱۹۶۰ء)، عم زاد برادران عبدالحلیم آثر (متوفی ۱۹۰۳ء) اور ڈاکٹر محمد سلیم (متوفی ۱۹۲۳ء)، خالہ زاد برادران شفاء الملک حکیم عبدالحسیب (متوفی ۱۹۵۰ء)، شیخ محمد نعیم الزماں (زمین دار قصبہ چلاواں اور رحیم آباد ضلع لکھنؤ، متوفی ۱۹۴۴ء) اور ابتدائی اساتذہ وغیرہ۔

علمی، ادبی اور عملی زندگی میں:

ا۔مرزا محمد ہادی رسوا (متوفی ۱۹۳۱ء)، پنڈت رتن ناتھ سرشار (متوفی ۱۹۰۲ء)، ریاض خیر آبادی (متوفی ۱۹۳۴ء)، مولانا ابوالکلام آزاد (متوفی ۱۹۵۸ء)، محمد حسین آزاد (متوفی ۱۹۱۰ء) اور خواجہ حسن نظامی (متوفی ۱۹۵۵ء)۔

۲۔ادبی و معنوی حیثیتوں سے:

مولانا شبلی نعمانی (متوفی ۱۹۱۴ء)، ڈپٹی نذیر احمد دہلوی (متوفی ۱۹۱۲ء)، سر سید احمد خان (متوفی ۱۸۹۷ء)۔خواجہ غلام الثقلین (متوفی ۱۹۱۵ء) اور راشد الخیری (متوفی ۱۹۳۶ء)

مولانا کے دور الحاد و تشکیک میں

جان اسٹورٹ مل (John Stuart Mill) (متوفی ۱۸۷۳ء)، ہربرٹ اسپنسر (Herbert Spencer) (متوفی ۱۹۰۳ء)، ٹامس ہنری ہکسلے (Thomas Henry Huxley) (متوفی ۱۸۹۵ء) اور دور الحاد کے باہر الیگزنڈر بن (Alexander Bain) (متوفی ۱۸۷۷ء) امریکی پروفیسر ولیم جیمس (Willyam James) (متوفی ۱۹۱۰ء)۔

زمانہ الحاد اور از سر نو اسلام کے عبوری دور میں مولانا کے راہ نما:

اکبر الہ آبادی (متوفی ۱۹۲۱ء)، مولانا محمد علی جوہر (متوفی ۱۹۳۱ء)، مولوی محمد علی لاہوری (متوفی ۱۹۵۱ء)، ڈاکٹر بھگوان داس (متوفی ۱۹۵۸ء)، مسز اینی بسنٹ (Annie Besant) (متوفی ۱۹۳۳ء)، موہن داس کرم چند گاندھی جی (متوفی ۱۹۴۸ء) اور رابندر ناتھ ٹیگور (متوفی ۱۹۴۱ء)۔

روحانی مقتدا:

مولوی عبدالاحد کس منڈویؒ (متوفی ۱۹۲۶ء)، مولوی عابد حسین فتح پوری (متوفی ۱۹۲۷ء)، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی (متوفی ۱۹۵۷ء)، علامہ اقبال (متوفی ۱۹۳۸ء) اور مولوی حاجی محمد شفیع بجنوری (متوفی ۱۹۵۱ء)۔ سب سے بڑھ کر حکیم الامت اشرف العلماء مولانا محمد اشرف علی تھانوی (متوفی ۱۹۴۳ء)

مولانا دریابادی کی محبوب ترین شخصیت: رئیس الاحرار، قائد تحریک خلافت، انگریزی اور اردو کے بے باک صحافی مولانا محمد علی جوہر (مدفون بیت المقدس، فلسطین)۔

علمی و تصنیفی دنیا میں مولانا دریابادی کے محسن اول اور استاد علامہ شبلی نعمانی ہیں۔

طالب علمی اور کالج کے دور میں:

ڈاکٹر سید محمد حفیظ (متوفی ۱۹۶۳ء)، خان بہادر ظفر حسین خاں (متوفی ۱۹۶۰ء)، مولانا مسعود علی ندوی بھیاروی (متوفی ۱۹۶۷ء) اور مولانا عبدالباری ندوی (متوفی ۱۹۷۶ء)۔

معاصرین میں سب سے زیادہ مخلصانہ تعلقات:

علامہ سید سلیمان ندوی (متوفی ۱۹۵۳ء)، مولانا سید مناظر احسن گیلانی (متوفی ۱۹۵۶ء) اور مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی ندوی (متوفی ۱۹۶۱ء) سے تھے۔

محسنین:

بابائے اردو مولوی ڈاکٹر عبدالحق (متوفی ۱۹۶۱ء)، افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق کرنولی (متوفی ۱۹۵۸ء)، مولوی سید امین الحسن بسمل موہانی (متوفی ۱۹۴۲ء)، مہاراجہ محمود آباد سر علی محمد خاں (متوفی ۱۹۳۱ء)، ملک غلام محمد گورنر جنرل پاکستان (متوفی ۱۹۵۶ء)، ہوش یار جنگ (ہوش بلگرامی متوفی ۱۹۵۵ء)، صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین خاں (متوفی ۱۹۶۹ء)۔

عزیز شخصیات:

مولانا صبغۃ اللہ شہید فرنگی محلی (متوفی ۱۹۶۲ء) اور مولانا جمال میاں فرنگی محلی (متوفی ۲۰۱۲ء)۔

سیاسی زندگی میں اثر انداز ہونے والی شخصیات:

مولانا شوکت علی (متوفی ۱۹۳۸ء)، ڈاکٹر سید محمود (متوفی ۱۹۷۱ء)، شعیب قریشی (متوفی ۱۹۶۲ء)، چودھری خلیق الزماں (متوفی ۱۹۷۳ء)

دینی اور علمی حیثیت سے:

مولانا عبدالرحمٰن نگرامی ندوی (متوفی ۱۹۲۶ء)، مولانا محمد اویس نگرامی ندوی (متوفی ۱۹۷۶ء)، مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی (ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ، متوفی ۱۹۹۹ء)، حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب قاسمی (مہتمم دارالعلوم دیوبند، متوفی ۱۹۸۳ء)، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (بانی جماعت اسلامی، متوفی ۱۹۷۹ء)، ڈاکٹر میر ولی الدین حیدر آبادی (متوفی ۱۹۷۵ء)، ڈاکٹر محمد حمید اللہ حیدر آبادی (متوفی ۲۰۰۲ء)۔

ادبی حیثیت سے:

پروفیسر رشید احمد صدیقی (متوفی ۱۹۷۷ء)، شوکت تھانوی (متوفی ۱۹۶۳ء)، خواجہ محمد شفیع دہلوی (متوفی ۱۹۹۲ء) سے متاثر ہوئے۔

اسفار و سیاحت

مولانا دریابادی کی طبعی عزلت گزینی، خلوت پسندی، انضباط اوقات اور اپنے معمولات کی انجام دہی میں غیر معمولی انہماک کے مد نظر یہ خیال ہوتا ہے کہ انہوں نے سفر نہ کیے ہوں گے لیکن ایسا نہیں ہے۔ انہوں نے متعدد اسفار کیے جن کا ذکر انہوں نے

اپنی خودنوشت سوانح عمری ''آپ بیتی'' کے باب ۱۴ میں کیا ہے۔

ذیل میں ان جگہوں اور شہروں کی ایک فہرست پیش ہے جہاں مولانا دریابادی مختلف اسباب سے گئے تھے:

والد بزرگوار کے ساتھ لکھنؤ، فیض آباد، سیتاپور، لکھیم پور کھیری، گورکھپور، اناؤ، سندیلہ، خیرآباد، لہرپور اور کاکوری گئے۔

حصول تعلیم کے لیے لکھنؤ، الہ آباد، علی گڑھ اور دہلی کے سفر کیے۔

حصول ملازمت کے لیے نینی تال، شملہ اور حیدرآباد گئے۔

زندہ بزرگوں یا اولیائے کرام کے مآثر و مقابر کی زیارت کے لیے تھانہ بھون، صفی پور، پیران کلیر، ردولی، دیوئی اور اجمیر کے سفر کیے۔

عزیزوں اور دوستوں سے ملاقات کے لیے: پٹنہ، مرادآباد، ہردوئی، گونڈہ، بستی، پرتاپ گڑھ، اورنگ آباد، سہارن پور، دیوبند، نگرام، گدیہ، جگور، بڑاگاؤں، رسولی، مسولی، بانسہ، لاہور، کراچی، کرنول، بھوپال، بمبئی، کلکتہ، بنارس، سرائے میر، اعظم گڑھ، پھریا، بھیارہ، دیسنہ، گیلانی، بھوالی، مسوری، امروہہ، رائے بریلی، گلبرگہ اور پھلواری شریف کی سیاحت کی۔

حیدرآباد کئی مرتبہ گئے۔ بمبئی (ممبئی) اور مدراس (چنئی) قرآنی موضوعات پر محاضرے (لکچر) دینے گئے۔ مولانا محمد علی جوہرؒ کے ساتھ پانی پت کا سفر کیا۔ اردو کی ایک سرکاری کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے جے پور کا دو مرتبہ سفر کیا۔ باندہ کے متعدد سفر کیے۔

اپریل ۱۹۵۵ء میں گورنر جنرل پاکستان ملک غلام محمد کی دعوت پر لاہور اور کراچی کی سیر و سیاحت کی۔

اگست ۱۹۵۶ء میں دریابادی تاجروں کی دعوت پر کلکتہ (کولکاتہ) کا سفر کیا۔

اگست ۱۹۵۷ء میں گورنر بہار ڈاکٹر ذاکر حسین خاںؒ کے مہمان خصوصی کی حیثیت سے پٹنہ، دیسنہ، گیلانی، پھلواری شریف، نالندہ اور راج گیر کی سیر و سیاحت کی۔

پاکستان کا دوسرا سفر دسمبر ۱۹۵۷ء میں لاہور میں منعقد بین الاقوامی اسلامی مذاکرے میں علمائے ہند کے وفد کے قائد کی حیثیت سے کیا۔

۱۹۶۲ء اور ۱۹۶۷ء میں نئی دہلی کے سفر نائب صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کی میزبانی میں کیے۔

۱۹۶۳ء اور ۱۹۶۴ء میں لسانی کمیٹی کے ایک رکن کی حیثیت سے جے پور کے دو سفر کیے۔ دونوں مرتبہ گورنر راجستھان ڈاکٹر سمپورنا نند کے مہمان رہے۔

اکبر الہ آبادی سے ملاقات کے لیے، اس کے بعد ہندوستانی اکادمی یوپی کے جلسوں میں شرکت کے لیے الہ آباد کے متعدد سفر کیے۔

دارالمصنفین شبلی منزل کے جلسوں میں شرکت کے لیے بارہا اعظم گڑھ کے اسفار کیے۔

۱۹۲۹ء میں جب مولانا ۳۷ برس کے تھے، اپنی اہلیہ محترمہ، مولانا عبدالباری ندویؒ اور مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ کے ساتھ حج بیت اللہ اور زیارت رسول اللہؐ سے مشرف ہوآئے۔

مولانا کے سفرنامے مطبوعہ شکل میں دست یاب ہیں۔ (ملاحظہ ہو: فہرست تصانیف ماجدی)

اعزازات

☆ ممبر رائل ایشیاٹک سوسائٹی (برطانیہ)، ممبر ارسٹوٹیلین سوسائٹی (برطانیہ)

☆ ۱۹۲۵ء میں اعزازی ''ندوی'' کا خطاب از طرف انجمن طلبائے قدیم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

☆ دسمبر ۱۹۲۵ء میں صوبہ اودھ کی خلافت کمیٹی کے صدر منتخب ہوئے۔

☆ دسمبر ۱۹۵۷ء میں لاہور (پاکستان) میں بین الاقوامی مذاکرہ اسلامی (International Islamic Colloquium) میں علمائے ہند کے وفد کی قیادت کی۔

☆ ۱۹۶۶ء میں حکومت اتر پردیش نے قابل قدر تصانیف کی بنا پر نقد پانچ ہزار روپے کے انعام سے نوازا۔

☆ اگست ۱۹۶۶ء میں حکومت ہند نے عربی کی گراں قدر خدمات انجام دینے کے اعتراف میں ''سند فضیلت'' (National Scholarship in Arabic) کا حق دار قرار دیا۔ یہ سند صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر رادھا کرشنن نے اپریل ۱۹۶۷ء میں مولانا دریابادی کو پیش کی۔

☆ ۱۹۷۴ء میں ہندی اردو ساہتیہ ایوارڈ کمیٹی لکھنؤ نے ادبی اعزاز پیش کیا۔

☆ ۱۹۷۶ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی جانب سے ڈاکٹر آف لٹریچر (ڈی لٹ) کی اعزازی ڈگری صدر جمہوریہ ہند فخر الدین علی احمد کے ہاتھوں دی گئی۔

اس کے علاوہ مولانا دریابادیؒ ندوۃ العلماء لکھنؤ، دارالمصنفین اعظم گڑھ، دارالعلوم دیوبند، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد، اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ، حج کمیٹی اتر پردیش، حکومت اتر پردیش کی انعامی کمیٹی برائے اردو مصنفین، ریڈیو ایڈوائزری کمیٹی جیسے اداروں اور تنظیموں سے مختلف حیثیتوں سے وابستہ رہے۔

وفات

مولانا دریابادیؒ نے ۶ /جنوری ۱۹۷۷ء مطابق ۱۵/محرم الحرام ۱۳۹۷ھ بروز جمعرات بوقت ۳۰-۴ بجے قبل فجر، اپنے لکھنوی مکان خاتون منزل احاطہ فقیر محمد خاں پختہ،

حیدر مرزا روڈ، گولہ گنج لکھنؤ میں وفات پائی۔ ع

ترکش مارا خدنگ آخریں

مولانا کے جنازے کی پہلی نماز دارالعلوم ندوۃ العلماء میں بہت بڑے مجمع کی موجودگی میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے مفسر قرآن کے حسب وصیت پڑھائی۔ دوسری نماز دریاباد میں حافظ غلام نبی نے پڑھائی۔ تدفین مولاناؒ کے مکان واقع محلہ مخدوم زادگان دریاباد ضلع بارہ بنکی کی پشت پر ان کے جد حضرت مخدوم آبکشؒ کی درگاہ میں ہوئی۔

الرجل مات علیٰ کلمة الصدق.

رحمٰن دنیا و رحیم آخرت کے پرستار، رحمۃ للعالمین، خاتم الانبیاءؑ کے عاشق زار، صحابہ کرامؓ کے پیروکار، صدق نگار اور صداقت شعار بندۂ ماجد کا قلم ہمیشہ کے لیے رک گیا۔

بہ گیتی گر کسے پایندہ بودے
ابوالقاسم محمدؐ زندہ بودے

تصانیف ماجدی- جامع موضوعاتی فہرست

قرآنیات ومتعلقات

نمبرشمار	نام کتاب	شائع کردہ	سن اشاعت
۱	تفسیر ماجدی، کامل ایک جلد	تاج کمپنی، لاہور، کراچی	۱۹۵۲ء
۲	تفسیر ماجدی اضافہ نظرثانی اور ترمیم شدہ مکمل سیٹ ۷ جلدیں	مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ	۲۰۱۳ء
۳	ارض القرآن یا جغرافیہ قرآنی	نعیم الرحمٰن صدیقی خاتون منزل، حیدر مرزا روڈ لکھنؤ	۲۰۰۱ء
۴	اعلام القرآن یا قرآنی شخصیتیں	صدق جدید بک ایجنسی، لکھنؤ	۱۹۵۹ء
۵	الحیوانات فی القرآن	مکتبہ ندوۃ المعارف، بنارس	۱۹۵۵ء
۶	بشریت انبیاء	مکتبہ اسلام، لکھنؤ	۲۰۰۲ء
۷	قصص ومسائل	اسلامک پبلشرز، لکھنؤ	۱۹۹۴ء
۸	مشکلات القرآن یا قرآنی مطالعہ بیسویں صدی میں	اسلامک ریسرچ فاؤنڈیشن، چنئی	۲۰۰۲ء
۹	تصوف اسلام	نسیم بک ڈپو، لکھنؤ	۱۹۶۵ء
۱۰	سچی باتیں (جلداول) (مرتب نعیم الرحمٰن صدیقی ندوی)	صدق فاؤنڈیشن، لکھنؤ	۲۰۰۱ء
۱۱	مرشد کی تلاش	// // //	۲۰۰۲ء
۱۲	قتل مسیح سے یہود کی بریت	اسلامی مشن، سنت نگر لاہور	ندارد
۱۳	ذکر رسولؐ	صدق فاؤنڈیشن، لکھنؤ	۲۰۰۴ء
۱۴	مشورے اور گزارشیں (مرتب نعیم الرحمٰن صدیقی)	العلم پبلشرز، لکھنؤ	۱۹۹۲ء
۱۵	تقلید اور حدود تقلید	صدق فاؤنڈیشن، لکھنؤ	۲۰۰۸ء

ادب وانشا

نمبر	کتاب	ناشر	سال
۱۶	اقبالیات ماجد	اقبال اکیڈمی، حیدرآباد (اے پی)	۱۹۷۹ء
۱۷	انشائے ماجد یا لطائف ادب (مرتب: حکیم عبدالقوی دریابادی)	ادارہ انشائے ماجدی، کولکاتہ	۱۹۹۱ء
۱۸	مضامین عبدالماجد (مرتب: غلام دستگیر رشید)	ادارہ اشاعت اردو، حیدرآباد (اے پی)	۱۹۴۳ء
۱۹	مقالات ماجد	عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور	۱۹۵۴ء
۲۰	تغزل ماجدی (شعری مجموعہ) (مرتب: حکیم عبدالقوی دریابادی)	مولانا عبدالماجد دریابادی اکیڈمی، لکھنؤ	۱۹۷۹ء
۲۱	زود پشیماں (ڈرامہ)	الناظر بک ایجنسی، لکھنؤ	۱۹۱۷ء
۲۲	ذکر وفکر اکبرالہ آبادی (اکبرالہ آبادی)	مرتب وناشر حبیب احمد قدوائی، خاتون منزل حیدر مرزا روڈ لکھنؤ	۱۹۸۸ء
۲۳	اکبرنامہ (مرتب: عبدالعلیم قدوائی)	ادارہ انشائے ماجدی، کولکاتہ	۲۰۰۸ء

آپ بیتی وسوانح

نمبر	کتاب	ناشر	سال
۲۴	آپ بیتی	مکتبہ فردوس، مکارم نگر لکھنؤ	۲۰۱۰ء
۲۵	چند سوانحی تحریریں	مولانا عبدالماجد دریابادی اکیڈمی، لکھنؤ	۱۹۸۵ء
۲۶	حکیم الامت۔ نقوش وتأثرات	سعدی بک ڈپو، الہ آباد	۱۹۹۰ء
۲۷	محمد علی، ذاتی ڈائری کے چند ورق (مکمل ایک جلد)	صدق فاؤنڈیشن، لکھنؤ	۲۰۰۳ء
۲۸	محمود غزنوی	وکیل بک ٹریڈنگ ایجنسی، امرتسر	۱۹۱۰ء
۲۹	معاصرین	ادارہ انشائے ماجدی، کلکتہ	۱۹۷۹ء
۳۰	وفیات ماجدی (مرتب حکیم عبدالقوی دریابادی)	مولانا عبدالماجد دریابادی اکاڈمی لکھنؤ	۱۹۷۸ء
۳۱	اردو کا ادیب اعظم (مولانا ابوالکلام آزاد سے متعلق مولانا دریابادی کی تحریریں) (مرتب: ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری)	ادارہ تصنیف وتحقیق پاکستان، کراچی	۱۹۸۵ء

فلسفہ ونفسیات

۳۲	غذائے انسانی	وکیل بک ٹریڈنگ ایجنسی۔ امرتسر	۱۹۱۰ء
۳۳	فلسفۂ جذبات	انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی	۱۹۱۴ء
۳۴	فلسفۂ اجتماع	〃 〃 〃	۱۹۱۵ء
۳۵	فلسفۂ کی تعلیم گزشتہ اور موجودہ	الناظر بک ایجنسی۔ لکھنؤ	ندارد
۳۶	فلسفیانہ مضامین	〃 〃 〃	۱۹۲۶ء
۳۷	مبادئ فلسفہ	اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ	۱۹۸۲ء
۳۸	ہم آپ (پاپولر سائیکالوجی)	ہندوستانی اکیڈمی۔ الٰہ آباد	۱۹۴۸ء
۳۹	فرائض والدین	نول کشور بکڈپو۔ لکھنؤ	۱۹۱۴ء

خطبات وتقاریر

۴۰	سیرت نبوی قرآنی یا خطبات ماجدی	صدق جدید بک ایجنسی، لکھنؤ	۱۹۶۳ء
۴۱	ندوۃ العلماء کا پیام فرزندان دارالعلوم کے نام	صدق فاؤنڈیشن، لکھنؤ	۱۹۹۸ء
۴۲	خطبات ماجد یا ہدیہ زوجین	〃 〃 〃	۲۰۰۵ء
۴۳	خطبہ صدارت مجلس استقبالیہ	آل انڈیا خلافت کانفرنس، لکھنؤ	۱۹۲۷ء
۴۴	تمدن اسلام	صدق فاؤنڈیشن، لکھنؤ	۲۰۰۹ء
۴۵	نشریات ماجد (ریڈیائی تقریریں) ۲ جلدیں (مرتب: عبدالعلیم قدوائی)	نعیم الرحمٰن صدیقی خاتون منزل، حیدر مرزا روڈ، لکھنؤ	۱۹۹۷ء

تراجم وتالیفات

۴۶	تاریخ تمدن (جلد دوم)	علی گڑھ انسٹیٹیوٹ کالج، علی گڑھ	۱۹۱۸ء
۴۷	پیام امن	مولانا عبدالماجد دریابادی اکیڈمی، لکھنؤ	۱۹۸۱ء
۴۸	تاریخ اخلاق یورپ (۲ جلدیں)	انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی	۱۹۱۹ء
۴۹	تاریخ یورپ (برائے انٹرمیڈیٹ)	دارالطبع جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد	۱۹۲۲ء

۵۰	مکالمات برکلے	دارالمصنفین، اعظم گڑھ	۱۹۲۶ء
۵۱	منطق استخراجی واستقرائی	دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد	۱۹۱۹ء
۵۲	ناموران سائنس	میکملن اینڈ کمپنی لمیٹڈ، کلکتہ	۱۹۲۴ء
۵۳	مناجات مقبول	صدق جدید بک ایجنسی، لکھنؤ	۱۹۴۹ء
۵۴	چہل حدیث ولی اللہی	نعیم الرحمٰن صدیقی	۲۰۰۰ء
۵۵	شوق آخرت	ادارہ اسلامیات، لاہور	ندارد

مرتبات ومکتوبات

۵۶	تحفہ خسروی	اودھ بک ایجنسی دریاباد، بارہ بنکی	۱۹۲۱ء
۵۷	مثنوی بحرالمحبت (مصحفی)	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی	۱۹۸۲ء
۵۸	فیہ مافیہ (مولانا جلال الدین رومی)	دارالمصنفین اعظم گڑھ	۱۹۲۸ء
۵۹	خطوط مشاہیر (جلداول)	نسیم بکڈپو، لکھنؤ	۱۹۶۹ء
۶۰	مکتوبات سلیمانی (۲ جلدیں)	صدق جدید بک ایجنسی، لکھنؤ	۱۹۶۳ء، ۱۹۶۷ء
۶۱	مکاتیب اکبر	دہلی	۱۹۲۴ء
۶۲	رقعات ماجدی (مرتب غلام محمد)	ڈاکٹر عرفان الکریم انصاری، کراچی	۱۹۸۱ء
۶۳	مکتوبات ماجدی (۷ جلدیں) (مرتب: ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی)	ادارہ انشائے ماجدی، کلکتہ، اردو بک ریویو، نئی دہلی	۱۹۸۲ء ۲۰۱۲ء

سفرنامے

۶۴	سفر حجاز	صدق فاؤنڈیشن، لکھنؤ	۲۰۰۶ء
۶۵	تأثرات دکن	بہادر یار جنگ اکادمی، کراچی	۱۹۷۷ء
۶۶	ڈھائی ہفتہ پاکستان میں یا مبارک سفر	مولانا عبدالماجد دریابادی اکیڈمی لکھنؤ	۱۹۸۱ء
۶۷	سیاحت ماجدی (مرتب: محمد راشد شیخ)	صدق فاؤنڈیشن، لکھنؤ	۲۰۰۶ء

English Books

68	Quran Hakeem Translation & Explanation	Taj Company Lahore	1962
69	Holy Quran with English Translation	Taj Company Lahore	N.A.
70	Tafseerul Quran Complete set in four vol.	Academy of Islamic Research & Publication, Lko.	1981
71	The Glorious Quran Text, Translation & Commentary	The Islamic Foundation Liecester (U.K.)	2001
	The Glorious Quran Text, Translation & Commentary	Sidq Foundation, Lucknow.	2006
72	The Psychology of Leadership	T. Fisher Unwin London (U.K.)	1915
73	Jesus and Mary in the Holy Quran	Sidq Foundation, Lucknow	2009

ماجدی سوانح، افکار اور کمالات پر چند کتابیں

نمبر	نام کتاب	مصنف	ناشر	سن
۱	مولانا عبدالماجد دریابادی کتابیات	ڈاکٹر تحسین فراقی	مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد	۱۹۹۱ء
۲	عبدالماجد دریابادی	نسیم قدوائی	ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی	۱۹۹۸ء
۳	ہفتہ وار سچ لکھنؤ کا توضیحی اشاریہ	عبدالعلیم قدوائی	خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ	۲۰۰۰ء
۴	ہفتہ وار صدق لکھنؤ کا توضیحی اشاریہ	عبدالعلیم قدوائی	خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ	۲۰۰۳ء
۵	مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی کتاب زندگی کے چند ورق	نعیم الرحمٰن صدیقی ندوی	صدق فاؤنڈیشن، لکھنؤ	۲۰۰۳ء
۶	مولانا عبدالماجد دریابادی کے ادبی شہ پارے (اول، دوم)	محمد سمیع الدین نظام آبادی	دارالکتاب دیوبند	۱۴۲۳ھ
۷	اسلام-مسلمان اور تہذیب جدید ایک مطالعہ-ایک جائزہ (صدق جدید کے مضامین شذرات کا انتخاب) حصہ اول	مرتب: محمد موسیٰ بھٹو	سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ، حیدرآباد، سندھ پاکستان	۲۰۰۴ء
۸	مولانا عبدالماجد دریابادی- خدمات وآثار (مجموعہ مقالات مولانا عبدالماجد دریابادی نیشنل سیمنار)	مرتب: مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی	شاہ ولی اللہ دہلوی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی	۲۰۰۶ء

۹	مولانا عبدالماجد دریابادی-حیات وخدمات	عبدالعلیم قدوائی	صدق فاؤنڈیشن، لکھنؤ	۲۰۰۹ء
۱۰	تبصرات ماجدی	عبدالعلیم قدوائی	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی	۲۰۰۹ء
۱۱	یہودیت ونصرانیت (مولانا دریابادی کی تفسیر اوران کی دیگر کتابوں سے عنوان بالا کے تحت تحریروں کا انتخاب)	مرتب: محمد کمال اختر	المعہد العالی للدراسات الاسلامیہ، لکھنؤ	۲۰۰۹ء
۱۲	مولانا عبدالماجد دریابادی ایک باکمال انشاپرداز	عبدالعلیم قدوائی	صدق فاؤنڈیشن، لکھنؤ	۲۰۱۰ء
۱۳	تفسیر ماجدی-نقد ونظر	نعیم الرحمٰن صدیقی ندوی	صدق فاؤنڈیشن، لکھنؤ	۲۰۱۳ء
۱۴	From Darkness into Light, Life and Works of Maulana Abdul Majid Daryabadi (1892-1977)	پروفیسر عبدالرحیم قدوائی	Ahsan Publications, Durban, South Africa	۲۰۱۳ء
۱۵	ہفتہ وار صدق جدید لکھنؤ کا توضیحی اشاریہ	عبدالعلیم قدوائی	خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ	۲۰۱۳ء
۱۶	دہلی: آثار اور نقوش از عبدالماجد دریابادی	مرتب: عبدالعلیم قدوائی	دلی اردو اکیڈمی، نئی دہلی	۲۰۱۳ء

ذکر ماجد دنیائے علم ودانش میں

مولانا عبدالماجد دریابادی علمی وادبی اعتبار سے چوں کہ کثیر الجہات شخصیت کے مالک تھے اس لیے ملک وبیرون ملک کی دانش گاہوں اور علمی اداروں کے محققین اور ریسرچ اسکالرز نے ان کی شخصیت وافکار اور خدمات کو اپنی علمی وتحقیقی سرگرمیوں کا آج بھی مرکز بنا رکھا ہے۔اس کا ثبوت درج ذیل فہرست ہے۔اس فہرست کی تیاری میں ''ہندوستان کی یونی ورسٹیوں میں اردو تحقیق'' از محترمہ شاہانہ مریم شان سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

اب تک دستیاب معلومات کے مطابق مولانا پر تحقیقی کام کی تفصیل ذیل میں درج ہے۔اہل علم سے گزارش ہے کہ اس سلسلے میں راقم کا تعاون فرمائیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اضافہ کیا جاسکے۔

نمبر	عنوان مقالہ	مقالہ نگار	برائے	نام یونی ورسٹی	سن تکمیل
۱	عبدالماجد دریابادیؒ حیات اور ادبی خدمات	ڈاکٹر مصباح الاسلام	Ph.D.	لکھنؤ یونی ورسٹی	۱۹۷۶ء
۲	مولانا عبدالماجد دریابادی-حیات اور خدمات	ڈاکٹر محمد عتیق الرحمٰن خان	Ph.D.	پٹنہ یونی ورسٹی	۱۹۷۷ء
۳	مولانا عبدالماجد دریابادی-حیات اور خدمات	ڈاکٹر عتیق الرحمٰن خان	Ph.D.	ناگ پور یونی ورسٹی	۱۹۷۹ء
۴	عبدالماجد دریابادی احوال وآثار	ڈاکٹر منظور اختر تحسین فراقی	Ph.D.	پنجاب یونی ورسٹی لاہور (پاکستان)	۱۹۸۵ء

۵	عبدالماجد دریابادی حیات اور ادبی خدمات	ڈاکٹر طاہر محمد حلیم بنارسی	Ph.D.	بمبئی یونی ورسٹی	۱۹۸۸ء
۶	عبدالماجد دریابادی بحثیت کالم نگار	محمد ارشد سہیل	M. Phil	حیدرآباد یونی ورسٹی	۲۰۰۴ء
۷	مولانا عبدالماجد دریابادی کی علمی وادبی خدمات	محمد شمس عالم	Ph.D.	شعبۂ عربی، فارسی اور اردو، مدراس یونی ورسٹی	۲۰۰۸ء
۸	مولانا عبدالماجد دریابادی کی خودنوشت آپ بیتی کا تنقیدی وتجزیاتی مطالعہ	محمد نصیر الدین	M. Phil	مولانا ابوالکلام آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی حیدرآباد	۲۰۰۸ء
۹	عبدالماجد دریابادی کے نثری مراثی	عبدالمتین	M. Phil	حیدرآباد یونیورسٹی	۲۰۰۹ء
۱۰	المفسر عبدالماجد دریابادی و تفسیرہ (عربی)	عبدالمحیط الخطیب البھٹکلی الندوی	فضیلت	دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ	۲۰۰۹ء
۱۱	مولانا عبدالماجد دریابادی بحثیت صحافی	مظفر حسین	M. Phil	دہلی یونی ورسٹی دہلی	ندارد
۱۲	مولانا عبدالماجد دریابادی کی ادبی تصانیف کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر مجاہد احمد	Ph.D.	روہیل کھنڈ یونی ورسٹی بریلی	ندارد
۱۳	مولانا عبدالماجد دریابادی کی ادبی خدمات	ڈاکٹر فوزیہ خانم	Ph.D.	علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ	۲۰۱۲ء

۱۴	عبدالماجد دریابادی علمی وادبی خدمات	انصاری مسعود اختر ندوی	Ph.D.	ڈاکٹر باباصاحب امبیڈکر مراٹھواڑہ یونی ورسٹی اورنگ آباد	۲۰۱۲ء جاری
۱۵	مولانا عبدالماجد دریابادی کی ادبی جہات	شیخ صلاح الدین	Ph.D	کولکاتہ یونیورسٹی	۲۰۱۳ء
۱۶	مولانا عبدالماجد دریابادی کی صحافتی خدمات	زبیر احمد صدیقی	Ph.D.	شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ	جاری

مولانا دریابادیؒ پر جرائد کے خصوصی نمبر

۱- ماہنامہ فروغ اُردو لکھنؤ: مولانا عبدالماجد دریابادی نمبر اگست-اکتوبر ۱۹۷۱ء

۲- پندرہ روزہ تعمیر حیات، لکھنؤ: خصوصی شمارہ جنوری وفروری ۱۹۷۷ء

۳- ماہنامہ نیا دور لکھنؤ: مولانا عبدالماجد دریابادی نمبر اپریل-مئی ۱۹۷۸ء

۴- یادگاری مجلّہ: مولانا عبدالماجد دریابادیؒ - حیات و خدمات، جنوری ۱۹۷۸ء
مولانا عبدالماجد دریابادی اکادمی، لکھنؤ

۵- یادگاری مجلّہ: ذکرِ ماجد، جنوری ۱۹۸۱ء مولانا عبدالماجد دریابادی اکادمی، لکھنؤ

۶- صدق جدید، لکھنؤ: مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نمبر جنوری ۱۹۸۲ء

۷- صدق جدید، لکھنؤ: مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نمبر جنوری ۱۹۸۳ء

۸- صدق جدید، لکھنؤ: مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نمبر جنوری ۱۹۸۴ء

۹- صدق جدید، لکھنؤ: مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نمبر جنوری ۱۹۸۵ء

۱۰- صدق جدید، لکھنؤ: مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نمبر جنوری ۱۹۸۶ء

۱۱- صدق جدید، لکھنؤ: مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نمبر جنوری ۱۹۸۷ء

۱۲- دوماہی اکادمی لکھنؤ: اترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ، نومبر ۱۹۹۰ء تا فروری ۱۹۹۱ء

۱۳- عالمی یوم اردو یادگار مجلّہ: خصوصی پیش کش مولانا عبدالماجد دریابادی-حیات وخدمات،
۹رنومبر ۲۰۱۳ء-زیر اہتمام: یونائٹیڈ مسلم آف انڈیا، اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن، دہلی

۱۴- Islam and the Modren Age, Special Issue on Maulana Daryabadi, New Delhi, Jamia Millia Islamia (Under Print)

سارے جہاں میں دھوم......

مولانا عبدالماجد دریابادی آسمان علم وادب کے مہر درخشاں تھے۔ ان کے اکابر ومعاصر اہل قلم وادباء نے اپنی تحریروں اور کتابوں میں ان کی شخصیت، افکار اور خصوصیات پر اظہار خیال کیا ہے۔

ذیل میں الف بائی ترتیب سے اردو، عربی، فارسی اور انگریزی زبانوں میں تحریر کردہ ایسی ۱۰۶ کتابوں کی فہرست پیش ہے جن میں مولانا دریابادی کا تذکرہ یا حوالہ موجود ہے:

نمبر	نام کتاب	نام مصنف	نام ناشر	سن طبع
۱	اتمام الاعلام (عربی) (ذیل لکتاب الأعلام لخیر الدین الزرکلی)	الدکتور نزار أباظة، محمد ریاض المالح	دار صادر، بیروت لبنان	۲۰۰۳ء
۲	ادبی آئینے	ڈاکٹر سید سخی احمد ہاشمی	مکتبہ شاہد کراچی	۱۹۷۴ء
۳	اردو ادب ۱۸۵۷ء تا ۱۹۶۶ء	ڈاکٹر سید عبداللہ	مکتبہ خیابان ادب، لاہور	۱۹۶۷ء
۴	اردو ادب کی تاریخ	عظیم الحق جنیدی	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	۲۰۰۵ء
۵	اردو اسالیب نثر	ڈاکٹر امیر اللہ خاں شاہین	امیر نشاں میرٹھ	۱۹۸۵ء
٦	اردو تفاسیر بیسویں صدی میں	ڈاکٹر سید شاہد علی	کتابی دنیا، دہلی	۲۰۰۱ء
۷	اردو تفسیر (جلد سوم)	عبدالعلیم نامی	انجمن ترقی اردو، کراچی	۱۹۶۲ء

۸	اردو تنقید کا ارتقاء	ڈاکٹر عبادت بریلوی	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۲۰۰۲ء
۹	اردو خودنوشت، فن و تجزیہ	ڈاکٹر وہاج الدین علوی	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ نئی دہلی	۱۹۸۹ء
۱۰	اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ	خالد محمود	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی	۲۰۱۱ء
۱۱	اردو کے اسالیب بیان	ڈاکٹر محی الدین قادری زور	مکتبہ معین الادب، لاہور	۱۹۶۳ء
۱۲	اردو کی منظوم داستانیں	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	انجمن ترقی اردو، کراچی	۱۹۷۱ء
۱۳	۴۸ سال شفقتوں کے سائے میں	مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی	مکتبہ فردوس لکھنؤ	۱۴۳۳ھ، ۲۰۱۲ء
۱۴	اسلام کا سیاسی نظام	مولانا محمد اسحاق سندیلوی ندوی	دارالمصنفین، اعظم گڑھ	۱۳۷۶ھ، ۱۹۵۷ء
۱۵	اشارات تنقید	ڈاکٹر سید عبداللہ	مکتبہ خیابان ادب، لاہور	۱۹۷۲ء
۱۶	افادات مہدی	مرتبہ: مہدی بیگم	شیخ مبارک علی، لاہور	۱۹۴۹ء
۱۷	اقبال-ایک مطالعہ	ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار	اقبال اکادمی، لاہور	۱۹۸۷ء
۱۸	اقبال نامہ (جلد اول)	شیخ عطاء اللہ (مرتب)	شیخ اشرف، لاہور	ندارد
۱۹	اکبر الہ آبادی	ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا	مجلس ترقی ادب، لاہور	۱۹۸۰ء

۲۰	بانی درس نظامی	مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محلی	فرنگی محل کتاب گھر، لکھنؤ	۱۳۹۳ھ، ۱۹۷۳ء
۲۱	البيبليوغرافيا العالمية لترجمات معانى القرآن الكريم (عربى، انجليزى)	اعداد: عصمت بينارق خالدارن	منظمة المؤتمر الاسلامى، مركز الابحاث للتاريخ والفنون والثقافة الاسلامية، استانبول، تركى	۱۴۰۶ھ ۱۹۸۶ء
۲۲	بزم رفتگاں (حصہ دوم)	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ	۲۰۰۹ء
۲۳	بزم صوفیہ	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	دارالمصنفین اعظم گڑھ	۱۳۶۹ھ، ۱۹۴۹ء
۲۴	بیسویں صدی (نصف اول) کے اردو مصنفین	سنجیدہ خاتون	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی	۲۰۰۸ء
۲۵	پرانے چراغ (دوم)	مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ	مکتبہ فردوس لکھنؤ	۲۰۰۰ء
۲۶	پنہاں چہرے	ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل	ساحل کمپیوٹرس، ناگ پور	۲۰۰۷ء
۲۷	تاریخ ادب اردو	رام بابو سکسینہ	ادارہ کتاب الشفاء، نئی دہلی	۲۰۰۰ء
۲۸	تاریخ دریاباد	منشی برج بھوکھن لال محبؔ	نامی پریس، لکھنؤ	۱۹۲۵ء

۲۹	تاریخ نثر اردو–نمونہ منثورات	احسن مارہروی	مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد	۱۹۸۶ء
۳۰	تذکرۃ المفسرین	قاضی محمد زاہد الحسینی	دارالارشاد، اٹک شہر، پاکستان	۱۴۰۱ھ
۳۱	ترجمات معانی القرآن الکریم وتطور فهمه عندالغرب (عربی)	الدکتور عبداللّٰہ عباس الندوی	رابطة العالم الاسلامی، مکه مکرمه	۱۴۱۷ھ
۳۲	تذکرۂ معاصرین (جلد چہارم)	مالک رام	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ	۱۹۸۲ء
۳۳	تکبیر مسلسل (خطبات صدارت دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ)	مرتب: ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی	ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی، لکھنؤ	۲۰۰۲ء
۳۴	الجزیرة العربیة فی أدب الرحلات الأردي (عربی)	الدکتور سمیر عبدالحمید نوح	وزارة التعلیم العالی، المملکة العربیة السعودیة	۱۴۱۹ھ ۱۹۹۹ء
۳۵	جوش ملیح آبادی بحیثیت نثر نگار (تحقیقی مقالہ)	ڈاکٹر جعفر عسکری	دانش محل، امین آباد لکھنؤ	۱۹۹۸ء
۳۶	چند ارباب کمال	مولانا ضیاء الدین اصلاحی	مولانا ضیاء الدین اصلاحی، اعظم گڑھ	۱۹۸۳ء
۳۷	حضرت حکیم الامت تھانوی اکابر اور معاصرین کی نظر میں	سید محمود حسن (مرتب)	کتب خانہ مظہری، کراچی	۱۹۷۶ء

۳۸	حیات اکبرالہ آبادی	ملا واحدی	بزم اکبر، کراچی	ندارد
۳۹	حیات اللہ انصاری	عبدالنافع قدوائی	ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی	۲۰۰۶ء
۴۰	حیات مستعار	جلیل قدوائی	مکتبہ اسلوب، کراچی	۱۹۸۷ء
۴۱	خطوط مشاہیر بہ نام سید مسعود حسن رضوی ادیب	مرتب: نیر مسعود	اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ	۱۹۸۵ء
۴۲	خطوط مودودی (۱)	رفیع الدین ہاشمی، سلیم منصور خالد (مرتبین)	البدر پبلی کیشنز، لاہور	۱۹۸۳ء
۴۳	خیالات	پروفیسر محمد یونس نگرامی	پروفیسر یونس نگرامی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیر سوسائٹی، لکھنؤ	۲۰۰۱ء
۴۴	دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کی ادبی خدمات	مجید بیدار	آندھراپردیش اردو اکادمی، حیدرآباد	۱۹۸۰ء
۴۵	دیدوشنید	رئیس احمد جعفری	رئیس احمد جعفری اکیڈمی، کراچی	۱۹۸۷ء
۴۶	روداد چمن	مولانا سید محمد الحسنی	مجلس صحافت ونشریات ندوۃ العلماء، لکھنؤ	۱۴۳۴ھ، ۲۰۱۳ء
۴۷	روح تنقید	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور	سب رس کتاب گھر، حیدرآباد	۱۹۴۰ء
۴۸	روشنائی	سجاد ظہیر	مکتبہ دانیال، کراچی	۱۹۷۶ء

۴۹	سفر سعادت	الحاج منشی امیر احمد علوی کاکوروی	الناظر پریس، لکھنؤ	۱۳۵۱ھ، ۱۹۳۲ء
۵۰	سفرنامہ حیات مع ضمیمہ چند دن دیار غیر میں	مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی	دارالاشاعت خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف، پٹنہ	۱۴۲۶ھ ۲۰۰۵ء
۵۱	السید سلیمان الندوی أمیر علماء الهند فی عصره و شیخ الندویین (عربی)	الدکتور محمد أکرم الندوی	دارالقلم، دمشق	۱۴۲۲ھ، ۲۰۰۱ء
۵۲	سیرت محمد علی	رئیس احمد جعفری ندوی	مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی	۱۹۳۲ء
۵۳	شبلی کی علمی وادبی خدمات	پروفیسر ظفر احمد صدیقی	فیکلٹی آف آرٹس، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ	۲۰۱۲ء
۵۴	شخصیات اور واقعات جنھوں نے مجھے متاثر کیا	جنید احمد	خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ	۱۹۹۱ء
۵۵	شیش محل	شوکت تھانوی	اردو بک اسٹال، لاہور	۱۹۴۳ء
۵۶	الصحافة الاسلامية فی الهند تاریخها و تطورها (عربی)	الدکتور سلیم الرحمن خان الندوی	المجمع الاسلامی العلمی، ندوة العلماء، لکهنؤ	۱۴۳۱ھ، ۲۰۱۰ء
۵۷	صحافت پاکستان وہند میں	ڈاکٹر عبدالسلام خورشید	مجلس ترقی ادب، لاہور	۱۹۶۳ء
۵۸	علامہ اقبال اور مولانا محمد علی	ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری	ادارہ تصنیف و تحقیق کراچی پاکستان	۱۹۸۴ء

۵۹	علامہ سید سلیمان ندوی شخصیت وادبی خدمات	ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی	مکتبہ فردوس، لکھنؤ	۱۹۸۵ء
۶۰	علی گڑھ کی علمی خدمات	پروفیسر خلیق احمد نظامی	انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی	۱۹۹۴ء
۶۱	فیہ مافیہ (رومی)	بدیع الزماں فروز انفر (مرتب)	چاپ خانہ مجلس تہران،	۱۳۳۰ شمسی
۶۲	قرآن کریم کے انگریزی ترجموں کا تنقیدی مطالعہ	مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی ترجمہ از عربی: قمر شعبان ندوی	مجمع البحث العلمی الہند، نئی دہلی	۱۴۳۰ھ ۲۰۰۹ء
۶۳	قلمی چہرے (آغا شورش کاشمیری)	مرتب: ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری	مجلس یادگار شورش کراچی، پاکستان	۱۹۹۹ء
۶۴	گل بانگ حرم	زائر حرم حمید صدیقی لکھنوی	خورشید بک ڈپو، لکھنؤ	۱۹۴۰ء
۶۵	لکھنؤ کا دبستان شاعری	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	اردو مرکز، لاہور	۱۹۶۷ء
۶۶	لکھنؤ کا دبستان نثر	ڈاکٹر عفت زرین	عفت زریں، دہلی	۲۰۰۰ء
۶۷	مثنوی زہر عشق اور اس کے نقاد	محمد حسن	مطبوعات الحسن، کراچی	۱۹۶۲ء
۶۸	مختصر تاریخ ادب اردو	ڈاکٹر سید اعجاز حسین	اردو کتاب گھر دہلی	ندارد
۶۹	مختصر تاریخ ادب اردو	محمود بریلوی	شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور	۱۹۸۵ء
۷۰	مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں	مولانا محمد عمران خاں ندوی، مولانا فیصل احمد بھٹکلی ندوی	ادارہ احیائے علم ودعوت، لکھنؤ	۲۰۰۴ء

۷۱	معاصرین اقبال کی نظر میں	عبداللہ قریشی	مجلس ترقی ادب، لاہور	۱۹۷۷ء
۷۲	مکاتیب ابوالکلام	ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری	اردو اکیڈمی سندھ، کراچی	۱۹۶۸ء
۷۳	مکاتیب شبلی	مرتب: علامہ سید سلیمان ندوی	دارالمصنفین اعظم گڑھ	۱۹۶۶ء
۷۴	مکاتیب مہدی	مرتبہ: مہدی بیگم	اترپردیش اردو اکادمی، لکھنؤ	۱۹۸۲ء
۷۵	مکاتیب واشعار مولانا عبدالسلام ندوی	مرتب: پروفیسر کبیر احمد جائسی	مولانا عبدالسلام ندوی فاؤنڈیشن، ممبئی	۲۰۰۶ء
۷۶	مکتوبات حکیم الاسلام	مرتب: مولانا شفیق احمد قاسمی	پیغام بک ڈپو، جلال پور، امبیڈکر نگر	۲۰۰۰ء
۷۷	ملاقاتیں	ڈاکٹر سید عبدالباری	انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز، نئی دہلی	۲۰۰۳ء
۷۸	ملفوظات رومی	عبدالرشید تبسم (مترجم)	ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور	۱۹۷۹ء
۷۹	موج کوثر	شیخ محمد اکرام	ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور	۱۹۸۲ء
۸۰	مولانا ابوالکلام آزاد- فکروفن	ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد	نسیم بک ڈپو، لکھنؤ	۱۹۷۸ء
۸۱	مولانا محمد علی-ایک مطالعہ	عبداللطیف اعظمی	علمی ادارہ، ذاکر نگر، نئی دہلی	۱۹۸۰ء

۸۲	مولوی نذیر احمد دہلوی- احوال و آثار	ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی	مجلس ترقی ادب، لاہور	۱۹۷۱ء
۸۳	نقد واثر	ڈاکٹر شمس بدایونی	اردو بک ریویو، نئی دہلی	۲۰۰۴ء
۸۴	نقش ہائے رنگ رنگ	سید رضی الدین احمد	کتاب منزل، سبزی منڈی، پٹنہ	۱۹۸۱ء
۸۵	نقوش ادب	مہ لقا اعجاز	خورشید بک ڈپو، امین آباد، لکھنؤ	۱۹۹۸ء
۸۶	نقوش رفتگاں	مولانا محمد تقی عثمانی	زم زم بک ڈپو دیوبند	۱۹۹۴ء
۸۷	نقوش زندگی	مولانا مجیب اللہ ندوی	مولانا مجیب اللہ ندوی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، اعظم گڑھ	۲۰۱۲ء
۸۸	نگارشات	مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی	مجلس علمی، نئی دہلی	ندارد
۸۹	نیاز فتح پوری	امیر عارفی	انجمن ترقی اردو، نئی دہلی	۱۹۷۷ء
۹۰	نئے اور پرانے چراغ	پروفیسر آل احمد سرور	ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ	۱۹۷۸ء
۹۱	ہم قبیلہ	علی جواد زیدی	اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ	۱۹۹۰ء
۹۲	ہندوستان میں اسلامی صحافت کی تاریخ اور ارتقاء	ڈاکٹر سلیم الرحمٰن خان ندوی، مترجم مولانا احسن علی خاں ندوی	مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ	۲۰۱۳ء، ۱۴۳۴ھ
۹۳	ہندوستان کی یونی ورسٹیوں میں اردو تحقیق	شاہانہ مریم شان	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی	۲۰۱۲ء

۹۴	یادرفتگاں	ماہرالقادری	مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، دہلی	۲۰۰۰ء
۹۵	یادگارشبلی	ایس.ایم.اکرام	ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور	۱۹۷۱ء
۹۶	یادوں کی دنیا	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	معارف پریس دارالمصنفین اعظم گڑھ	۱۹۶۷ء
۹۷	یادیں	رحم علی الہاشمی	رحم علی الہاشمی، علی گڑھ	۱۹۷۶ء

English Book

1	A History of Urdu Literature	Sadiq Muhammad	Oxford, London	1984
2	Bibliography of the Translationof the Meanings of the Glorious Quran into English: 1649-2002 A Critical Study	Prof. Abdur Raheem Kidwai	King Fahad Quran Printing Complex, Madinah, K.S.A.	2007
3	Encyclopaedia of Indian Literature A-Devo, Vol. I	Edited by Amaresh Datta	Sahitya Akademi, New Delhi	1987

4	Encyclopedic Dictionary of Urdu Literature. Vol. I	Editited by: Abida Samiuddin	Global Vision Publishing House, New Delhi	2007
5	Famous Urdu Poets and Writers	Sir Abdul Qadir	New Book Society, Lahore	1947
6	Gabriel's Wing	N. Marry Sheaml	Leaden NJ Bearl	1963
7	History of Urdu Literature	A.J. Zaidi	Delhi	1993
8	The Pursuit of Urdu Literature: A select History	Russell Ralph	Zed Books, London	1992
9	Translating the Untranslatable: A critical guide to 60 English translations of the Quran	Prof. Abdur Raheem Kidwai	Sawrup and Sons, New Delhi	2011

چند اہم ویب سائٹس جن میں مولانا عبدالماجد دریابادی کی حیات وخدمات کا تذکرہ ہے:

www.wikipedia.org
www.quran4thworld.com
www.letmeturnthetables.com
www.sunniforum.com
www.islamicbookslibrary.wordpress.com
www.yatedo.com
www.allbookstores.com
www.shibliacademy.org
www.dli.ernet.in
www.wordcat.org
www.windowtoislam.blogpost.com
www.slideshare.net
www.islamcbulletin.org
www.sunnitigerscamp.blogpost com
www.evi.com
www.kvisionbooks.com
www.milvo.com
www.al-quran.info
www.dbpedia.org
www.youtube.com/khutba-e-nikah
www.understandquran.com
www.openlibrary.org
www.sidqfoundation.com

معمولات ماجدی

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اپنے علمی مشاغل اور دیگر معمولات کی انجام دہی کے لیے ۱۹۲۱ء کے آغاز میں لکھنؤ کی سکونت ترک کر کے اپنے آبائی قصبے دریاباد (ضلع بارہ بنکی) منتقل ہو گئے۔ انہوں نے شہر نگاراں لکھنؤ کی تہذیبی جلوہ آرائیوں، تمدنی دل فریبیوں، ثقافتی رنگینیوں اور پُرتعیش و پُرتکلف طرز معاشرت کو اس وقت چھوڑا جب کہ ان کی عمر صرف ۲۹ برس تھی۔ لکھنؤ، علی گڑھ اور دہلی کے تعلیم یافتہ اس جوان رعنا نے عروس البلاد کی ہنگامہ پرور، تلاطم خیز، پُرکشش اور سحر انگیز زندگی پر دریاباد کی قصباتی، سادہ، جامد، بے رنگ، بے کیف، دشوار، شہری آسایشوں اور مدنی آرائشوں سے دور زندگی کو ترجیح دی۔

مولانا دریابادی کا یہ علمی اعتکاف ۵۵ برسوں پر محیط ہے۔ ان کی قابل صد رشک گوناگوں دینی خدمات اور علمی فتوحات قصبہ دریاباد کے پُرسکون ماحول کی رہین منت ہیں۔

مولاناؒ انضباط اوقات اور تنظیم کار کی اعلیٰ مثال تھے۔ اس کا نمونہ ان کی درج ذیل تحریر ہے۔ یہ اصلاً پروفیسر مولانا محمد اشرف خاں اسلامیہ کالج پشاور، مسترشد خاص علامہ سید سلیمان ندویؒ کے ایک استفسار کے جواب میں ہے۔ یہ ماجدی نظام اوقات پروفیسر موصوف کی سرپرستی میں شایع ہونے والے ماہ نامے البیان پشاور کی اشاعت اول شوال ۱۴۰۳ھ مطابق جولائی ۱۹۸۳ء میں شایع ہوا تھا۔ بعد ازاں صدق جدید لکھنؤ میں شایع ہوا۔ مولانا رقم طراز ہیں:

"صبح تڑکے ایسے وقت اٹھنا کہ نماز فجر سے قبل آدھا گھنٹہ مشی بھی کر لی اور اس میں تھوڑا بہت کچھ پڑھ بھی لیا۔ باوضو ہوتا ہوں، واپس ہوتے ہی نماز فجر شروع کر دی۔

روزانہ کچھ نہ کچھ ورزش اپنے سن، جثہ اور قویٰ کے متناسب لازمی ہے۔ بہت دیر کے بعد اور بہت نقصان اٹھا کر یہ سبق سیکھ سکا۔ بعد فجر برائے نام کچھ پڑھا پڑھایا کہ چند منٹ بعد ناشتہ آ گیا۔ اب تک چائے کا عادی تھا، اب چند روز سے بجائے چائے کے محض گرم پانی میٹھا کر کے شروع کیا۔ نفع اس کا بھی وہی، یعنی رفع قبض اور چائے کے مضرات سے نجات۔ ''ورکنگ ڈے'' اسی وقت سے شروع ہو جاتا ہے۔ یعنی اخبار، رسالے وغیرہ ناشتے کے ساتھ پڑھتا جاتا ہوں۔ اس کے بعد لڑکیاں سلام کو آئیں۔ کچھ لکھنے پڑھنے کا کام انہوں نے کیا اور کچھ باتیں ان سے عام تربیت کی ہوئیں۔ اب خط کے جوابات لکھے اور متفرق کام (حوالے کی کتابیں تلاش کر رکھیں، جن کی دن میں ضرورت پڑے گی۔ وغیرہا) کیے۔ ساڑھے نو پر ڈاک روانہ کر دی۔ تازہ وضو کے بعد بیوی بچوں سے مختصر ملاقات کرتا ہوں۔ دوسرے کمرے میں آیا جو اصل تصنیف گاہ ہے۔ یہاں دس سے دو بجے تک مسلسل لکھتا ہی رہتا ہوں، زیادہ تر قرآن مجید کے سلسلے میں، کسی دن کچھ اور- دو بجے نماز ظہر۔ (دن کا کھانا وقت بچانے کے خیال سے سال ہا سال سے ترک کر دیا ہے) بعد نماز ظہر ہلکا سا ناشتہ، جو کام میں مخل نہ ہو۔ بعد ناشتہ پھر متفرق کام، عموماً صدق کا۔ جس زمانے میں لڑکے اور لڑکیاں موجود ہوئے، کوئی آدھ گھنٹے کا وقت ان کے لیے۔ فرداً فرداً ان سے ہر قسم کی آزادانہ بات چیت، ان کے ذاتی مسائل (Problems) پر گفتگو، کبھی کبھی درس مثنوی بھی۔

اس کے بعد نماز عصر، پھر تازہ ڈاک آ گئی جس میں اخبارات اور رسالوں کی بھرمار ہوتی ہے۔ انگریزی اور اردو روزنامے ہی ہندو پاکستان کے ملا کر ۲۵ ہوتے ہیں۔ سہ روزہ، ہفت روزہ ان کے علاوہ۔ سات آٹھ تو بغیر پڑھے ردّی میں ڈال دیتا ہوں، پھر بھی اچھے خاصے پڑھنے پڑتے ہیں۔ مغرب سے آدھا گھنٹہ قبل برآمدے میں بیٹھ جاتا ہوں، وہ وقت عام ہوتا ہے، ڈاک بھی ساتھ ساتھ دیکھتا جاتا ہوں۔

بعد مغرب فوراً ہی کھانے پر بیٹھ جاتا ہوں اور دانتوں کی خرابی کے باعث دیر تک کھاتا رہتا ہوں۔ ضعف بصارت کے باعث رات کا پڑھنا لکھنا کئی سال سے موقوف ہے۔ کھانے کے بعد برائے نام چہل قدمی چھت پر کر لی اور پھر نیچے آکر بیوی اور لڑکیوں کے پاس بیٹھ گیا۔ ان سے باطمینان ملنے کا یہی وقت ہوتا ہے۔ لڑکیوں نے دن میں جو کچھ پڑھا تھا، (حضرت تھانویؒ کے وعظ، مثنوی کے ترجمے کی برابر تاکید رہتی ہے) اُسے میرے سامنے دہراتی ہیں اور بہت سی باتیں کام کی الحمدللہ ہو جاتی ہیں۔ گھنٹہ سوا گھنٹہ کے بعد عشاء کے لیے آیا۔ بعد نماز بیوی تھوڑی دیر کے لیے آجاتی ہیں۔ ان سے ملنے کا یہی وقت ہوتا ہے۔ وہ اُدھر گئیں اور اِدھر میں سونے لیٹ گیا۔

یہ پروگرام ظاہر ہے کہ ہر ایک کے لیے قابل عمل نہیں، تاہم بہ اختلاف احوال کسی نہ کسی حد تک نمونے کا کام ان شاء اللہ دے سکے گا۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا جتنا احسان مند ہوں، بس میرا دل ہی جانتا ہے۔ دوسرے اہل ہمت تھے، انہوں نے ان سے دین لیا۔ میں کم ہمت تھا، میں نے دنیا ان سے لی۔ انہوں نے زندگی بنادی۔ تربیت اور تنظیم جو کچھ آئی ان ہی کے فیض سے، ورنہ پہلے اِنتشار ہی انتشار تھا۔

دو ایک باتیں رہ گئیں، مہمانوں اور ملاقاتیوں کا ضرور نظم قائم کیا جائے۔ میرے ہاں کوئی عزیز بھی بغیر اطلاع سابق مہمان نہیں آسکتا۔ ہر ایک سے وقت پہلے ہی طے ہو جاتا ہے۔ دوستوں، ملاقاتیوں کے لیے وہی قبل مغرب آدھ گھنٹے کا وقت مقرر ہے۔ خاص صورتوں میں وقت پہلے سے مقرر کیا جاتا ہے۔ تنظیم اوقات میں دقت شروع میں ضرور ہوگی لیکن رفتہ رفتہ لوگ عادی ہو جائیں گے اور اپنے کو انتہائی راحت ملنے لگے گی''۔ (منقول از صدق جدید، لکھنؤ، ۱۲/اگست ۱۹۸۳ء، شمارہ نمبر ۳۶، جلد نمبر ۳۳)

مولانا دریابادی کا مجد علمی

ممتاز اہل علم کی نگاہ میں

مولانا عبدالماجد دریابادی کا رابطہ اور تعلق اپنے عہد کے چوٹی کے علمائے کرام، مصنفین، محققین، ناقدین، ادباء، انشاپردازوں، صحافیوں اور زعمائے قوم وملت سے بہت گہرا تھا، جس کا ثبوت مولانا دریابادی کی خودنوشت آپ بیتی، معاصرین، وفیات ماجدی، مکتوبات ماجدی (۱ تا ۷) اوران کی دیگر تحریریں ہیں۔ وہ حضرات بھی مولانا کو بہت پسند کرتے تھے۔ انہوں نے مختلف مواقع پر مولانا کی شخصیت، ان کی فکرونظر، ان کے علمی وادبی کمالات اوران کی گوناگوں صلاحیتوں کا اعتراف کھل کر کیا ہے۔

ذیل میں بعض چیدہ اہل علم وقلم کے گراں قدر تأثرات اور مولانا کے مجد علمی کے اعترافات پیش ہیں:

مایہ ناز سیرت نگار رسول اکرمؐ، ممتاز مؤرخ وسوانح نگار، اردوزبان وادب کے ارکان خمسہ کے رکن رکین، متکلم اسلام، شاعر، ''مصنف، مصنف گر'' علامہ شبلی نعمانیؒ (متوفی ۱۹۱۴ء) اولین معتمد تعلیم ندوۃ العلماء، لکھنؤ مولانا عبدالماجد دریابادی کوان کی ترجمہ نگاری کی دادیوں دیتے ہیں:

''ترجمے کی خوبی مستغنی عن الوصف ہے.........آپ صرف مترجم نہیں بلکہ مصنف بھی ہیں۔ اس لیے آپ کے سوا کوئی اور شخص مشکل سے میرے ارادوں اورخواہشوں کے موافق کام کرسکے گا''۔ (ملاحظہ ہو مکتوب نمبر۵، محررہ ۱۵/نومبر ۱۹۱۳ء۔ خطوط مشاہیر حصہ اول، ص: ۱۴، ۱۵، مرتبہ مولانا دریابادی)

یہ خط اس وقت کا ہے جب علامہ شبلی اپنی شاہ کار کتاب سیرت النبیؐ کی تالیف میں منہمک تھے اور انہوں نے اپنی کتاب کے انگریزی مآخذ کے اردو ترجمے کا کام مولانا دریابادی کے سپرد کر رکھا تھا۔

۱۹۱۴ء میں کیننگ کالج لکھنؤ میں فلسفہ پڑھانے کی جگہ عارضی طور پر خالی ہوئی، مولانا دریابادی نے اس کے لیے کوشش کی۔ اس سلسلے میں انہوں نے اپنی ''علمی و تصنیفی دنیا میں محسن اول اور استاد کامل'' مولانا شبلی سے ایک سند نامہ حاصل کیا۔

''مولوی عبدالماجد صاحب بی.اے. کو ایک مدت سے جانتا ہوں۔ ان کے علمی اور خصوصاً فلسفیانہ مضامین میں نے کثرت سے پڑھے ہیں۔ مجھ کو یہاں تک معلوم ہے ہندوستان میں کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو نہایت دقیق فلسفیانہ مسائل کو اس خوبی سے ادا کرسکتا ہو، جس طرح کہ عموماً مولوی عبدالماجد صاحب کے مضامین میں پائے جاتے ہیں۔

میں انگریزی نہیں جانتا، لیکن مصر و شام میں یورپ کا فلسفہ جس قدر عربی میں منتقل ہوا ہے، سب میرے پیش نظر ہے۔ میں بے تکلف کہہ سکتا ہوں کہ کسی عربی ترجمے یا مستقل تصنیف میں بھی فلسفیانہ مسائل اس خوبی سے ادا نہیں کیے گئے ہیں۔

مولوی صاحب موصوف بالطبع فلاسفر ہیں، ان کا ذوق خالص علمی ذوق ہے۔ وہ ہمہ وقت فلسفہ اور متعلقات فلسفہ کے مطالعے میں مشغول رہتے ہیں اور یہ بالکل قطعی ہے کہ گو وہ فلسفے میں ایم.اے. نہیں ہیں لیکن کثیر التعداد ایم.اے. سے بہتر ہیں۔ اگر وہ فلسفے کے پروفیسر مقرر ہوں تو میں کالج کی خوش قسمتی سمجھوں گا۔

ان اوصاف کے علاوہ ان کے ذاتی اخلاق و عادات، متانت و سنجیدگی اور شرافت نسب کی بہتر سے بہتر شہادت دے سکتا ہوں''۔ (ملاحظہ ہو: حاشیہ مکتوب نمبر ۲۶، ص: ۲۵، ۲۶، حوالہ بالا)

مولانا دریابادی کے نام ایک اور مکتوب میں علامہ موصوف ان کی ترجمہ نگاری کی

ستایش ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''نولدیکی کا ترجمہ میرے پاس موجود تھا، تاہم آپ پورا کر دیجیے۔ آپ کا ترجمہ قابل سند ہوگا''۔ (ملاحظہ ہو: مکتوب نمبر ۳۰ حوالہ سابق، ص: ۲۷)

مشہور اسلامی و مشرقی شاعر، بلند پایہ ادیب، پیر ظریف، لسان العصر میر اکبر حسین اکبرالہ آبادی (متوفی ۱۹۲۱ء) سابق جج عدالت خفیفہ، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ سے عمر میں چھیالیس برس بڑے تھے لیکن مولانا کی علمی اور ادبی صلاحیتوں کے مداح خصوصی تھے ۱۹۱۳ء میں جب مولانا اردو میں فلسفہ ونفسیات کی انگریزی اصطلاحوں کا ترجمہ کررہے تھے، اس زمانے میں مولانا کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

''آپ جو الفاظ (بعد غور) مقرر فرمائیں گے، ہم طالبان علم پر اس کی پابندی لازم ہوگی............ آپ کے سامنے نہایت مشکل اور عظیم الشان کام ہے اور اس وقت اور اسی جماعت میں آپ کے مذاق اور آپ کے معلومات نے آپ کو اس کا اہل کیا ہے۔ ہم لوگوں کو حق نہیں ہے کہ بغیر شرکت اور ذمہ داری کے آپ کو ٹوکیں، ہاں مشورت مطلوب ہو تو حاضر رہنا چاہیے، یہ تو خیر کچھ الفاظ کا مرتب اور یکجا کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کا علم اور آپ کی عمر زیادہ کرے....... مغربی فلاسفروں کو (بعض مباحث میں) آپ نے ماشاء اللہ خوب اسٹڈی کیا۔ شاید ہی آپ کا کوئی مقابل ہو''۔ (ملاحظہ ہو مکتوب نمبر ۱، ص ۴۰-۴۲ حوالہ سابق)

۲۲ر فروری ۱۹۱٦ء کے تحریر کردہ مکتوب میں لکھتے ہیں:

''آپ اس دور میں ان چند لوگوں میں ہیں جن کو دنیا امتیاز کے ساتھ یاد رکھے گی۔ خدا آپ کو تن درست رکھے اور اطمینان عطا فرمائے''۔ (ملاحظہ ہو مکتوب نمبر ۵۱، حوالہ بالا، ص: ۸۱، ۸۲)

مولانا دریابادی کے زمانہ الحاد میں ۲۱ر جون ۱۹۱۸ء کے اپنے مکتوب میں تحریر کرتے ہیں:

''......ابھی آپ کا خط پہنچا۔ بے ساختہ مولانا نیاز احمد صاحب قدس سرہ کے ایک شعر پر میں نے تضمین کی ؎

دل میں مرے تو ہے اک امید کا قصیدہ ماجد کو آپ سمجھیں گے بے گانۂ طریقت
ارشاد کرگیا ہے اک عبد برگزیدہ ہیں غالباً مصداق وہ اس شعر با اثر کے
آہوئے دشت ہویم از ماسوا رمیدہ'' من پاک باز عشقم ذوقِ فنا چشیدہ

(ملاحظہ ہو مکتوب نمبر ۹۸، حوالہ سابق، ص:۱۱۹)

۲۶ر ستمبر ۱۹۱۸ء کے خط میں تحریر کرتے ہیں:

''دوستوں نے آپ کو مسلمان ثابت کرنے کو قلم اٹھایا۔ میں نے عاشقان الٰہی میں داخل کر دیا۔ نباہ اللہ کے ہاتھ ہے''۔

اس خط پر مولانا دریابادی کا حاشیہ ملاحظہ ہو:

''اللہ اللہ! یہ حضرت اکبر ہی کا کمال تھا کہ عین میرے الحاد کے زمانے میں میرے باایمان ہونے کی پیش گوئی کر دی تھی۔ (ملاحظہ ہو: مکتوب نمبر ۱۰۶ احوالہ سابق، ص:۱۲۴)

اکبر الہ آبادی ایک اور مکتوب میں رقم طراز ہیں:

''میں نے بے ساختہ آپ کی نسبت لکھ دیا تھا ع

آہوئے دشت ہویم از ماسوا رمیدہ

میں خوش ہوں کہ اس کی صداقت کے آثار آپ کی صاف اور بلند طبیعت سے نمایاں ہوتے جاتے ہیں۔ ہمارے مکرم ڈپٹی صاحب مرحوم (مولوی عبدالقادر والد ماجد مولانا دریابادی) کو شاید شبہ و افسوس تھا کہ لڑکا دین سے بے گانہ ہوتا جاتا ہے۔ اب فرشتوں سے یہ سن کر ان کی روح خوش ہوگی کہ وہ لڑکا حقیقت سے آشنا ہوتا جاتا ہے اور ان شاء اللہ بہت جلد کہہ دے گا ''بمقامے رسیدہ ام کہ مپرس''۔ (ملاحظہ ہو: مکتوب نمبر ۱۱۹، حوالہ سابق، ص:۱۳۲)

۳۱ر دسمبر ۱۹۱۹ء کے خط میں لکھتے ہیں:

''عزیزی وحبیبی سلمہٗ اللہ تعالیٰ۔ آپ کے خط سے بہت خوشی ہوئی۔ جب میں نے یہ کہا تھا کہ آپ اس کے مصداق ہیں ؎

من پاک باز عشقم ذوقِ فنا چشیدہ
آہوئے دشت ہویم از ماسوا رمیدہ

اس وقت میں نے دیکھ لیا تھا کہ آپ کی وہ طبیعت آپ کو کدھر لے جائے گی۔ آپ ہنوز راہ میں ہیں، لیکن سیدھی راہ ہے۔ ابھی آپ نہیں جانتے کیا نعمتیں آپ کو ملنے والی ہیں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ (ملاحظہ ہو مکتوب نمبر:۱۴۷، ص:۱۵۲، ۱۵۳ حوالہ سابق)

۲۳رجنوری ۱۹۲۰ء کے خط میں تحریر کرتے ہیں:

''عزیز من سلمہٗ اللہ تعالیٰ۔ ماشاء اللہ چشم بددور۔ میں ہرگز گمان نہ کرسکتا تھا کہ آپ اس بلندی پر پہنچ گئے ہیں۔ آیہ "علوا فی الارض" (۱) مدت سے پیش نظر ہے۔ خاموشی کے ساتھ باطنی ترقی میں مصروف رہیے۔ "لقد جئتمونا فرادیٰ کما خلقناکم اوّل مرۃ". (سورہ الانعام:۹۴) یاد رکھیے۔ کاش آپ سے جلد ملاقات ہو۔ آیے ہم لوگ اللہ کے واسطے، حق کے واسطے، روحانیت کے واسطے، عقل سلیم کے واسطے، متانت و وقار کے واسطے ایک جماعت ہوں۔ ایسے لوگ کم ہیں۔ میں اللہ کا شکر کرتا ہوں کہ ابتدا ہی میں اس نے آپ کی نسبت مجھ کو اس مصرعے کو متعلق کرنے کا الہام فرمایا ع

آہوئے دشت ہویم از ماسوا رمیدہ

آپ بوڑھے نہیں، مفسر نہیں، آیت "علوا فی الارض" پر نظر پہنچ جانا حیرت انگیز ہے''۔ (ملاحظہ ہو: مکتوب نمبر ۱۵۱، حوالہ سابق ص:۱۵۵، ۱۵۶)

اس خط کے حاشیے میں مولانا دریابادی تحریر کرتے ہیں:

---

(۱) سورۃ القصص کی آیت پوری یہ ہے: "تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَّالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ". (۸۳) ترجمہ: یہ عالم آخرت تو ہم انہی لوگوں کے لیے خاص کردیتے ہیں جو زمین پر نہ بڑا بننا چاہتے ہیں نہ فساد کرنا اور انجام (نیک) تو متقیوں ہی کا (حصہ) ہے۔

''خلافت اور ترک موالات کی تحریکیں اب سرگرمی سے جاری تھیں، سارے ملک میں ایک زبردست ہیجان برپا تھا۔ میں نے ایک عریضے میں لکھا تھا کہ ان کمیٹیوں اور جلسوں جلوسوں میں بڑا حصہ حب دنیا کا ہے۔ اخلاص وخدا پرستی خال خال ہی ہے، حال آں کہ مطلوب وہی ہے اور شہادت میں سورۃ القصص کی آیت تــلــك الــدار الآخرۃ.... علوا فی الارض'' پیش کی تھی۔

یہ ۲۰ء ہے۔ میں بحمد اللہ اب از سر نو مسلمان ہو رہا تھا۔ حضرت اکبر میرے ان باطنی انقلابات سے پوری طرح باخبر نہ تھے۔ (حالاں کہ ان انقلابات میں خود ان کے اصلاحی اثرات کو بھی خاص دخل تھا) میری زبان سے آیت قرآنی سے استشہاد سن کر حیرت کے ساتھ داد دے رہے تھے۔

یہ فیاضانہ بلکہ خسروانہ ہمت افزائی زیادہ تر اس بنا پر ہے کہ مجھ سے اس وقت ان خیالات کی توقع کسی کو نہ تھی''۔

معروف عالم ومفسر قرآن، مشہور صاحب طرز ادیب وصحافی مولانا ابوالکلام آزادؒ (متوفی ۱۹۵۸ء) سابق وزیر تعلیم حکومت ہند کی ماجد شناسی:

''آج کل کے نوجوان تعلیم یافتہ اصحاب میں بعض اشخاص ایسے بھی ہیں جن کو عام حالت میں حق امتیاز واستثنا حاصل ہے، ہماری مایوسیوں میں وہ اپنے اندر ایک نشان امید رکھتے ہیں۔ میں ان کی وقعت کرتا ہوں، انہی چند لوگوں میں میرے عزیز دوست مسٹر عبدالماجد بی.اے. ہیں۔ مجھ کو یقین ہے کہ ان کا ذوق علمی اردو زبان کو ان شاء اللہ بہت فائدہ پہنچائے گا اور علوم حدیثہ کے تراجم مین ان سے بہت مفید مدد ملے گی، جو اَب تک اردو زبان میں گویا مفقود محض ہیں''۔ (الہلال، کلکتہ ۲ ستمبر ۱۹۱۳ء)

حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند، سابق صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ (متوفی ۱۹۸۳ء) کے تاثرات:

جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے پروفیسر حافظ اسلم جے راج پوری سابق مدیر ماہ نامہ جامعہ نئی دہلی نے اپنے ماہ نامے میں ''دریائے کذب'' کے نام سے مسلمانوں کے لیے نہایت دل آزار مضمون لکھا۔ انہوں نے اس مضمون میں صحابہ کرامؓ کی تنقیص کی اور ذخیرۂ احادیث کو جھوٹ اور کذب کا پلندہ قرار دے کر اس کو نا قابل اعتبار ٹھہرایا۔ اس دل آزار مضمون کا علمی و تحقیقی جواب مولانا دریابادی نے اپنے ہفتہ وار سچ لکھنؤ میں ''دریائے کذب۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تازہ ریسرچ'' کے عنوان سے تحریر کیا۔ مولانا کا یہ جوابی مضمون ۲۴/اپریل ۱۹۳۱ء کے شمارے میں شایع ہوا۔ اس کو پڑھ کر مولانا قاری محمد طیب نے مولانا کو ذیل کا مکتوب تحریر کیا:

''مخدومی معظمی دامت فیوضکم و برکاتکم

بعد سلام مسنون و مبارک باد عید قرباں عرض ہے۔ کل کا پرچہ ''سچ'' نظر سے گزرا اور اس میں مضمون بعنوان ''دریائے کذب'' پڑھا، جس عالمانہ و فاضلانہ انداز میں جناب نے اس موضوع پر قلم زنی فرمائی اور دفاع عن الدین کا فریضہ ادا فرمایا، وہ آپ کا حصہ تھا۔ خدا تعالیٰ شاہد ہے کہ اس مضمون کے ایک ایک کلمے کو پڑھ کر بے اختیار جی چاہتا تھا کہ مضمون نگار کے ہاتھوں کو معتقدانہ بوسہ دوں اور اس کے پیروں سے آنکھیں ملوں۔ جزاکم اللّٰہ عنّا وعن العلماء وعن جمیع المسلمین أحسن الجزاء.حمایت وصیانت دین کی جو ذمہ داری حق تعالیٰ نے خود اپنے ذمے رکھی ہے، اس کا فضل ہے کہ اس نے اس باب میں آپ کا انتخاب فرمایا اور وسائل عمل میں داخل فرمالیا۔ والحمد للہ۔ اسلم صاحب کے ''دریائے کذب'' سے جس قدر کوفت اور کلفت ہوئی تھی، الحمد للہ آپ کے ''بحر صدق'' نے سب دھوڈالی۔ اس زیغ کے مقابلے میں آپ نے جس علمی رسوخ اور صدق و یقین کو پیش فرمایا، اس سے زیادہ کوئی عالم آخر کیا کہے گا۔ حق یہ ہے کہ حق ادا کردیا''۔ (مکتوبات حکیم الاسلام، ص:۲۸۷، مرتب: مولانا شفیق احمد قاسمی)

مولانا دریابادی نے ۱۹۷۳ء میں حضرت قاری صاحب موصوف کو ایک مکتوب لکھ کر اپنے حسن خاتمے کے لیے دعا کی درخواست کی تھی۔ اس کے جواب میں حکیم الاسلامؒ نے جو مکتوب تحریر کیا، اس کے کچھ جملے یہ ہیں:

''حق تعالیٰ جناب کو صحت کامل عطا فرما کر مسلمانوں کے سروں پر قائم رکھے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

.......حق تعالیٰ نے جناب محترم کو جیسے دنیا میں قلب مفکر عطا فرمایا وہیں الحمد للہ آخرت کے لیے متفکر بھی ارزانی فرمایا۔ یہ فکر آخرت وہ جب ہی دیتے ہیں جب صاحب دل کے لیے نجات و درجات مقصود ٹھہرا لیتے ہیں.......آپ بحمد اللہ اونچے مقام پر فائز ہیں۔ حق تعالیٰ نے آپ کے ہاتھوں اپنے کلام پاک کی تفسیر مکمل کرائی جسے ہم فخر کے ساتھ اغیار کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ''صدق'' کے کالموں میں آپ نے بہ مقابلۂ اغیار اسلامی تدین وتمدن کی حفاظت فرمائی۔ یہ خدمات رائے گاں نہیں جائیں گی۔ ان شاء اللہ۔ (ملاحظہ ہو: حوالہ سابق، ص: ۳۱۴ تا ۳۱۶)

خانوادہ علم اللٰہی اور فکر ولی اللٰہی کے گل سرسبد مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ (متوفی ۱۹۹۹ء) سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ، سابق صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے مشاہدات وتاثرات:

''مخدومی مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی مدظلہ ضابطے سے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے فاضل وتعلیم یافتہ نہیں۔ خوش قسمتی سے اگر ایسا ہوتا تو یہ اس شہرۂ آفاق تعلیم گاہ کے لیے باعث نازش وافتخار اور اس کے ذمہ داروں کے لیے سرمایۂ مسرت وانبساط ہوتا۔ (ماخوذ از ''پیش لفظ''، ص: ۵، ''ندوۃ العلماء کا پیام فرزندان دارالعلوم ندوۃ العلماء کے نام'' از مولانا عبدالماجد دریابادی)

مدراس میں مولانا علی میاںؒ نے اپنی پہلی تقریر میں کہا:

''عن قریب وہ زمانہ آنے والا ہے، جب لوگ اس پر فخر کریں گے کہ ہم نے مولانا عبدالماجد دریابادی کو دیکھا اوران کی زبان سے کچھ سنا تھا''۔(ملاحظہ ہو: پیش لفظ،ص:ا''مشکلات القرآن از مولانا عبدالماجد دریابادی)

مفکر اسلامؒ مولانا دریابادیؒ کی ترجمہ نگاری کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

''.....مولانا عبدالماجد دریابادی کی خصوصیت ہے کہ ان کی کوئی تحریر ادب وزبان کی چاشنی سے خالی نہیں اور کہیں ان کا اسلوب تحریر جوان کی شخصیت بن گیا ہے،ان کا ساتھ نہیں چھوڑتا، حد یہ ہے کہ ان کی کتاب ''ہسٹری آف یورپین مارلس'' کے ترجمے''تاریخ اخلاق یورپ''میں بھی (جواپنے موضوع، اپنی فنی اصلاحات، اردو کی تنگ دامنی اور ترجمے کی مشکلات کی وجہ سے نہایت مشکل کام تھا) وہ پورے طور پر کام یاب ہوئے ہیں اور پوری کتاب میں کہیں ثقالت وخشکی اور ترجمہ پن نظر نہیں آیا''۔(ملاحظہ ہو:ماہ نامہ فروغ اردو لکھنؤ:مولانا عبدالماجد دریابادی نمبر اگست تا اکتوبر ۱۹۷۱ء،ص:۲۷، ۲۸)

مولانا دریابادی کے ہفتہ وار سچ لکھنؤ کی افادیت، مسلم معاشرے پر اس کے اثرات اوراس کے مشمولات کے بارے میں مولانا علی میاںؒ رقم طراز ہیں:

''''سچ'' کے مطالعے نے دو بڑے کام کیے۔ایک مغربی تہذیب کی جس کو مولانا یاجوجی تمدن اور دجالی فتنے سے تعبیر کرتے تھے، حقارت اور بے وقعتی اور اس کے ثبوت میں دلائل وواقعات کی فراہمی جو مولانا برطانیہ سے نکلنے والے انگریزی پرچوں سے براہ راست مہیا فرماتے تھے۔دوسرے لسان العصر میر اکبر حسین الٰہ آبادی کی شاعری اور ان کے حکیمانہ خیالات سے گہری واقفیت اور قلبی مناسبت!اکبر کے کلام سے مخصوص خاندانی ماحول اور ہم خیالی کی بنا پر مناسبت تو شروع ہی سے تھی،لیکن ''سچ'' نے اس کو عقیدت ومحبت کے درجے تک پہنچادیا۔''سچ'' کا کوئی پرچہ مشکل سے ان دونوں باتوں سے خالی ہوتا

تھا''۔ (ملاحظہ ہو، ص: ۲۸، حوالہ سابق)

اسی مضمون میں حضرت مولانا علی میاںؒ مفسر دریابادیؒ سے اپنے تفسیری استفادے کا ذکر یوں کرتے ہیں:

''میں اپنے درس میں سورہ بقرہ میں ہاروت و ماروت کے قصے وما کفر سلیمان ولکن الشیاطین کفروا کی آیت پر پہنچا تو مجھے ضرورت محسوس ہوئی کہ مولانا کی تحقیقات و مطالعے سے استفادہ کرلوں۔ غالباً سبق روک کر میں پہلی مرتبہ دریاباداس مقصد سے گیا۔ مولانا نے قرآن کے ایک طالب علم کی حیثیت سے بھی اور دیرینہ تعلقات کی بنا پر بھی بڑی شفقت فرمائی۔ میں وہاں سے ایسے بہت سے سوالات کا جواب اور بہت سا قیمتی مواد لے کر آیا۔ یہ اتفاق غالباً کئی بار پیش آیا کہ مجھے جب کوئی ایسی مشکلات پیش آتیں تو میں دریاباد کا قصد کرتا یا مولانا کو خط لکھتا۔ مولانا ہمیشہ جواب شافی سے مدد فرماتے۔ مولانا کے یہ خطوط جو تقریباً سب میرے پاس محفوظ ہیں، نہ صرف تفسیر کے طالب علموں کے لیے بلکہ عام اہل ذوق کے لیے بھی افادیت رکھتے ہیں''۔ (حوالہ سابق)

مفکر اسلامؒ مولانا دریابادیؒ کے گوناگوں اوصاف وکمالات کا اعتراف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''وہ اپنے زمانے کی نادرۂ روزگار اور صاحب کمال شخصیتوں میں سے ہیں۔ ایک ادیب و صاحب قلم کی حیثیت سے بھی، قرآن کے ایک مفسر و خادم کے لحاظ سے بھی، قدیم وجدید کے ایک جامع عالم کے طور پر بھی اور اپنے وقت اور صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے اور فائدہ پہنچانے والے انسان کی حیثیت سے بھی، ایک کہنہ مشق صحافی اور ایک صاحب طرز ناقد و طنز نگار کی بنا پر بھی، وہ ہر طرح قابل قدر اعزاز کے مستحق ہیں۔ میں نے ان کے متعلق مدراس کی تعارفی تقریر میں کہا تھا کہ ایک زمانہ آئے گا کہ اس نسل کے لوگ اس پر فخر کریں گے کہ ہم نے مولانا عبدالماجد دریابادی کو دیکھا تھا اور ان کی باتیں سنی

تھیں۔ (ملاحظہ ہو، ص:۳۱، حوالہ سابق)

مشہور صحافی اور زود نویس مصنف مولانا رئیس احمد جعفری ندوی (متوفی ۱۹۶۸ء) کے ملاحظات و تاثرات:

''مولانا طنزیات کے بادشاہ ہیں۔ نثر میں ''رعایت لفظی'' اس کمال سے استعمال کرتے ہیں کہ سہل ممتنع کا مزہ آجاتا ہے۔ طرز تحریر اتنا دل نشیں کہ

بلائے جاں ہے غالبؔ اس کی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

اور پھر لطف یہ کہ جس موضوع پر لکھیں گے، اپنی انفرادیت کو قائم رکھتے ہوئے طرز تحریر بھی ایسا ہی رکھیں گے جو موضوع سے مناسبت رکھتا ہو۔ ایک ہی قلم ہے جس نے ''تاریخ اخلاق یورپ'' بھی لکھی اور ''فلسفۂ جذبات'' بھی، جس نے ''تصوف اسلام'' بھی لکھی اور ''فلسفۂ اجتماع'' بھی، جس نے ''مثنوی بحرالمحبت'' (مصحفی) بھی مرتب و مہذب کی اور ''مکالمات برکلے'' بھی، جس نے ''سفرنامۂ حجاز''(۱) بھی لکھا اور جو ''سچی باتیں'' بھی لکھتا ہے۔ ان میں ہر ایک میں انفرادیت پوری شان سے قائم ہے۔ طرز تحریر کہیں معلم کا ہے، کہیں مترجم کا، کہیں فلسفی کا، کہیں انشاپرداز کا، کہیں ادیب کا۔ ''تاریخ اخلاق یورپ'' شستہ اور رواں ترجمہ ہے۔ ''فلسفۂ جذبات'' اور ''فلسفۂ اجتماع'' کا انداز تحریر باوقار اور سنجیدہ ہے ''تصوف اسلام'' اور ''فیہ مافیہ'' میں تصوف کی متانت غالب ہے۔ ''سفرنامہ حجاز'' میں قلم ایک ایسے مصور کا موقلم بن جاتا ہے، جو دل کے جذبات کو، تصور کی نقش آرائیوں کو عقیدت و احترام کے تاثرات کو محسوس اور مرئی صورت میں دکھا سکتا ہے۔ ہر مصنف کو اپنے قلم پر یہ قدرت نہیں ہوتی۔

فلاسفہ کی خشک مزاجی، علماء کی تمکنت، اور صوفیہ کی ع
خموشی معنی دارد کہ در گفتن نمی آید!

---

(۱) کتاب کا نام ''سفر حجاز'' ہے۔ شایع کردہ صدق فاؤنڈیشن، لکھنؤ

مشہور ہے۔ ہمارے مولانا ان تینوں نعمتوں سے مالا مال ہیں۔ وہ فلسفی بھی ہیں، عالم بھی ہیں اور صوفی بھی۔ ان میں فلسفی کا وقار، عالم کا جلال، صوفی کا سکوت، سب کچھ ہے، لیکن حد کے اندر۔ ان سے آپ گفتگو کیجیے، ان کی مجلس میں بیٹھیے، کسی طرح ان سے قرب کا شرف حاصل کر لیجیے، پھر آپ دیکھیں گے یہ ملک کا بہت بڑا فلسفی کتنا شگفتہ مزاج ہے، یہ قرآن کا مترجم اور مفسر کتنا بذلہ سنج ہے، یہ اسرار تصوف کا رمز آشنا، اپنی گفتگو میں شوخی کی چاشنی، طنز کے تیر، رعایت لفظی کی صنعت، غرض کیا کچھ نہیں رکھتا؟ پھر موقع موقع سے اساتذہ کے اشعار، ہر رنگ شاعری کے اداشناس، مثنوی مولانا روم سے لے کر اقبال کے ارمغان حجاز تک، اور میرؔ سے لے کر مثنوی زہر عشق تک، حالیؔ سے لے کر اکبرؔ تک، امانت سے لے کر داغؔ تک ہر استاد کے اشعار یاد۔ (دید و شنید، ص: ۱۱۰، ۱۱۱)

سرکردہ اسلامی مؤرخ وادیب مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی (متوفی ۱۹۷۴ء) سابق ناظم دارالمصنفین و مدیر ماہ نامہ معارف اعظم گڑھ اپنے مضمون ''مولانا کے دوادبی شاہ کار'' میں مولانا دریابادی کی ادبی حیثیت کا ان الفاظ میں اعتراف کرتے ہیں:

''مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کی قلمی فتوحات کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔ فلسفہ و معقولات سے لے کر مذہب و تصوف اور ادب تک مختلف اصناف میں ان کے بلند پایہ مضامین اور مختلف تصانیف موجود ہیں، لیکن وہ اصلاً ادیب ہیں اور ان میں ادب وانشا کا ذوق اتنا رچا اور بسا ہوا ہے کہ ان کا امتیازی وصف بن گیا ہے جس سے ان کی مذہبی اور فلسفیانہ تصانیف بھی خالی نہیں۔ زبان وادب کے ہر پہلو پر ان کو حکم رانی بلکہ صاحبقرانی حاصل ہے اور یہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے پرانے کلاسیکی ادب میں جو خصوصیات الگ الگ پائی جاتی تھیں، وہ مولانا میں یک جا نظر آتی ہیں۔ سنجیدہ علمی ادب، لطف زبان، روزمرہ، طنز وظرافت اور ضلع جگت سب پر ان کے قلم کی حکم رانی یکساں ہے۔ اس لحاظ سے وہ اس دور کے سب سے بڑے ادیب ہیں''۔ (ملاحظہ ہو، ص: ۱۳۳، ماہ نامہ فروغ اردو لکھنؤ

مولانا عبدالماجد دریابادی نمبر۔ اگست تا اکتوبر ۱۹۷۷ء)

نام ور ناقد و ادیب پروفیسر احتشام حسین (متوفی ۱۹۷۲ء) سابق صدر شعبہ اردو، الٰہ آباد یونی ورسٹی کی تنقیدی رائے ملاحظہ ہو:

''اردو میں شاذ و نادر ہی ایسے ادیب ہوں گے جن کے یہاں قرآن و حدیث، تصوف و اخلاق، فلسفہ و نفسیات، سوانح و سیرت، سفرنامہ اور ڈائری، سیاسی موضوعات اور سماجی مسائل، شاعری اور تخلیقی نثر، افراد اور تحریکات کے متعلق بے تکلفی اور ادبی لطافت کے ساتھ اظہار خیال میں تازگی، لطف زبان، نشتریت اور بلاغت بھی ہو۔ یہ ساری خوبیاں مولانا عبدالماجد دریابادی کی تحریروں میں پائی جاتی ہیں.....

مختصر یہ کہ مولانا عبدالماجد دریابادی کو جو تنقیدی نظر ریاضت سے ہاتھ آئی ہے، اس میں مطالعہ، ذہانت، ذوق سلیم، قدرت بیان اور صحیح ادبی مزاج کی آمیزش نے ایسی انفرادی شان پیدا کی ہے جسے تخلیقی تنقید کے دائرے میں رکھا جاسکتا ہے۔ بہت سے دوسرے علمی کاموں سے قطع نظر مولانا دریابادی اپنے ادبی اسلوب کی وجہ سے بھی زندہ رہیں گے۔ (ملاحظہ ہو ص: ۹۷، اور ۱۰۵، حوالہ سابق)

مشہور مورخ، ادیب اور صحافی مولانا غلام رسول مہر لاہوریؒ (متوفی ۱۹۷۲ء) مولانا دریابادی سے اپنی عقیدت و ارادت کا اظہار اور ان کی جلالت علمی کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''مولانا عبدالماجد کی ذات گرامی سے اردو کو اتنا فائدہ پہنچا کہ کہا جاسکتا ہے کوئی بڑی جماعت بھی اس زبان کا دامن گراں بہا جواہر پاروں سے اس پیمانے پر شاید ہی بھر سکتی جس پیمانے پر مولانا عبدالماجد نے بھرا۔

......مولانا عبدالماجد بھی ماشاء اللہ ایسے ہی خواص میں سے ہیں جن کے سر پر فضل باری تعالیٰ برابر سایہ فگن رہا اور وہ اسی منزل پر پہنچ کر رکے، جہاں مشیت کو ان سے

کام لینا تھا''۔ (ملاحظہ ہو: ص:۴۴ حوالہ سابق)

معروف ادیب وصحافی ملا واحدی دہلوی (متوفی ۱۹۷۶ء) سابق مدیر ماہ نامہ نظام المشائخ، کراچی کے تاثرات:

''حضرت مولانا عبدالماجد صحابۂ کرامؓ کے قدم بہ قدم ہیں۔ انہیں دیکھ کر حضرت اویس قرنیؒ کی صورت دکھائی دینے لگتی ہے۔ ان کا اللہ تعالیٰ پر بھروسہ اور توکل اور نڈرپن اس زمانے میں اپنی آپ مثال ہے۔ جیسی کایا اللہ نے مسٹر عبدالماجد کی پلٹی ہے، ایسی اللہ تعالیٰ ہر مسٹر کی پلٹے''۔ (ص:۴۲ حوالہ مذکور)

بے لاگ مبصر، مشہور صحافی اور ادیب ماہر القادری (متوفی ۱۹۷۸ء) سابق مدیر ماہ نامہ فاران کراچی کا اعتراف:

''علم وادب میں مولانا موصوف کی متعدد حیثیتیں ہیں۔ وہ فلسفی ہیں، معلم اخلاق ہیں، مترجم ہیں، مصنف ہیں، تنقید نگار ہیں، مفسر اور مبلغ ہیں اور اپنے دور کے سب سے بڑے ''طناز'' ہیں۔

مولانا عبدالماجد دریابادی صاحب طرز ادیب ہیں، ان کی تحریریں انشا پردازی سکھاتی ہیں۔ ''ادب عالیہ'' کی تعریف ان کی تحریروں پر صادق آتی ہے۔ زبان، ادب اور اخلاق، غرض ہر اعتبار سے وہ مصلح انشا پرداز اور معمار ادب ہیں۔

میں اس کا کھلے دل سے اعتراف کرتا ہوں کہ مولانا عبدالماجد دریابادی مدظلہ کی کتابوں اور تحریروں سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے اور ان کی خوشہ چینی کی ہے''۔ (ص:۱۷۷، ۱۸۰ حوالہ سابق)

معروف مزاح نگار احمد جمال پاشا (متوفی ۱۹۸۷ء) سابق نائب مدیر روز نامہ قومی آواز لکھنؤ مولانا کی انشا اور اسلوب کے سلسلے میں یوں رطب اللسان ہیں:

''مولانا عبدالماجد دریابادی کی اردوئے معلیٰ کا شمار ہمارے بیش قیمت کلاسیکی

سرمایے میں ہے، جو کم یاب بھی ہے اور نایاب بھی۔ کم یاب اس اعتبار سے کہ ہمارے نثری سرمایے کی اساس جن صاحب طرز انشا پردازوں پر ہے، ان کی تعداد ان گنت اہل قلم میں مانی گئی ہے اور تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے۔ رجب علی بیگ سرور، سر سید احمد خاں، مولوی محمد حسین آزاد، مولانا الطاف حسین حالی، مولانا شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، مہدی افادی، مولانا ابوالکلام آزاد، رشید احمد صدیقی، سید احتشام حسین، آل احمد سرور، ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر خورشید السلام اور انتظار حسین تک ہماری اعلیٰ ترین نثری روایت کا جز مولانا شبلی نعمانی سے انتظار حسین تک مولانا عبدالماجد دریابادی نظر آتے ہیں۔ بقیہ اہم نثر نگاروں کو اس فہرست میں اس لیے شامل نہیں کیا گیا ہے کہ وہ اہم ادبی نثری ستونوں میں سے کسی نہ کسی کے سائے تلے نظر آتے ہیں یا اپنی راہ الگ نہیں بنا پاتے ہیں''۔ (ص:۱۵۹ حوالہ سابق)

پاشا مزید لکھتے ہیں:

''صاحب ''صدق'' کا نثری اسلوب موضوع کے عین مطابق ہوتا ہے۔ اپنی مذہبی، دینی تحریروں اور تفسیر القرآن میں ان کا انداز عالمانہ، وقیع اور پرشکوہ ہوتا ہے، لیکن سادگی اور سلاست کے ساتھ۔ عالمانہ، فلسفیانہ اور تحقیقی مضامین میں وہ ایک عالم، ایک فلسفی یا ایک محقق کی شان تصنیف وہ برقرار رکھتے ہیں۔ اپنی ادبی اور صحافتی تحریروں میں وہ سادگی اور سلاست سے کام لیتے ہیں۔ ان کے نپے تلے، بجے چھوٹے چھوٹے جملے، برجستہ فقرے، محاورے، اشعار اور مصرعے، تراکیب، بولتے ہوئے رواں دواں الفاظ۔ پھر الفاظ بھی کیسے، کہ جو لفظ جہاں رکھ دیا، ہٹائے نہیں ہٹ سکتا۔ انگشتری میں نگینے کی طرح اپنی جگہ چمکتا ہے۔ ان کی نثر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ عبارت چست اور متحرک ہوتی ہے۔ جامد اور بے جان نثر، ڈھیلی ڈھالی اور پھیکی تحریر کا اس بستان ادب میں گزر نہیں۔ یہاں شوخی و تازگی ہے، تراوٹ اور جدت ہے۔ ندرت اور ایجاز ہے، طباعی ہے، حکیمانہ اپج ہے۔ سرخی ایسی جمائی جاتی ہے کہ طبیعت پھڑک اٹھے، چٹکی ایسی

ہوتی ہے کہ بے اختیار تڑپنے والے کے منھ سے واہ! واہ! سبحان اللہ! نکل جائے''۔ (حوالہ سابق، ص:۱۶۰)

سرکردہ بے باک صحافی جمیل مہدی (متوفی ۱۹۸۸ء) سابق ایڈیٹر روزنامہ عزائم لکھنؤ کا خراج تحسین:

''مولانا عبدالماجد دریابادی اگر ہندوستان کے بجائے کہیں اور پیدا ہوتے تو ان کا نام ابن جوزی ہوتا، انگلینڈ میں پیدا ہوتے تو کانن ڈائل اور ہندوؤں میں پیدا ہوتے تو وویکانند ہو جاتے۔ ابتدا سے لے کر ان کی زندگی خط مستقیم کے ذریعے ناپی نہیں جاسکتی۔ اس میں کتنے ہی موڑ ہیں، کتنے ہی پیچ وخم۔ آرتھر کانن ڈائل شرلاک ہومز کا فرضی کردار تخلیق کرنے کی قابلیت رکھتا تھا لیکن مولانا عبدالماجد نے اخلاق کا ایک مجسمہ تراش کر زندگی کے ہر ایک کنارے اور گوشے پر ایستادہ کر دیا ہے..... ان کی زندگی ایک متشکک فلسفی، ایک صاحب طرز ادیب، ایک عظیم صحافی، ایک بلند پایہ مفسر، ایک خوش عقیدہ اور باصفا مرید، ایک شفیق وبزرگ مرشد اور ایک صاحب فہم وفراست مبلغ کی زندگی ہے۔

وہ عبقریوں کی اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو تین تین چار چار مکمل زندگیوں کا بوجھ اٹھانے کی طاقت رکھتی تھی۔ ان کے سلسلۂ ارشاد کے ہی دو بزرگوں، مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا حسین احمد مدنی کی زندگی اور شخصیت میں بہ یک وقت کئی مکمل زندگیوں اور شخصیتوں کی موجوگی واضح طور پر دکھائی دے جاتی تھی۔ مولانا اشرف علی تھانوی ایک مرجع خلائق پیر، ایک عظیم دینی مصلح اور ایک بے مثال دینی مصنف کی تین مکمل شخصیتوں کے حامل تھے۔ مولانا حسین احمد مدنی، ایک مدرس، ایک مرشد اور ایک سیاسی رہ نما کی تین مکمل شخصیتوں کو عمر بھر اپنے اندر سمیٹے رہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی اگر ایک مصنف، ایک صحافی اور ایک مفسر کی مکمل زندگیوں کے حامل نظر آئیں تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں''۔ (ص:۶۵، ۶۶ حوالہ مذکور)

معروف محقق اور ادیب ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی (متوفی ۲۰۰۰ء) سابق صدر شعبہ اردو لکھنؤ یونی ورسٹی مولانا دریابادیؒ کی علمی و ادبی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''مولانا کی تصانیف پر ایک سرسری نظر ڈالنے ہی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ مولانا کی شیفتگی ایک طرف تو مذہبیات سے ہے اور دوسری طرف ادبیات سے۔ مذہبی خدمات میں سب سے افضل آپ کا وہ ترجمہ و تفسیر قرآن پاک ہے جو تفسیر ماجدی کے نام سے شایع ہو رہا ہے۔ اس کے دوسرے ایڈیشن کی دو جلدیں (دسویں پارے تک) ابھی تک منظر عام پر آچکی ہیں (۱) قرآن پاک کے ترجمے بہت سے حضرات نے کیے لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ اسی وقت قابل قدر ہو سکتا ہے، جب مترجم دونوں زبانوں کا ماہر اور ان کے صرفی و نحوی نکات پر اسے عبور کامل ہو۔ اردو ایک کم عمر زبان ہے، ہر پچیس تیس سال کے بعد اس کے محاورات و روزمرہ میں موجودہ روز افزوں علمی و ادبی ترقیوں کے باعث نمایاں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ مولانا موصوف اردو زبان (خصوصاً مستند لکھنوی دبستان کی) کے ماہر کامل ہیں اور اس کی نوک پلک سے بخوبی واقف ہیں۔ اس لیے باوصف اس کے کہ قرآن پاک کے کئی اچھے اچھے ترجمے ماضی قریب و بعید میں ہو چکے ہیں، لیکن تفسیر ماجدی زبان اور بیان کے اعتبار سے ان تمام کاوشوں کی فی زمانا آخری ترقی یافتہ شکل کہی جا سکتی ہے''۔

ڈاکٹر ہاشمی مزید تحریر کرتے ہیں:

''ادبیات میں مولانا کی دل چسپی تنقید سے زیادہ رہی ہے، ویسے جوانی میں کچھ شعر و شاعری بھی کی ہے۔ ایک ڈراما بھی لکھا ہے، لیکن جلد ہی تخلیقات سے انتقادیات کی طرف آگئے اور تنقید میں بھی بیشتر آپ کا انداز تقریظی یا تعریضی ہوتا ہے اور اس میں تفصیل کے بجائے کوشش اس کی رہتی ہے کہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مفاہیم آجائیں۔

---

(۱) یہ تفسیر سات جلدوں میں مکمل ہوئی ہے۔ شایع کردہ: مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔

بعض اوقات بعض ادبی کارناموں کی شوخ اور رنگین عبارتوں کی بھی اس انداز میں تعریف کی ہے کہ خود مولانا کے اندر رند اسیر، اپنی وہ زنجیریں توڑتا نظر آنے لگتا ہے جو محتسب مذہبی نے اس کے گرد لپیٹ رکھی ہیں''۔ (ملاحظہ ہو، ص: ۱۰۴ حوالہ سابق)

باب دوم

تفسیر ماجدی (انگریزی) ملخص جدید ایڈیشن

مختصر تعارف وتبصرہ

قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے جو رحمۃ للعالمین، خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ کے فرشتے حضرت جبرئیل علیہ السلام کے توسط سے ۲۳ برس کی مدت میں نازل ہوئی۔ اس میں ایک سو چودہ سورتیں، ساڑھے چھ ہزار کے قریب آیتیں، تیس پارے اور پانچ سو چالیس رکوع ہیں۔

''قرآن'' کے معنی ہیں بار بار پڑھی جانے والی کتاب۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے بقول ''سب سے زیادہ پڑھی جانے والی موجود کتاب ہے''۔(Most Widely Read Book in Existence) (جلد ۱۵،ص ۸۹۸، گیارہواں ایڈیشن)۔ قرآن کریم اپنا سب سے پہلا وصف یہ بتاتا ہے کہ وہ ایک منضبط اور حیطۂ تحریر میں لائی ہوئی وحی الٰہی ہے، محض زبانی یادداشتوں کا مجموعہ نہیں ہے۔

قرآن مجید قیامت تک دنیا کے تمام آنے والے انسانوں کے لیے زندگی گزارنے کا ہدایت نامہ ہے۔ اس کی تعلیمات کے مطابق جو زندگی ہوگی وہی اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ ہوگی اور جو اس کے مخالف ہوگی وہ خدا تعالیٰ کے نزدیک ناپسند ہوگی۔ قرآن کریم اسلامی شریعت کا اولین اور بنیادی ماخذ ہے اس لیے ابتدا ہی سے یہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کی دل چسپی اور توجہ کا مرکز رہا ہے۔ مسلمان اہل قلم کتاب الٰہی کی کسی بھی خدمت کو اپنے لیے

سعادت سمجھتے ہیں اور اس کو اپنے لیے ذخیرۂ آخرت بناتے ہیں۔ غیر مسلم فضلاء اس کے مطالعے اور اس پر تحقیق کو اہم علمی سرگرمی کا درجہ دیتے ہیں۔ قرآن مجید سے اسی گہرے تعلق اور شغف کا نتیجہ ہے کہ آج الحمد للہ دنیا کی تمام معلوم و معروف زبانوں میں اس کے ترجمے ہو چکے ہیں اور ان شاء اللہ اس کا سلسلہ تا قیام قیامت چلتا رہے گا۔

مایہ ناز مفسر قرآن اور ممتاز اردو ادیب و صحافی مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے بہ توفیق الٰہی اولاً انگریزی زبان میں قرآن کریم کا ترجمہ کیا اور اس کی تفسیر لکھی۔ اس کے کئی برس بعد اردو زبان میں اس کا ترجمہ کیا اور تفسیر لکھی۔ مولانا دریابادیؒ کی ذات والا صفات گوناگوں خصوصیات کی جامع تھی۔ وہ جہاں ایک طرف فلسفی، ماہر نفسیات، اردو کے صاحب طرز ادیب اور بے مثال صحافی تھے وہیں دوسری طرف وہ کام یاب مترجم و شارح اور امتیازی شان رکھنے والے عالم دین بھی تھے۔

مذہبی خدمات میں مفسر دریابادی کا روشن ترین کارنامہ تفسیر ماجدی (انگریزی، اردو) ہے۔ یہ تفسیریں ان کی دقت نظری، وسعت مطالعہ، صحیح قرآن فہمی، تدبر فی الآیات، تمسک بالسنہ، جمہور امت کے عقائد کی ترجمانی، اسلام سے ان کی والہانہ شیفتگی اور اس کی حقانیت پر کامل اعتماد و یقین، ان کے دل نشیں اسلوب، منطقی طرز استدلال، حکیمانہ بصیرت اور خطیبانہ حرارت کا روشن نمونہ ہیں۔

مفسر دریابادیؒ کے انگریزی ترجمے اور تفسیر کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں:

☆ ترجمہ زبان اور انداز بیان کے لحاظ سے نہایت عمدہ۔

☆ تفسیر میں جمہور کے عقائد کی کامل ترجمانی۔

☆ آیتوں کی ترجمانی اور تفسیر میں غیر معذرت خواہانہ انداز۔

☆ اصل اور بنیادی ماٰخذ سے براہ راست استفادہ۔

☆ انگریزی پر حاکمانہ عبور کے ساتھ ساتھ اسلامی علوم اور عربی زبان و ادب سے بھی

پوری واقفیت۔

☆ مذاہب عالم خصوصاً یہودیت اور مسیحیت پر گہری نظر، ان کا تقابلی مطالعہ اور ان مذاہب کے علماء کے اہم علمی کارناموں سے باخبری۔

☆ شرح وترجمانی میں ادعائیت اور تفسیر بالرائے سے کامل اجتناب۔

☆ ترجمے وتفسیر کے مطلوبہ علوم سے اچھی طرح واقفیت۔

☆ حوالوں، مصادر اور مراجع کا مکمل اہتمام۔

☆ قدیم مآخذ تک براہ راست رسائی اور جدید معلومات سے قابلِ رشک آگاہی۔

۱۹۳۳ء کے آخر میں مفسر دریابادیؒ نے اپنے مرشد حکیم الامت اشرف العلماء حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ (متوفی ۱۹۴۳ء) کی نگرانی میں قرآن عظیم کے انگریزی ترجمے اور تفسیر کا آغاز کیا۔ اس ضمن میں مفسر دریابادی نے مفسر تھانویؒ کو یہ مکتوب لکھ کر ان سے رہ نمائی طلب کی:

''م۔ (علامت مولانا عبدالماجد دریابادی کے سوال کی ہے) ایک نہایت درجہ اہم معاملے میں آپ کی توجہ، ہدایت، دعا، ارشاد سب کا محتاج ہوں۔ خیال دو چار ہفتے سے انگریزی ترجمۂ قرآن مجید کا برابر مسلط ہوتا جارہا ہے۔

ا۔ (علامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے جواب کی ہے) میرے ذہن میں تو اس کی ضرورت سال ہا سال سے ہے، مگر دو چیزوں کی اس میں ضرورت ہے۔ کام کرنے والے آدمی اور کافی رقم ضبط کے اور طباعت کے لیے بھی، اس لیے دل کی دل میں رہ جاتی تھی۔ کیا عجب ہے اب اس کا وقت آگیا ہو۔

م۔ اب تک اہل سنت کا کوئی ترجمہ انگریزی میں نہیں یا تو انگریز مسیحیوں کے ہیں، جنہوں نے جی بھر کر چوپٹ کیا ہے۔

ا۔ بے شک۔

م۔اور یا پھر لاہوری مرزائی جماعت کا ہے جو انگریزوں کے ترجموں سے تو بے شک بہت غنیمت ہے، تاہم اپنے مخصوص عقائد کا اتباع اس میں بھی ہے۔ صرف ایک ترجمہ اور ہے جو مرزا حیرت دہلوی کی جانب منسوب ہے، خدا معلوم کس کا کیا ہوا ہے؟ ابھی حال میں اسے خرید کر پڑھا۔ زبان کی لغزشوں کے علاوہ ادائے مفہوم میں بھی موٹی موٹی غلطیاں ہیں۔ میری انگریزی استعداد مبتدیوں جیسی اور عربی استعداد مبتدیوں سے کم تر۔ اس لیے بار بار سوچتا ہوں، ہمت باندھتا ہوں، پھر ہچکچا کر رہ جاتا ہوں۔ مولانا (مراد غالباً شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ ہیں، جن کے دست حق پرست پر مولانا دریابادی نے مولانا تھانویؒ کے مواجہے میں بیعت کی تھی۔ ملاحظہ ہو ص:۲۲، باب ۵، حکیم الامت نقوش وتاثرات) نے بھی ایک بار دیوبند میں فرمایا تھا، اس وقت صاف میں نے اپنی نااہلی کا عذر کر دیا تھا۔ وہ احساس تو اب بھی اپنی جگہ پر ہے، لیکن دوسری طرف ضرورت کا خیال دباتا چلا آتا ہے۔ بارہا اس درمیان میں توفیق حق وشرح صدر کی دعائیں، نمازوں کے بعد کر چکا ہوں۔

ا۔ اللہ کا نام لے کر شروع تو کر دیجیے۔ اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ سامان بھی ہو جائے گا۔ اصل ضرورت ذمہ داری کی ہے تو آپ سے اچھا اور کون ملے گا۔ ایک بڑی بات یہ ہے کہ ہم سب کو اطمینان رہے گا اور یہ بھی اطمینان رہے گا کہ آپ ہم لوگوں سے مشورہ لیتے رہیں گے۔ گویا ہم ہی لوگ کام کرنے والے ہوں گے''۔ (ملاحظہ ہو: ص:۳۱۷، ۳۱۸، باب ۵۹، حکیم الامت نقوش وتاثرات)

دوسرے خط میں مفسر دریابادیؒ اشرف المفسرین کو تحریر کرتے ہیں:

''انگریزی ترجمہ قرآن سے متعلق جناب والا کی ہمت افزائی نے دل کو بڑی تقویت پہنچا دی۔ ان شاء اللہ رمضان سے کام شروع کر دوں گا''۔

مرشد تھانویؒ نے جواب میں تحریر فرمایا:

''اس خبر سے میری تو رمضان ہی میں عید ہو گئی''۔

مسترشد دریابادیؒ نے اسی خط میں لکھا:

''دوران ترجمہ میں حضرات علماء سے ہدایات حاصل کرتے رہنا تو شروع ہی سے ذہن میں تھا۔ جناب والا (مرشد تھانویؒ) حضرت مولانا (حسین احمد مدنیؒ) کے علاوہ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ، یہ اصحاب اربعہ تو پیش نظر ہیں ہی۔ ان کے علاوہ اور جو نام ارشاد ہوں''۔

مرشدؒ نے تحریر فرمایا:

''اس وقت تو کوئی نام ذہن میں نہیں۔ اگر یاد آ گیا تو عرض کردوں گا، مگر میرا مذاق تو یہ ہے ع

شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیرہا''

(حوالہ سابق، ص: ۳۲۰، ۳۲۱)

مفسر دریابادی اور ان کی انگریزی تفسیر کے متعلق عربی اور اردو کے ممتاز ادیب، ماہر لسانیات مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی (متوفی ۲۰۰٦ء) سابق پروفیسر جامعہ ام القریٰ مکہ مکرمہ اور سابق معتمد تعلیم ندوۃ العلماء لکھنؤ اپنے ایک تجزیاتی و تقابلی مضمون بہ عنوان ''تفسیر ماجدی (انگریزی) کا ایک مطالعہ'' میں تحریر کرتے ہیں:

''مولانا عبدالماجد دریابادی پہلے مسلمان ہیں جنھوں نے انگریزی میں قرآن کریم کا صرف ترجمہ ہی نہیں کیا ہے بلکہ مکمل تفسیر بھی لکھی ہے۔ ان سے پہلے قادیانی فرقے کی لاہوری شاخ کے مفسر محمد علی لاہوری صاحب نے ترجمے کے ساتھ تشریحی نوٹ دیے تھے، جن کو مختصر تفسیر کہا جا سکتا ہے، لیکن وہ جمہور اہل سنت و جماعت کے عقائد کے خلاف ہے۔ اس میں معجزات انبیاء علیہم السلام کا کھلا انکار ہے۔ حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ کے معجزات کی تاویلیں ہیں۔ جنگ بدر کے موقع پر نزول ملائکہ کو ایک مجازی تعبیر بتایا گیا ہے، جس سے مراد مسلمانوں کے مورل (Moral) کو بڑھانا تھا۔ شیطان، جن، ملائکہ، یہ سب

ان کے نزدیک مجازی تعبیریں ہیں۔ مستشرقین میں سیل اور راڈویل نے بھی فٹ نوٹ دیے ہیں، مگر وہ ان کے مخصوص عقائد کے نمایندے ہیں۔ قدیم مفسرین نے اگر کوئی شاذ قول نقل کیا ہے، اس کو اصل بنا کر عمارت کھڑی ہے اور حوالہ بیضاوی کا دے دیا۔

مسلم حلقوں میں عبداللہ یوسف علی اور محمد مار ماڈیوک پکتھال کے ترجمے مقبول تھے اور آج بھی وہی سب سے زیادہ چھپتے اور پڑھے جاتے ہیں اور حق یہ ہے کہ وہ اس لائق بھی ہیں۔ ان میں عقائد کے خلاف کوئی بات نہیں ہے، مگر وہ تفسیریں نہیں ہیں، معنی خیز آزاد ترجمے ہیں، اور کسی ایک آدھ لفظ کی تشریح بھی فٹ نوٹ پر ملتی ہے۔ تفسیر ماجدی میں آیات کریمہ کا جو ترجمہ ہے وہ کئی لحاظ سے منفرد ہے''۔

مولانا ندوی نے اسی مضمون میں بالاستیعاب تفسیر ماجدی کی خصوصیات کا تذکرہ کیا ہے۔ مذکورہ خصوصیات ذیل میں مختصراً درج ہیں:

ا۔ قرآن کریم کے الفاظ کے معنی متعین کرنے میں مفسر دریابادیؒ نے براہ راست عربی مآخذ سے استفادہ کیا ہے۔ وہ لسان العرب، مفردات راغب اصفہانی اور ابن قتیبہ کی غریب القرآن اور صحیح بخاری کی کتاب التفسیر اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مستفاد معانی کو ترجیح دیتے ہیں، بلاشبہ انہوں نے Lane کی Arabic-English Lexican سے فائدہ اٹھایا ہے مگر صرف اس پر اعتماد نہیں کیا ہے۔ جب کہ دوسرے تمام مترجمین قرآن کا اول و آخر مرجع صرف Lane ہے۔

۲۔ صرفی و نحوی تحقیق کے لیے عام انگریزی مترجمین نے اپنے سامنے G.W. Thatcher کی گرامر رکھی ہے۔ برخلاف مولانا دریابادیؒ کے، انہوں نے بیضاوی اور کشاف کی تحقیقات پر اعتماد کیا ہے............ تفسیر ماجدی نے متقدمین سلف کا اتباع کرتے ہوئے براہ راست اصل ماخذ سے کام لیا ہے۔ ثانوی درجے کے ماخذ Second Hand Sources سے انکار نہیں لیکن ان کی تصدیق اولین ماخذ سے

انہوں نے کرلی ہے۔

۳۔ آیات کی تشریح میں ان کے نزدیک قدیم مراجع میں زیادہ پسندیدہ تفسیر قرطبی ہے، یوں روح المعانی، مدارک التنزیل، ابن کثیر سے بھی استفادہ کیا ہے۔ مرشد تھانویؒ کی بیان القرآن کا جس طرح اردو تفسیر میں حوالہ ہے، اسی طرح انگریزی میں بھی بہ کثرت حوالہ موجود ہے اوراس بنا پران کی تفسیر میں اہل سنت والجماعت کے عقائد سے سرموفرق نہیں ہے۔

۴۔ انگریزی میں ترجمہ وتفسیر کرنے والوں کی ایک عمومی کم زوری یہ رہی ہے کہ ان کے سامنے مغرب کے عقلیت پرست قاری ہوتے ہیں۔ اس لیے جنت، دوزخ، حوروغلمان، نہرلبن وعسل کا ذکر کرتے وقت ان پر مرعوبیت چھاجاتی ہے۔ ان کو مجازی تفسیر کہہ کر ٹال دیتے ہیں یا سرسید، مفتی محمد عبدہ اور موجودہ مفسرین محمد اسد کی طرح اپنے دین سے شرم سار نظر آتے ہیں، لیکن مولانا دریابادی ایک مومن صادق کی طرح بلکہ امام غزالیؒ کے الفاظ میں "ایمان عجائز الحی" (محلے کی بڑی بوڑھیوں کا جیسا ایمان) پر قائم رہنے والے مسلمان کی طرح سر اٹھا کر پورے وثوق واعتماد کے ساتھ ان حقائق کو بیان کرتے ہیں اوران پر اپنے ایمان وایقان کا اظہار بھی فرماتے ہیں۔

۵۔ اس تفسیر کا سب سے بڑا امتیازی وصف جس میں عربی، انگریزی، اردو یا کسی زبان کی بھی کوئی تفسیر مقابلہ نہیں کرسکتی، وہ یہ ہے کہ اس میں تورات وانجیل کا تقابلی مطالعہ التزام کے ساتھ کیا گیا ہے.....

اس سلسلے میں مولانا دریابادیؒ کا مطالعہ ان کے تمام معاصروقدیم مفسروں سے زیادہ وسیع ہے۔ انہوں نے ایک ایک آیت کا مقابل مفہوم اناجیل سے تلاش کرکے ان کومکمل حوالے کے ساتھ اپنی تفسیر میں جمع کردیا ہے اور پھر فیصلہ قاری کی بصیرت پر چھوڑ دیا ہے۔ مذاہب کا تقابلی مطالعہ آج کل یورپ کی یونی ورسٹیز میں عام ہے۔ برطانیہ

میں برمنگھم یونی ورسٹی اور امریکہ میں ہارورڈ یونی ورسٹی میں زور وشور سے اس پر کام ہو رہا ہے اور اعلیٰ ڈگریاں دی جا رہی ہیں۔ وہاں جانے والے مسلمان طلبہ کے ہاتھ میں اگر یہ تفسیر ماجدی ہو تو ایک تلوار اور ڈھال کا کام دے گی۔ ادیان کے تقابلی مطالعے پر اس تفسیر سے بہتر کوئی کام مسلمانوں کی طرف سے انگریزی میں اب تک نہیں ہوا ہے۔ یہ بات پورے وثوق اور اعتماد کے ساتھ کہی جا سکتی ہے اور اس لحاظ سے مستشرقین کی تمام تخریبی کوششوں کا یہ ایجابی جواب ہے اور مغرب سے مرعوب معذرتانہ انداز اختیار کرنے والوں کے لیے ایک لمحۂ فکریہ بھی ہے۔

تفسیر ماجدی میں تاریخی اور جغرافیائی معلومات جو عام طور پر تفسیر سے علاحدہ تحقیقات پر مشتمل ہیں اور جن کے لیے ارض القرآن جیسی کتابیں لکھی گئی ہیں، سب یک جا مل جاتی ہیں۔ غرض یہ تفسیر ایک انگریزی خواں قاری کے لیے قرآنی انسائیکلوپیڈیا کا کام دے سکتی ہے''۔ (ملاحظہ ہو ہفتہ وار صدق جدید لکھنؤ، ۲۰ر فروری اور ۶ر مارچ ۱۹۸۱ء)

تفسیر ماجدی انگریزی کے بارے میں انگریزی زبان وادب کے مستند عالم ڈاکٹر عبدالرحیم قدوائی پروفیسر شعبہ انگریزی علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، ڈائرکٹر یو.جی.سی. اکیڈمک اسٹاف کالج مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ جنھوں نے بہ توفیق الٰہی خود بھی قرآن کریم کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا ہے(۱) اپنے مضمون ''مولانا عبدالماجد دریابادی بہ حیثیت انگریزی مترجم قرآن پاک'' میں رقم طراز ہیں:

''اللہ تبارک وتعالیٰ نے اودھ، شمالی ہند کے ایک علمی خانوادے کے چشم وچراغ عبدالماجد دریابادی (پیدائش ۱۸۹۲ء وفات ۱۹۷۷ء) کو یہ سعادت بخشی کہ وہ اہل سنت والجماعت کے عقائد کے آئینہ دار انگریزی ترجمۂ قرآن کو قارئین کے سامنے پیش کریں۔ ان

---

(۱) پروفیسر قدوائی کا یہ ترجمہ بغیر قرآنی متن کے "What is in the Quran? Message of the Quran in Simple English" کے نام سے وِوابکس (Viva Books) نئی دہلی نے ۲۰۱۳ء میں شایع کیا ہے۔

کے اس ترجمے نے پکتھال کے ناکافی اور عبداللہ یوسف علی کے تسامحات سے پُر کاوشوں کے نقائص کو رفع کیا اور انگریزی خواں طبقے کی دینی ضروریات کو پورا کرنے کا مقدس فریضہ انجام دیا۔ مولانا دریابادی انگریزی زبان، فلسفے، فکر اسلامی اور اپنے عہد کی علمی اور ذہنی تحریکوں سے کماحقہٗ واقف تھے۔ مستشرقین کی تصانیف سے آگاہی اور خود اپنے دور الحاد کی فکری کجیوں نے انہیں اپنے مخاطبین کی ذہنی سطح سے بخوبی روشناس کر دیا تھا۔ لہٰذا انہیں اپنے مقصد میں امتیازی کامیابی حاصل ہوئی اور ان کا انگریزی ترجمۂ قرآن اپنے حکیمانہ حواشی کی مدد سے مغربی تعلیم یافتہ طبقے کے لیے تریاق ثابت ہوا''۔ (ملاحظہ ہو: تفسیر ماجدی نقد ونظر، ص: ۱۷۰)

ڈاکٹر قدوائی مزید تحریر کرتے ہیں:

''علوم جدیدہ بالخصوص عمرانیات، نفسیات، تاریخ مذاہب وتمدن، اثریات، فلسفہ، عربی زبان وادب قرآن کے اعجاز اور بلاغت پر عبور کے باعث مولانا دریابادی کے ہاں بعض ایسے قرآنی نکات کی ایمان افروز اور روح پرور تعبیر وتشریح ملتی ہے جسے دیگر انگریزی مفسرینِ کرام نظر انداز کر گئے ہیں۔ اس ضمن میں چند مثالیں پیش ہیں:

(۱) ''قرآن کریم میں جابجا بنی اسرائیل کو مخاطب کیا گیا ہے اور ان کی فضیلت بھی مذکور ہے (مثلاً سورۃ بقرہ آیت ۴۷) اس مقام پر یہ سوال قدرۃً ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ اس نسل کی افضلیت سارے عالم پر کس معنی میں ارشاد ہو رہی ہے۔ اگر کہیے کہ دولت یا حکومت یا تجارت یا کثرتِ آبادی تو اول تو یہ انعامات خود اس درجے کے نہیں کہ ان کا ذکر اس شان واہتمام سے کیا جائے اور پھر یہ نعمتیں تو بہت سی قوموں کو اپنے اپنے وقت میں نصیب رہ چکی ہیں۔ پھر قوم اسرائیل کی وہ مخصوص فضیلت کیا تھی؟ تاریخ کی زبان سے جواب ایک ہی ملتا ہے کہ وہ دولت یا اللہ کی اعلیٰ ترین نعمت مسلک توحید کی تھی۔ یہ نسل اسرائیل ہی ایک ایسی قوم تھی جو من حیث القوم توحید کی علم بردار رہی اور انبیاء ورسل، جہاں تک کسی نسل کا تعلق ہے، نسل بنی اسرائیل ہی میں مسلسل پیدا ہوتے رہے۔ انبیاء ورسل اور

ان کی تعلیمات کا چرچا صرف بنی اسرائیل میں تھا۔

قوم بنی اسرائیل اور امت موسوی دو بالکل اور قطعاً علاحدہ ہیں اس لیے آیت کی تفسیر میں امت موسوی اور امت محمدیؐ کی فضیلت بہ لحاظ دین وعقیدہ ہے نہ کہ کسی نسلی یا قومی اعتبار سے اور آیت میں ذکر ایک خاص نسل کی افضلیت کا ہے۔ یہ ایک مسلم تاریخی حقیقت ہے کہ جس وقت دنیائے تہذیب طرح طرح کی مشرکانہ وہم پرستیوں میں مبتلا تھی، موحد اعظم ابراہیم علیہ اسلام ہی کی نسل کی ایک شاخ توحید کا علم بلند کیے ہوئے تھی"۔

(۲) مولانا دریابادی نے اپنے انگریزی ترجمہ قرآن میں عیسائیوں کے لیے عام طور سے مستعمل اصطلاح (Christians) کی نہیں بلکہ (Nazarenes) اختیار کی ہے اور اس کے حق میں دلیل یہ پیش کی ہے:

"خوب خیال کرلیا جائے قران یہاں ذکر مسیحیوں کا نہیں نصاریٰ کا کررہا ہے اور قرآن حکیم کا ہر لفظ حکمت سے پرُ ہوتا ہے۔ مسیحی وہ ہیں جو ایمان اناجیل اربعہ پر رکھتے ہیں، مسیح کو خدا کا نبی نہیں، خدا کا بیٹا مانتے ہیں، آخرت میں نجات دینے والا خدا کو نہیں، مسیح ابن اللہ کو یقین کرتے ہیں۔ اس کھلے ہوئے شرک کے قائلوں کا ذکر ہرگز اس مقام پر مقصود نہیں، اس لیے نام بھی جو مشہور اور چلا ہوا تھا، اسے ترک کر کے نصاریٰ لایا گیا۔ نصاریٰ (Nazarenes) حضرت مسیحؑ کے سچے پیرو، توحید کے قائل تھے اور بجائے اناجیل اربعہ کے صرف انجیل متی کو مانتے تھے۔ لیکن جب مشرکانہ عقائد کا زور بندھا اور اصل مسیحیت حلولیت اور تثلیث ہی قرار پاگئی تو قدرۃً نصرانیت کا ستارہ بھی گردش میں آیا اور نصرانی ونصرانیت کے الفاظ بجائے عزت وتکریم کے تحقیر کے موقع اور ذم کے محل میں استعمال ہونے لگے۔ موجودہ مسیحیت سرتا سر پولوسیت ہے اور تمام تر پولوس (Paul) طرسوسی کی تعلیمات پر مبنی ہے۔ یہ حضرت مسیح کے کچھ ہی روز بعد شروع ہوگئی تھی اور نصرانی اس کے بالکل منکر تھے"۔

(۳) حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل کے ذیل میں قرآن کریم میں مذکور ہے:

اور (وہ وقت یاد کرو) جب موسیٰ نے اپنے قوم کے لیے پانی کی دعا مانگی سو ہم نے کہا (اے موسیٰ) اپنا عصا فلاں پتھر پر مارو تو اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے (سورہ بقرہ: ۶۰) مذکورہ بالا آیت قرآنی پر اپنے تشریحی حاشیے میں مولانا دریابادی نے غیر مسلم مغربی ماہرین اثریات اور مورخین ہی کے اقتباسات سے قرآنی بیان کی تاریخیت کو اجاگر کیا ہے۔ اور یہ ثابت کیا ہے کہ قرآن کریم کے معاندین اور منکرین تک بھی قرآن کریم کی تصدیق کرنے کے لیے اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں''۔ (ملاحظہ ہو: تفسیر ماجدی - نقد و نظر، ص: ۱۷۱-۱۷۳)

Quran Hakeem - Translation and Explanation (قرآن حکیم- ترجمہ وتفسیر) کے نام سے یہ تفسیر تاج کمپنی لاہور (پاکستان) سے مکمل طور پر ۱۹۶۱ء میں شایع ہوئی۔ اس کے بعد مولانا دریابادیؒ نے اس میں متعدد ترمیم واضافے کیے۔ یہ اضافہ شدہ ایڈیشن ۱۹۸۱ء میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ (متوفی ۱۹۹۹ء) کے مقدمے اور تعارف کے ساتھ Tafseerul Quran: Translation and Commentary of the Holy Quran کے نام سے ان کے موقر علمی ودعوتی ادارے مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ (Academy of Islamic Research & Publications) سے ۴ جلدوں میں شایع ہوا۔

مفسر دریابادی کی تفسیر کی گوناگوں خصوصیات کے پیش نظر انگلینڈ کے مؤقر علمی ادارے اسلامک فاؤنڈیشن لیسسٹر نے "The Glorious Qur'an" کے نام سے ایک جلد میں ۲۰۰۱ء میں اس کا ملخص ایڈیشن شایع کیا۔ یہ ایڈیشن ہندوستان میں نایاب تھا۔ اس لیے صدق فاؤنڈیشن لکھنؤ نے ناشر مذکور کی اجازت سے ۲۰۰۶ء میں اس کو خوبصورت طباعت اور دیدہ زیب گٹ اپ کے ساتھ شایع کیا ہے۔ رب ماجد سے دعا ہے کہ ہمارے اس عمل کو قبول فرمائے۔ آمین۔

ذکرِ رسولؐ - ایک مطالعہ

خاتم الانبیاء رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک سیرت صدیوں سے علماء ومفکرین کی توجہ کا مرکز رہی ہے۔ اس لیے کہ اللہ رب العزت نے آپ کو تمام انسانوں کے لیے ''اسوۂ حسنہ'' قرار دیا ہے۔ بے شمار اہل قلم نے دنیوی سعادت اور اخروی فوز وفلاح سمجھ کر اپنے ذوق کے مطابق اس مبارک عنوان پر حسین وجمیل نقوش مرتسم کیے ہیں۔

سیرت رسولؐ کے موضوع کی مثال ایک ایسے شاداب اور تر وتازہ گلشن کی ہے جو اپنے پھولوں کی عطر بیزی، نکہت اور رونق کے باعث ہمہ وقت جمال وکمال کا حسین مرقع بنا رہتا ہے۔ اس گلشن کی مشاطگی اور آب یاری کرنے والا ہر فرد اپنے ذوق ومزاج کے مطابق اس میں نئے درختوں کا اضافہ کرتا ہی رہتا ہے۔ یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔ ان شاء اللہ۔

لا یمکن الثناء کما کان حقہ

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ ایسے اہل قلم تھے جنہوں نے بتوفیق الٰہی زندہ معبود کے زندہ رسول، رحمۃ للعالمین سیدنا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم (فداہ ابی وامی) کی زندہ سیرت اور زندہ معجزات کا تذکرہ زندہ اسلوب میں کیا ہے۔

''ذکر رسولؐ'' نامی سیرت کی اس کتاب میں شامل مقالات کا طغرائے امتیاز مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے قلم صدق رقم کا وہ مسحور کن اسلوب ہے جس میں عشق رسولؐ،

جب نبیؐ اور شمعِ رسالت کے پروانوں سے والہانہ عقیدت کے جذبات کے ساتھ ساتھ خطیبانہ حرارت، حکیمانہ بصیرت، منطقی طرزِ استدلال اور تجزیہ نگاری کی ایسی آمیزش نظر آتی ہے جو اس مجموعے کو دیگر کتابوں کی موجودگی میں 'چیزے دیگری'' کا درجہ دلاتی ہے۔ ''نثری نعت'' کے اس البیلے مجموعے کو پڑھتے جایئے اور مولانا دریابادیؒ کے وجد آگیں اسلوب کا لطف اٹھاتے جایئے۔

ذیل میں خامہ صدق نگار کی اس شاہ کار ''نثری نعت'' کے اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

''مردوں کی مسیحائی:

دنیا میں یہ انقلاب روحانی پیدا کر دینا کہ کل تک جو رہزن تھے، وہ آج رہرو ہی نہیں، بلکہ بہترین رہبر بھی ہو جائیں، کل تک جن کی زندگی فسق و فجور کی نذر تھی، آج وہ اتنے بلند و مقدس مرتبے پر پہنچ جائیں کہ صداقت و پاکیزگی کو ان کے انتساب سے شرف ہو جائے، کل تک جو مردہ تھے، وہ آج زندہ ہی نہیں، بلکہ دوسروں کو زندہ کر دینے والے بن جائیں، ایسے آفتاب کا طلوع جو ہر ذرّے کو آفتاب بنا دے، ایسے مسیح کا نزول جو مردے کو مسیح بنا دے ـــــــ اس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں بجز سرورِ عالمؐ کے صحابیوںؓ، بجز محمدؐ کے غلاموں، کے اور کہیں بھی مل سکتی ہے؟

نادانوں کا قول ہے کہ خاتم النبیینؐ نے کوئی معجزہ نہیں دکھایا، حالاں کہ یہ پاک زندگی شروع سے آخر تک خود ایک معجزہ تھی، اور اس کا کوئی جزئیہ ایسا نہ تھا جو اپنے اندر ایک اعجازی رنگ نہ رکھتا ہو!

اس ''زندہ فرقان'' کے ان زندہ معجزوں کے ہوتے ہوئے، کشتیِ نوحؑ، گلزارِ خلیلؑ، عصائے موسیٰؑ، تختِ سلیمانیؑ، حسنِ یوسفؑ، دمِ عیسیٰؑ، کسی محدود، وقتی و مقامی معجزے کی کچھ بھی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی نہ اس وقت راز تھی، نہ آج راز ہے۔ ابولہب وابوجہل اوران کے سارے ہم نشینوں نے اس وقت دیکھا، کہ بدبوداراور پُرعفونت کھاد، گملے میں پڑی اوران کی آنکھوں کے سامنے، شاداب وخوش رنگ مہکتے ہوئے گلاب کے پھول میں تبدیل ہوگئی۔ حق کی قوت، ہرتردید وتغلیط کے خطرے سے بے پرواہے، زندہ معبود کے زندہ رسولؐ کے زندہ معجزہ کا جواب نہ اس وقت بن پڑا، نہ آج حق کے جھٹلانے والوں، محمدؐ کے دشمنوں، اورابولہب وابوجہل کے موجودہ جانشینوں میں سے کسی کے بس کی بات ہے!

اللہ مراتب بلند کرے اکبر الہ آبادی کے، سارے مضامین نعت کا عطر ایک شعر میں کھینچ کے رکھ دیا ہے۔

خود نہ تھے جوراہ پر، اوروں کے ہادی بن گئے
کیا نظر تھی جس نے مردوں کومسیحا کردیا!"

(ملاحظہ ہو:ص ۱۹، ۲۰)

"بلندیٔ ذکر کی بشارت:

ایک طرف ادائے فرض کا احساس دوسری طرف مخالفتوں کا یہ ہجوم بے پایاں! عین اس وقت جب کہ عالم بشریت میں سامانِ تسکین وتشفی ممکن نہ تھا، یہ صدائے غیب کانوں میں آتی ہے کہ اے ہمارے پیارے اورفرماں بردار بندے! گھبرانے اور ہمت چھوڑنے کی کوئی بات نہیں۔

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ. ہم نے تیرے اوپر وہ لطف وکرم کیا ہے جوکبھی کسی بندے پرنہیں کیا تھا۔ موسیٰ کلیم اللہ کوہم سے شرفِ ہم کلامی کے بعد بھی شرح صدر کی آرزو باقی رہی، انہوں نے اس نعمت کے لیے دعا کی، تجھے یہ نعمت عظمیٰ ہم نے بلاطلب عنایت کی۔ تیرے سینے کواپنی معرفت کے لیے کھول دیا، اسے اپنی نورانیت سے لب ریز کردیا

اور اپنی آیات و دلائل کو تیرے اُوپر واضح و روشن کر دیا۔ اصلاح خلق کے لیے ہم تیری تڑپ دیکھ رہے تھے، یہ فکر تجھے ہلاک کیے ڈالتی تھی، کہ لوگوں کو کیوں کر راہِ راست پر لایا جائے۔ مراسم شرک سے تجھے شروع سے نفرت رہی ہے۔ وہ ہماری نظر سے چھپی ہوئی نہیں، اصلاح خلق کے لیے تیری دُھن، خود راہِ راست دکھانے کی فکر کا بار۔ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ، الَّذِىْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ. تیری پشت کو توڑے ڈالتا تھا۔ ہم نے اپنے فضل و کرم سے اس بار سے تجھے نجات دے دی اور یہی نہیں کہ وحی کی روشنی دے کر خود تجھے راہِ راست پوری کی پوری دکھا دی، بلکہ اس نعمت سے بھی سرفراز کر دیا کہ دوسروں کو بھی راہِ ہدایت دکھا تا رہ۔ مخالفین کے منصوبوں اور شرارتوں سے تنگ دل نہ ہونا، تو ہماری حفاظت میں ہے، یہ تیرا کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ آج یہ نالائق اپنے نزدیک تجھے مٹا دینے کی فکر میں ہیں، لیکن ہم نے تیرا ذکر بلند کر رکھا ہے، پھر جس ذکر کو ہم بلند قرار دیں، کون بشر اس کی بلندی کا پورا اندازہ کر سکتا ہے۔ وَرَفَعْنَالَكَ ذِكْرَكَ. یہ مخالفتیں اور سازشیں تجھے کیا میٹ سکیں گی، مخالفین اور سازش کرنے والے خود ہی مٹ جائیں گے اور تیرا نام ان سب کو پست و سرنگوں کر کے خود ممتاز و سر بلند رہے گا"۔ (ملاحظہ ہو: ص ۲۴، ۲۵)

"رسول اللہ کی نام لیوا معنوی اولاد:

تو اَن پڑھ ہے اور حروف و کتاب سے نا آشنا، لیکن تیری عظمت کی گواہی دینے والے وہ ہوں گے جنھیں ناز اپنے علم و فضل پر اور دعویٰ اپنے کمالِ فن کا ہوگا۔ کچھ لوگ تیرے اقوال و ملفوظات کی جمع و تحقیق اور ان کی شرح و تفسیر میں اپنی اپنی عمر بسر کر دیں گے اور بخاریؒ و مسلمؒ، ابن حجرؒ و ابن جوزیؒ کی طرح محدثین کے گروہ میں محشور ہونا اپنے لیے باعث فخر سمجھیں گے۔ ایک گروہ تیرے بتائے ہوئے احکام کی جانچ پڑتال اور ان سے استنباط جزئیات کی خاطر اپنی زندگیاں وقف کر دے گا اور ابوحنیفہؒ و شافعیؒ، مالکؒ

وابو یوسفؒ، نخعیؒ ومزنیؒ کے مثل افتاء وتفقہ کو اپنے لیے باعث سعادت خیال کرے گا۔ ایک جماعت تیری باطنی تعلیمات کی دل دادہ ہو کر راہ سلوک ومجاہدے میں پڑ جائے گی اور کتنے ہی جنیدؒ وشبلیؒ، جیلانیؒ واجمیریؒ، تیری ہی مشعل سے اپنے اپنے چراغ نسلاً بعد نسلٍ جلاتے رہیں گے۔ رومیؒ وسعدیؒ، حافظ وسنائیؒ، اکبرؒ واقبالؒ، اپنے شاعرانہ کمالات کو تیری غلامی پر نثار کر دیں گے۔ ابو حامد غزالی اور ولی اللہ دہلویؒ اپنی سربلندی تیرے ہی بتلائے ہوئے حقائق اور اسرار کی تشریح وترجمانی میں سمجھیں گے۔ اور رازی وطوسی، فارابی وابن سینا کو عقل ودلیل کے طوفان میں اگر پناہ کہیں ملے گی، تو تیرے ہی دامن کے سائے میں! حدیث، اصول فقہ، سلوک، تصوف، کلام، کتنے ہی فن مخصوص تیرے ہی سلسلے کی خدمت کے لیے عالم وجود میں آئیں گے اور علوم وفنون کے کتنے ہی علم بردار، ہر ملک اور ہر قوم اور ہر زمانے میں، اپنی تحقیق وکاوش کو تیری خدمت کے لیے وقف رکھیں گے! برلن اور پیرس اور لندن تیرے اور تیرے دین کے دشمنوں کے پایہ تخت ہوں گے، لیکن تیرا نام، ہمارے نام کے ساتھ ان شہروں میں بھی ہر روز اور ہر روز بھی پانچ پانچ وقت بلند ہوتا رہے گا اور ہمارے عطاء کوثر کی شہادت بہم پہنچاتا رہے گا!''۔ (ملاحظہ ہو: ص۳۴، ۳۵)

''مثل آفتاب خادموں کا سرمایۂ ناز:

کروڑوں تو شاید، لیکن لکھوکھا بندے اللہ کے یقیناً ایسے ملیں گے، جو اپنی نجات اور اپنی عقبیٰ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی ذات سے وابستہ سمجھ رہے ہیں اور آج ہی نہیں، سیکڑوں برس سے سمجھتے چلے آرہے ہیں۔ عقیدے کی صحت وغلطی سے یہاں بحث نہیں، مقصود نفس واقعہ کا اظہار ہے۔ ان کی زبانوں پر نام ہے تو غوث اعظمؒ کا اور دلوں میں اعتقاد ہے تو محبوب سبحانیؒ کا۔ لیکن ذرا سوچ کر بتایئے، کہ شیخؒ اور ان کے سارے پیش رو اور پس رو، حسن بصریؒ اور جنید بغدادیؒ، خواجہ اجمیریؒ اور سید احمد سرہندیؒ، نظام الدینؒ اور علاء الدین

صابر کلیریؒ، نازاں کس شے پر ہیں؟ اپنی سروری و سرداری پر، یا عرب کے اُمیؐ کی غلامی اور مکے کے یتیمؐ کی چاکری پر؟ اللہ اللہ! جو خود لاکھوں کے سردار اور کروڑوں کے پیشوا، انہیں اگر فخر ہے تو صرف اس کا کہ کسی آستان پاک کے جاروب کش ہیں اور بس!--- دنیا میں اب تک بڑے بڑے جوگی اور رشی، راہب اور اہل ریاضت گزرے ہیں، یہ امتیاز اور یہ اعزاز کسی اور کے حصے میں آیا ہے؟ کسی کے خادموں میں بھی ایسے ایسے آفتاب اور ماہتاب، اور وہ بھی اس کثرت سے ہوئے ہیں؟

بے نظیر خدمت اور خادم

امام بخاریؒ کے مرتبے و عظمت سے کون ناواقف ہے۔ ان کی کاوش و تحقیق کی نظیر کسی ملک، کسی قوم میں ملتی ہے؟ پھر انہوں نے اور انہی کی راہ پر دوسرے صدہا چلنے والوں نے، امام مسلمؒ نے، امام مالکؒ نے، امام ابوداوٗدؒ نے، امام ترمذیؒ نے، امام نسائیؒ نے اپنی ساری ساری عمریں کس شغل کی نذر کردیں؟ محض ایک اُمیؐ ہی کے اعمال واقوال کے جمع کرنے میں! عسقلانیؒ اور عینیؒ، قسطلانیؒ اور طیبیؒ، سخاویؒ اور شوکانیؒ، قاضیؒ اور نوویؒ اور ان جیسے سیکڑوں دوسروں نے اپنی زندگیوں کو کس چیز کے لیے وقف کر رکھا ہے؟ اسی اُمیؐ کے اقوال کی شرح و تفسیر اور اس کی جانب منسوب الفاظ کی تنقیح و تنقید کے لیے! ابن جوزیؒ اور ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ، ان کی ساری زندگیوں کی تحقیق و تدقیق کا خلاصہ کیا ہے؟ بس اسی قدر نا کہ فلاں فلاں بدعتیں اس اُمیؐ کی سنت کے مخالف ہیں اور فلاں فلاں اقوال اس کی جانب منسوب کرنا اُس پر افترا کرنا ہے۔ اس پردۂ عالم پر ایک سے بڑھ کر ایک عالم و فاضل، حکیم و فلسفی، ادیب و مہندس پیدا ہو چکے ہیں، دنیا نے اب تک ان میں سے کسی کے ساتھ، اس کا نصف بھی اعتنا کیا ہے؟ کسی فلاطون، کسی سقراط، کسی ارسطو، کسی نیوٹن، کسی کینٹ، کسی ڈارون کے اقوال و ملفوظات اس کاوش کے ساتھ جمع کیے گئے ہیں؟ کسی کا ایک

ایک فقرہ، ایک ایک قول، ایک ایک لفظ اتنی سخت جرح اور ایسی ایسی موشگافیوں کے بعد، پاکوں کے واسطے سے اور سچوں کی شہادت سے یوں سلسلہ بہ سلسلہ منقول ہو کر پہنچا ہے؟

نقوش سیرت کی حفاظت

ابن اسحاقؒ اور ابن ہشامؒ، سہیلیؒ اور زرقانیؒ، ابن سعدؒ اور قاضی عیاضؒ، دمیاطیؒ اور مغلطائیؒ اور ان کے صدہا شاگردوں اور رفیقوں کے ضخیم مجلدات آپ کی نظر سے اگر نہیں گزرے نہ سہی، ان کے ناموں کی شہرت تو یقیناً آپ کے کانوں تک پہنچ چکی ہوگی۔ ان کا مشغلہ زندگی کیا رہا؟ یہ کاہے میں جیے اور کاہے میں مرے؟ اسی اُمی معلم کائنات کی سیرت کا ایک ایک گوشہ محفوظ رکھنے میں، اس کی کتابِ زندگی کی ایک ایک سطر حفظ کرنے میں۔ اور محض یہی نہیں ''روشن خیال'' میور، اور ''علم دوست'' مارگولیس ''تحقیق پسند'' کارلائل اور ''حقیقت طراز'' ولہاوسن کو کس کے سوانح نویسوں کی صف میں شمار ہونے کی آرزو بے قرار کیے ہوئے ہے۔ دنیا میں بڑے بڑے گردن کش بادشاہ اور تاج دار ہو چکے ہیں، کسی کی سیرت، اس تحقیق اور اس جزئی تفصیل کے ساتھ تاریخ کے صفحات میں کہیں بھی ملے گی؟ کسی فرعون، کسی نپولین، کسی سکندر، کسی زار، کسی قیصر، کسی دارا، کسی فغفور، کسی سلطان، کسی مہاراجہ، کسی ہز مجسٹی کا اٹھنا، بیٹھنا، چلنا، پھرنا، سونا، جاگنا، کھانا، پینا، ہنسنا، رونا، لیٹنا، اس جامعیت، اس استقصاء، اس تاریخیت اور اس اہتمام کے ساتھ کاغذ کے نقوش پر آج تک منتقل ہو سکا ہے؟''۔ (ملاحظہ ہو: ص ۴۷ تا ۴۹)

''کس وقت بلندی کا اعلان ہو رہا ہے

ہندوستان کے چھوٹے چھوٹے قریوں اور موضعوں، عرب کے ریگستان اور چٹیل میدان اور افریقہ کے صحرا و بیابان سے لے کر لندن اور پیرس اور برلن کے تمدن زاروں تک، ہر روز اور ہر روز میں بھی پانچ پانچ بار کس کے نام کی پکار، اللہ کے نام کے ساتھ ساتھ

بلند ہوتی رہتی ہے؟ اپنی ذاتی عقیدت مندی کو الگ رکھیے، محض ایک خالی الذہن اور ناطرف دار تماشائی کی حیثیت سے محض واقعات پر نظر کر کے، فرمایئے کہ یہ مرتبہ، یہ اکرام، دنیا کی تاریخ معلوم سے لے کر آج تک کسی ہادی، کسی رہبر، کسی مخلوق کو حاصل ہوا ہے؟ جس بے کس اور بے بس سے، عین اس وقت جب کہ اُسے زور اور قوت والے سردارانِ قریش اپنے خیال میں کچل کر اور پیس کر رکھ چکے تھے اور اس کا نام ونشان تک مٹا چکے تھے، یہ وعدہ ہوا تھا کہ

"وَرَفَعۡنَا لَكَ ذِكۡرَكَ." ہم نے تیرے لیے تیرا ذکر بلند کر رکھا ہے۔ اگر آوازہ اس کا بلند نہ ہوگا تو اور کس کا ہوگا؟ نام اس کا سرافراز اور سر بلند نہ ہوگا تو اور کس کا ہوگا؟ بلندیٔ ذکر کی یہ وہ تفسیر ہے جو اوراق لیل ونہار پر ساڑھے تیرہ سو برس سے ثبت چلی آ رہی ہے، چشم روزگار اسے صدیوں سے پڑھتی چلی آ رہی ہے اور خدا معلوم کب تک اسی طرح پڑھتی رہے گی!

حشر کے دن عنداللہ، اس بندے کا جو مرتبہ ہوگا، وہ تو ہو ہی گا، اس سے قطع نظر کر کے، ذرا صرف اس مرتبے کا تصور کیجیے، جو محض اس بلندیٔ ذکر کے لحاظ سے اس روز حاصل ہوگا۔ فوج کی فوج، انبوہ در انبوہ، اِدھر سے ملوک وسلاطین چلے آ رہے ہیں، اُدھر سے بڑے بڑے نام ور جنرل اور سپہ سالار۔ ایک طرف سے محدثین کرام جوق جوق چلے آ رہے ہیں اور دوسری طرف سے مفسرین عظام، اہل فقہ، اہل اصول، اہل کلام، اہل تصوف، اہل لغت، اہل سیر، اہل رجال، اہل نحو، اہل معانی، اہل بیان، اہل فلسفہ، اہل منطق، اہل اخلاق جس فن کو بھی لیجیے اس کے ائمہ وماہرین، ادب سے آنکھیں نیچی کیے، ہاتھ باندھے ہوئے خادمانہ انداز سے گرد وپیش حلقہ کیے ہوئے ہیں! ایک اسی انعام کی پوری وسعت کا تصور کس کے بس کی بات ہے؟"۔ (ملاحظہ ہو: ص۵۳، ۵۴)

''والضحیٰ''

تجھ پر ہمارے لطف وکرم کی اس درجہ بارش وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى.
ہے کہ تو خود ہمارے الطاف بے کراں سے سیر اور مطمئن ہو جائے گا، تیری طبیعت خود ہمارے عطایائے پیہم سے آسودہ ہو جائے گی۔ تو جو مانگے گا ملے گا۔ تیری جو خوشی ہوگی پوری ہوگی۔ یہاں بھی اور وہاں بھی، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، آج بھی اور کل بھی۔ یہ عطائیں اور بخششیں تیرے ''رب'' کی طرف سے ہوں گی۔ اس کی ربوبیت تجھے پورے منتہائے کمال تک پہنچا کر رہے گی اور کمالات میں دنیا کے کمالات بھی شامل ہیں اور آخرت کے بھی۔ ''آج'' عطاو بخشش کا مشاہدہ یوں ہوگا، کہ تیرے گِنے چُنے مفلس مرید اور فاقہ مست شاگرد اپنے سے دس گنے اور بیس گنے اور سو گنے سورماؤں پر، بڑے بڑے جتھے اور سرمایہ والے سرداروں پر غالب آئیں گے۔ مکے کو فتح کریں گے، مدینے پر حکومت کریں گے، یمن کو زیر کریں گے، عراق پر اپنا علم نصب کریں گے، مصر کو اپنا کلمہ پڑھائیں گے، قیصر کے قصر جہاں داری کی اینٹ سے اینٹ بجادیں گے، ایران کے پایۂ تخت کو ہلا کر رکھ دیں گے۔ اور ''کل'' تیرے کمالات کا ظہور اس رنگ میں ہوگا کہ جس وقت ابرار واخیار لرزاں وترساں ہوں گے، جس دم بڑے سے بڑے مقربین اپنے لیے تھرا رہے ہوں گے، جس گھڑی موسیٰ کلیمؑ وعیسیٰ مسیحؑ تک کی زبان پر نفسی نفسی ہوگا، اس آن اور اس گھڑی لوائے حمد تیرے ہی ہاتھ میں ہوگا، اس وقت تیری ہی سنی جائے گی، اس وقت تیری ہی مانی جائے گی اور اس وقت تجھی کو یہ حق حاصل ہوگا کہ آپ تو آپ، اپنوں میں سے، اپنے کہلانے والوں میں سے جتنوں کو چاہے گا --- اور تو ان میں سے کس کو نہ چاہے گا؟ تو اپنے والوں پر ''حریص'' بھی ہے، اور ''رؤف'' بھی اور ''رحیم'' بھی''۔ (ملاحظہ ہو: ص ٦٦)

''یہ مرتبۂ محبوبیت سارے عالم کے محبوبوں میں سے کسی کو حاصل ہوا ہے؟ پھر یہ

مراتبِ محبوبیت اب بھی ختم نہیں ہوتے، محبوبوں کی ذات ہی نہیں، ان کی ایک ایک صفت محبوب ہوتی ہے۔ ان کا ایک ایک وصف، محبت کی کائنات میں کیا کچھ درجہ رکھتا ہے! تو ''یتیم'' تھا لے آج سے ہم کو خود یہ صفت یتیمی فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ. محبوب ہوگئی ہے، آج سے کسی یتیم کے ساتھ سختی، بدسلوکی، بے مہری، بے اعتنائی، ہمیں گوارا نہیں۔ جو یتیم سے بے مہری کرے گا، خود اس کے ساتھ بے مہری کی جائے گی۔ جو یتیم کے سر پر شفقت سے ہاتھ نہ پھیرے گا، وہ خود شفقت ورحمت سے محروم رہے گا۔ جس کے دل میں یتیم کا درد نہ ہوگا، اس بے درد کے ساتھ بھی دردمندی نہ برتی جائے گی۔ یہ اعلان ہماری کتاب میں ہمیشہ کے لیے کیا جارہا ہے۔ ہماری کتاب یتیمی کی قدر ومنزلت کی گواہ رہے گی اور ہمارا دین یتیموں کے حقوق کا محافظ ہوگیا! تو بہت دنوں تک راہ کی تلاش میں سرگرداں رہا تھا، تو بہت روز تک اپنی تشفی کے لیے سائل بنا رہا، تو نے بہت زمانہ بہ حیثیت سوالی کے بسر کیا، اس کی یادگار وَاَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ. میں یہ اعلان عام کیا جاتا ہے، کہ سائل کی عزت کے ہم نگراں ہیں۔ سوال کرنے والا ہرگز سختی ودرشتی کے برتاؤ کا مستحق نہیں، بلکہ نرمی، آشتی وشیریں زبانی اس کا حق ہے اور وہ راہِ ہدایت کا سرگرداں، حق کی راہ میں ہر نکلنے والا، علم صحیح کی تلاش میں ہر قدم رکھنے والا اس کا مستحق ہے، کہ اس کی تشفی کی جائے۔ آج سے ہماری آسمانی کتاب زمین والوں کو حکم دیتی ہے کہ سوالی کے ساتھ لطف ومہربانی سے پیش آئیں۔ آخر ہر سائل کو عرب کے ''سائل'' اعظمؐ سے کچھ نسبت ومناسبت تو بہرحال حاصل ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہم نے تجھے محتاج اور بدرجۂ غایت محتاج پایا تھا۔ جس درجے کی یہ محتاجی تھی، اسی درجے کا غنا، ہم نے اپنی عطا وبخشش سے مرحمت فرمایا، وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ. اس دولت کا نام، دولت نبوت وقرآن ہے۔ ہماری یہ نعمت چھپا کر رکھنے کی نہیں، خوب لٹانے اور تقسیم کرنے کی ہے۔ پس جہاں تک ممکن ہو، اس دولت کو لٹاؤ، اس نعمت کا فیض عام جاری کرو اور اس چشمۂ رحمت سے ایک ایک کو مستفیض کرتے رہو۔

مکے کے بے بس دبے کس یتیم، غار حرا میں مراقبہ کرنے والے گوشہ نشین! دیکھ لی تیرے مرتبے کی بلندی دیکھ لی، تیری شان محبوبیت کا نظارہ کرلیا! خادموں اور غلاموں ہی نے نہیں، منکروں اور حاسدوں، بدباطنوں اور کور چشموں تک نے تیرے آفتاب اقبال کی چمک دمک دیکھ لی، جو تجھ سے ٹکرایا، مٹادیا گیا، توڑ دیا گیا، پاش پاش کردیا گیا! جو تیرے سامنے جھکا نوازا گیا، سرفراز ہوا، اپنی مراد کو پہنچا۔ ابوجہل اور فرزند خطابؓ، دونوں تیرے حق میں یکساں تھے۔ ابوجہل نے تجھ سے دشمنی کی، اپنے آپ سے دشمنی کرلی! عقل ودانش نیک نامی واقبال مندی، آفتاب و ماہتاب، زمین وآسمان سب اس کے دشمن ہوگئے! فرزند خطابؓ نے اپنا سر تیرے آگے جھکادیا، سب اس کے آگے جھک گئے، خزانے جھکے، فوج ولشکر جھکے، اقبال وحشم جھکا، نام وری واقبال مندی جھکی، شام وایران، مصر وعراق کے تخت وتاج جھکے، ایک عالم کا عالم صولتِ فاروقی کے آگے جھک گیا!''۔ (ملاحظہ ہو: ص ۶۸ تا ۷۱)

''محاسب فطرت کا اندازہ

بدنصیب ابوجہل اور کور بخت ابولہب آج تجھے رَد کررہے ہیں تو اپنی بے بصری کی بنا پر معذور ہیں، کل ہی وہ دن آتا ہے، جب انہی کی ذریات جن لوگوں کو دانائی وفرزانگی کا امام تسلیم کرے گی۔ حکمت ودانش کا پیشوا تسلیم کرے گی، خود ہی زبان قال اور زبان حال سے مَـآ اَنْـتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ. سے تیری گواہی دیں گے اور بول اٹھیں گے، کہ تو اپنے پروردگار کے فضل وکرم سے مجنوں اور دیوانہ نہیں، بلکہ خبطی اور دیوانے وہ ہیں جو اپنی جہالت سے تجھے جھٹلا رہے ہیں۔ عقل کے اندھے وہ ہیں، جو اپنی نادانیوں سے تیری نبوت میں شک کررہے ہیں۔ دنیا جتنی آگے بڑھے گی، عقل وحکمت کو جتنی ترقی ہوتی جائے گی، تیرے لائے ہوئے دین کا چہرہ روشن سے روشن تر ہوجائے گا۔ تیری عقل وفرزانگی کا آوازہ بلند تر ہوجائے گا۔ رازی وغزالی، طوسی وفارابی، ابن رشد وابن سینا، تیری ہی حلقہ بگوشی پر فخر کریں گے۔ غزنوی

وغوری، ترک وسلجوق، مصطفیٰ کمال و امان اللہ کو تیری ہی غلامی پر ناز ہوگا!

زمانہ بدل جائے گا، اہل زمانہ کی طبیعتیں بدل جائیں گی، مشرق کی بساط الٹ کر مغرب کے ٹھاٹھ جم جائیں گے، روحانیت کی جگہ مادّیت کا سکہ چلنے لگے گا، یہ سب کچھ ہوگا، لیکن تیری محنت و کوشش کا صلہ غیر محدود ہے۔ وَاِنَّ لَكَ لَاَجْراً غَيْرَ مَمْنُوْن. تیری تبلیغ کا اجر کبھی ختم ہونے والا نہیں۔ تو نے اپنی اصلاحات سے دنیا میں جو انقلاب برپا کر دیا ہے، اس کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہی ہوتا جائے گا۔ تیرے غلاموں کے ذخیرۂ علم سے خوشہ چینی کر کر کے اہل مغرب بڑے بڑے نظامات فلسفہ تیار کریں گے۔ تیری منقبت نگاری کارلائل اور گوئٹے اپنے لیے باعث شرف سمجھیں گے۔ تیرا ہلکا پرتو پڑ جانے سے ٹالسٹائے اور گاندھی، ذرے سے آفتاب بن جائیں گے۔ تیری عظمت کا اعتراف آکسفرڈ اور کیمبرج کی یونیورسٹیاں کریں گی۔ تیرے منہ سے نکلے ہوئے کلموں کے زندہ و محفوظ رکھنے کے لیے ہالینڈ اور جرمنی کے بڑے بڑے دارالاشاعت وقف رہیں گے۔ تیرا نام ہر روز پانچ، پانچ مرتبہ برلن، پیرس اور لندن کے بلند میناروں سے پکارا جائے گا۔ تیرے پرستاروں کی عبارت و کلام کی تشریح و تحشی کو براؤن و نکلسن اپنے لیے سرمایۂ ناز سمجھیں گے! جو تیرے دین کے منکر ہوں گے، جو تیرے نام سے دشمنی رکھیں گے، خود انہی کے قلم اور انہی کی دوات، انہی کے کاغذ اور انہی کی سیاہی، انہی کی عقل اور انہی کے دماغ کو ہم تیری عظمت کا اعتراف، تیری دانائی کی شہادت، تیری کام یابی کی گواہی کے لیے وقف رکھیں گے!"۔ (ملاحظہ ہو ص ۹۹، ۱۰۰)

"اسوۂ رسولؐ"

رسولؐ آج چشم ظاہر سے مستور ہیں، لیکن "اسوۂ رسولؐ" مستور نہیں۔ وہ قدم، جن پر پیشانیوں کا رگڑنا ہمارے لیے اوج سعادت تھا، آج ہماری نظروں سے اوجھل ہیں،

لیکن ''نقش قدم'' موجود ہیں۔ صاحب خلق عظیم آج ''رفیق اعلیٰ'' کی رفاقت میں ہے، لیکن ''خلق عظیم'' کی امانت انسانوں کے سینوں اور کتب خانوں کے سفینوں میں آج بھی محفوظ ہے۔ پیام بر کا پیام زندہ ہے، کام زندہ ہے، نام زندہ ہے اور آج خاک کا ہر پتلا اپنے ظرف اور بساط کے مطابق، اس گنج نور سے کسب فیض کرسکتا ہے، ٹھیک اسی طرح باطل پرستی کی بھی راہ آج بھی بند نہیں۔ جس طرح صاحب "خلق عظیم" کی علوی نسبت زندہ وقائم ہے، اسی طرح "حلاف مهین" کا سفلی سلسلہ بھی منقطع نہیں ہوا ہے۔ بے ضرورت حلف نامے شایع کرنے والے، غیر اللہ کی قسمیں کھانے والے، اسے کمال انشا پردازی کا نمونہ سمجھ کر اس پر فخر کرنے والے، اپنے فوری مقاصد کے حصول کے لیے اپنے ہاتھوں اپنی عزت وشرافتِ ظرف کا خون کرڈالنے والے، بے گانوں کے سامنے اپنوں کی مخبری وجاسوسی کرنے والے، نیک کاموں میں شرکت اور چندے سے مختلف حیلوں حوالوں سے روکنے والے، پردے اور سود کے متعلق اللہ کی باندھی ہوئی حدوں کو اپنی روشن خیالی کے زعم میں توڑ ڈالنے والے، ان گناہوں کو گناہ نہ سمجھ کر ان پر فخر کرنے والے، لڑائی جھگڑوں کو طرح طرح کے پُرفریب طریقوں سے طول دینے والے، اپنی بڑائی کا نقارہ اپنے ہاتھ سے پیٹنے والے، پاک وپاکیزہ گروہوں کی جانب بلا استحقاق اپنی نسبت دینے والے اور پھر یہ ساری زیادتیاں محض اپنے جتھے اور اپنے سرمائے، اپنی پارٹی اور اپنے فنڈ کے بل پر کرنے والے، جب تک روئے ارض پر موجود ہیں، کون کہہ سکتا ہے کہ صبح سعادت کی پوری نورانیت وضوفشانی کے ساتھ شب باطل بھی اپنی پوری تیرگی وسیاہی کے ساتھ موجود نہیں؟''۔ (ملاحظہ ہو: ص ۱۰۴، ۱۰۵)

''جامعیت

اگر آج ہم اس بڑے ''امین'' کے نقشِ قدم پر چلتے ہوتے تو ہم میں خیانت

وبد دیانتی کا گزر نہ ہوتا۔ اگر آج ہم اس ''رؤف ورحیمؐ'' کے پیرو ہوتے، تو ہمارے دلوں میں ایک دوسرے کی جانب سے بے اعتمادی وبدگمانی نہ ہوتی۔ اگر آج ہم نے اس غارحرا کے بیٹھنے والے کے آثار مبارک کو اپنا سرمہ چشم بنایا ہوتا تو ہمارے باطن میں کسی قسم کی گندگی باقی نہ رہ جاتی۔ اگر آج ہم فاتح بدرؐ کی عظمت دل سے کرنے والے ہوتے تو مخالفین کے مقابلے میں ہمیں شکستیں نصیب نہ ہوتیں۔ اگر آج ہم رحمۃ للعالمینؐ کے پیام پر سچے دل سے ایمان رکھتے ہوتے، تو اپنی جیسی مخلوقات کے ساتھ ہمیں بے گانگی ومخالفت نہ ہوتی۔ اگر آج اپنے سچ بولنے والے اور سچ کے برتنے والے ہی کے طریقے پر ہم قائم ہوتے، تو جھوٹ کا ہماری آبادیوں میں نام ونشان ہی نہ ہوتا۔ اگر آج ہم کو اسم پاک احمدؐ کی لاج ہوتی تو اللہ کی حمد وثنا سے ہمیں اس قدر گریز نہ ہوتا۔ اگر آج ہم کو اسم گرامی محمدؐ سے عملاً کوئی واسطہ ہوتا، تو اپنی موجودہ پستی وبدنامی سے بہ مراحل دور ہوتے۔ آج جب کہ سارے ملک میں میلاد مبارک کی محفلیں آراستہ ہو رہی ہوں گی، کیا یہ بہتر نہ ہوگا ان کے ساتھ ساتھ ہم اپنے خلوت خانۂ قلب میں بھی کچھ دیر کے لیے ذکر پیمبرؐ ویادِ رسولؐ کی محفل گرم کریں!''۔ (ملاحظہ ہو: ص ۱۱۱، ۱۱۲)

مولانا دریابادی کے یہ بیش قیمت سیرتی مضامین ان کے شہرہ آفاق صحیفے ہفتہ وار ''سچ'' لکھنؤ میں شایع ہوئے تھے۔ سیرت پاک جیسا پاکیزہ اور محبوب موضوع اس پر مستزاد مولانا دریابادیؒ کا شگفتہ اور پختہ قلم، منظر نور علی نور! یہ مضامین ہاتھوں ہاتھ لیے گئے۔ بعدازاں جنوری ۱۹۴۳ء میں ڈاکٹر غلام دستگیر رشید حیدرآبادی نے ادارہ اشاعت اردو، حیدرآباد سے یہ مضامین ''مردوں کی مسیحائی'' کے نام سے کتابی شکل میں شایع کیے۔ کتاب خوب مقبول ہوئی۔ ۱۹۸۴ء میں مولانا دریابادیؒ کے جانشین حکیم عبدالقوی دریابادیؒ (ولادت: یکم جنوری ۱۹۱۳ء، وفات: ۱۶/اکتوبر ۱۹۹۰ء) مدیر صدق جدید لکھنؤ جو مولانا کے برادرزادے اور خویش تھے، نے اس کتاب کو ازسرنو مرتب کیا۔ حکیم فرزانہ کی یہ نئی ترتیب

''ذکر رسولؐ'' کے نام سے مولانا دریابادیؒ کے ایک نادیدہ مخلص معتقد الحاج منظور علی لکھنوی کے اشاعتی ادارے ''ادارہ انشائے ماجدی'' کولکاتہ سے بہترین اور دیدہ زیب طباعت کے ساتھ شایع ہوئی۔

سیرت کی کتاب کی مقبولیت اور موضوع کی کشش کے پیش نظر صدق فاؤنڈیشن لکھنؤ نے یہ کتاب شایع کی ہے۔ رب ماجد سے دعا ہے کہ ہمارے اس عمل کو قبول فرمائے اور ہمیں تقویٰ اور اخلاص سے نوازے۔ آمین۔

سفر حجاز - ایک مطالعہ

حج بیت اللہ کا یہ مبارک سفر نامہ ایسے خامہ صدق نگار کا شاہ کار ہے جو ایک زمانے تک تشکیک وارتیاب کی گھاٹیوں میں سرگرداں رہنے کے بعد بہ توفیق الٰہی اسلام اور اسلامی تعلیمات کی شرح وتفسیر اور ترجمانی کے لیے اپنے آپ کو وقف کر چکا تھا۔ بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ''سفر حجاز'' اپنے عہد میں لکھے گئے حج کے سفر ناموں میں گل سرسبد کی حیثیت بھی رکھتا ہے اور اولیت کا شرف بھی۔ حج کا یہ ماجدی سفر نامہ مولانا دریابادیؒ کے باطنی احساسات وجذبات کے مدوجزر کی ایک انوکھی داستان ہے۔ یہ سفر نامہ مولانا دریابادیؒ کے قلبی تاثرات وواردات کا ایک ایسا مجلیٰ ومصفیٰ آئینہ ہے جس میں عاشقان رسولؐ اپنا چہرہ دیکھ سکتے ہیں۔ یہ محبت اور والہانہ شیفتگی کا سفر نامہ ہے۔ وہی والہانہ شیفتگی جو صدیوں سے فرزندان توحید کا مایہ افتخار رہے۔

مولاناؒ نے اس سفر نامے کے طبع ثانی کے دیباچے میں لکھا ہے:

''کعبہ کی تجلیات ربوبیت آج بھی وہی، مدینہ کے انوار رسالت آج بھی وہی، بندوں کے سروں میں سودائے عبدیت وہی، افراد امت کے دلوں میں ہوائے شوق وہی۔ کتاب اصلاً مجموعہ ٹھہری انہی نقوش وتاثرات کا''۔

اس مقدس سفر کا مقصد کیا تھا؟ مولانا کے الفاظ میں:

''سفر سیر وتفریح کے لیے نہ تھا، تحصیل ''علوم'' وتکمیل ''فنون'' کے لیے نہ تھا، علمی وادبی ''تحقیقات'' تاریخی واثری ''تفتیش'' کے لیے نہ تھا، کشمیر وشملہ کا نہ تھا، لندن وپیرس،

آکسفورڈ وکیمبرج کا نہ تھا۔ ہاں وہاں کے لیے بھی نہ تھا جہاں گرج گرج کر تقریریں کی جاتی ہیں اور جھگڑ جھگڑ کر رزولیوشن پاس ہوتے ہیں۔ سفر جلجلاتی ہوئی ریگ والی زمین کی طرف تھا۔ گرمی کے موسم میں اس آسمان کی چھت کے نیچے تھا جس کا آفتاب تمتمایا ہوا ہوتا ہے۔ ہوٹلوں اور پارکوں، آبشاروں او رسبزہ زاروں کی طرف نہ تھا، خشک اور چٹیل میدانوں، بے آب وگیاہ ویرانوں اور آگ وخاک برسانے والے ریگستانوں کی جانب تھا۔ ایک گنہگار امتی، اپنے شفیع وشفیق آقا کے آستانے پر حاضر ہورہا تھا۔ بندے کی حاضری اپنے مولیٰ کے دربار میں تھا۔ بھاگا ہوا غلام تھک کر، ہار کرہ پچھتا کر اور شرما کر پھر اپنے مالک کی طرف رخ کررہا تھا۔ ذرہ آرزومند تھا کہ آفتاب کی تابش سے جگمگا اٹھے، قطرے کو ہوس ہوئی کہ بحر بے کراں کے وصل کا لطف اٹھائے، مشت خاک کو یہ دماغ ہوا کہ نور پاک کے جاروب کشوں کی فہرست میں اپنا نام لکھائے جو کچھ بھی نہ تھا، اسے یہ ولولہ ہوا کہ جو سب کچھ ہے اس سے تعلق وپیوند پیدا کیا جائے۔

ہے آرزو کہ ابروے پرخم کو دیکھیے   اس حوصلے کو دیکھیے اور ہم کو دیکھیے

(ملاحظہ ہو: باب نمبر ا، ص:۲۶)

خوف وخشیت، ندامت وانابت اور رجوع الی اللہ نے اس ماجدی سفرنامۂ حج میں عجیب تاثیر پیدا کردی ہے۔ یہ سفرنامہ پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ اس کا لکھنے والا رحمت الٰہی کی طلب میں کتنا بے چین ہے؟ اس رحمت کی طلب میں، جس کے لیے ارحم الراحمین کا ارشادگرامی ہے: وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ، یعنی اور میری رحمت تو ہر چیز پر پھیلی ہوئی ہے۔ کہنے والا کیا خوب کہہ گیا ہے ؎

رحمت حق بہانہ می جوید   رحمت حق بہا نمی جوید

مولانا دریابادیؒ لکھتے ہیں:

”مولیٰ ہر بے کس کی لاج تیرے ہاتھ میں ہے! ہر مفلس کا آسرا تیرا ہی دست کرم

ہے! بلایا ہے تو اپنے در سے محروم نہ واپس کرنا۔ اپنے اس غضب سے پناہ میں رکھنا کہ اس آستان پاک تک پہنچ کر انوار صاحب خانہ کی نوازش سے یکسر محرومی رہے۔ نہ ہو کہ مکان پر حاضری کے بعد بھی لامکان والے مکین کی تجلیات قبول پزیرائی حجاب ہی میں رہیں! بیت کے ساتھ رب البیت کے انوار جمال کی بھی جھلک اپنے ظرف وبساط کے لائق نصیب ہو! مُردوں کو جلانے والے مالک! مایوسوں کو خوش خبری دینے والے مولیٰ! بے کسوں کی دست گیری کرنے والے آقا! دلوں کے زخم پر مرہم رکھنے والے پروردگار! تجھ سے بھاگا ہوا تیرا نافرمان غلام، تیرے اور تیرے حبیبؐ کے آستان پاک پر سر رکھنے کو حاضر ہو رہا ہے۔ دعاؤں کا قبول کرنا تیرے ہی ہاتھ ہے اور دعاؤں کی توفیق دینا بھی تیرے ہی ہاتھ میں'' (ملاحظہ ہو: ص ۱۹-۲۰)

بحر ہند عبور کرتے ہوئے اور اس پر فرنگی قبضے اور تصرف سے سخت بے زار مولانا دریابادیؒ اپنے جذبات اور وجدانی کیفیات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

''گھنٹہ دو گھنٹہ نہیں، دن دو دن بھی نہیں، پورا ایک ہفتہ ہو گیا اور خشکی کا کہیں نشان نہیں، جنگل اور بیابان کے درندے اور باغ وصحرا کے چرندے کیسے، ہوا کے پرندے تک نہیں! اِدھر پانی اُدھر پانی، آگے پیچھے، داہنے بائیں، ہر سمت پانی ہی پانی! اوپر نیلا آسمان، نیچے نیلا سمندر! زمین کی بے بساطی اب جا کر محسوس ہوئی! خشکی کے بڑے بڑے شہر اور صوبے، آبادیاں اور بستیاں، جنگل اور پہاڑیاں، سڑکیں اور ریل کی پٹریاں، ریگ کے تودے اور پہاڑوں کی چوٹیاں، جن کی وسعت اور کثرت، عظمت وہیبت، اب تک دماغوں میں رچی اور آنکھوں کو بسی ہوئی تھی، اب معلوم ہوا کہ خالق کے بحر قدرت کے سامنے نہیں بلکہ اپنی ہی جیسی، ایک دوسری مخلوق کے سامنے کتنی حقیر اور کیسی بے حقیقت چیزیں ہیں! جل جلالہ! جس سمندر کو دیکھتے دیکھتے آنکھیں تھکی جاتی ہیں (یعنی بحر ہند) جو معلوم ہوتا ہے کہ اب کبھی ختم نہ ہوگا، وہ دنیا کے پانچ بڑے سمندروں میں سے صرف ایک سمندر ہے اور ان پانچوں میں بھی سب سے بڑا نہیں بلکہ دوسے چھوٹا! پھر ظاہر ہے کہ وہ بھی

پورے کا پورا بہ یک وقت پیش نظر نہیں بلکہ اس کا ایک مختصر جزو آنکھوں کے سامنے ہے۔ اللہ اکبر!
جب ایک جزو اور ادنیٰ جزو میں یہ ہیبت رکھ دی گئی ہے تو کل کے مشاہدے سے کیا کیفیت
طاری ہو گی! آج یہ مہیب اور لق و دق سمندر اور کرۂ ارض کے سارے معلوم سمندر "یاجوج"
کے قبضے میں ہیں۔ وہ جسے چاہے، اس میں جہاز اور کشتی چلانے کی اجازت دے اور جب
جس کو چاہے، اللہ کی کاری گری کے اس نادر نمونے سے فائدہ اٹھانے سے روک دے!
خلق خدا کی ہو تو ہو، لیکن سمندر اور سمندروں کے بندرگاہ، جہاز اور ان کے پھریرے، محکمہ
بحری (ایڈمرالیٹی) اور خداوندان بحر (SEA LORDS) کروزر اور ڈریڈ ناٹ،
تارپیڈو اور ڈسٹرائر، آج ہانکے پکارے کہہ رہے ہیں کہ "امر" اور "حکم" (نعوذ باللہ) یاجوج
کا ہے---- پھر اگر ایسے حال میں آپ کسی سچے کا قول سنتے ہیں کہ یاجوج و ماجوج سمندر
کا پانی پی جائیں گے تو آپ اس پیش گوئی کے پورے ہونے کے لیے کسی زمانہ مستقبل کا
کیوں انتظار کرنے لگتے ہیں؟

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمَاتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمَاتُ
رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا. (سورۂ کہف: ۱۹) دل نے کہا کہ یہی وہ سمندر ہے جس کی بابت
ارشاد ہوا ہے کہ اگر سارا سمندر روشنائی بن جائے، اور اسی جیسا ایک اور سمندر بھی روشنائی
بنا دیا جائے، جب بھی قدرت الٰہیہ کے بحر بے کراں کے کلمات لکھنے سے قاصر رہے گا۔ لیکن
روشنائی آئندہ ہی کیوں بنے؟ روشنائی تو یہ اب بھی بنا ہوا ہے۔ نیلی روشنائی ہی کی طرح نیلا
ہے۔ بحر قدرت و صنعت کے اتھاہ اور بے پایاں ہونے کا یہ کیسا نادر نمونہ ہے! اسی کے ساتھ
ہی نظروں کے سامنے یہ سماں بھی آ گیا کہ ایک روز یہ سارا بحر اعظم، یہ سارا لق و دق سمندر
موجیں مارتے ہوئے پانی کے بجائے، آگ سے لپکتے ہوئے شعلوں اور دھوئیں کے تیرہ
تار بادلوں میں تبدیل ہو کر رہے گا! یہ وہ دن ہو گا جب "یاجوج" اپنے مایۂ ناز جنگی جہازوں
اور آبدوز کشتیوں، اپنے تیل کے چشموں اور اپنے پٹرول کے خزانوں کی بھڑکائی ہوئی آگ

کے شعلوں سے، لنکا کے روایتی راون کی طرح، خود بھی جل رہا ہوگا۔ اور جب اس کی حرص وہوس، اس کی ملک گیری اور زر پرستی، اس کی قیصریت (امپریل ازم) اور کیپٹل ازم (سرمایہ داری) اور سوشلزم (اشتراکیت) اور کمیونزم (اشتمالیت) اور خدا معلوم کس کس ''ازم'' کے انگارے سمندر میں آگ لگا کر، خود اسی مادی دنیا میں اس کو دوزخ کا نمونہ دکھا رہے ہوں گے! یہ وہ دن ہوگا جب ارشاد ربانی وَاِذَالْبِحَارُ سُجِّرَتْ.(سورۃ التکویر:٦) کی تفسیر وتاویل کے لیے نہ تفسیروں کے اوراق الٹنے کی ضرورت ہوگی، نہ اہل لغت کے کلام سے سند لانے کی، بلکہ عالم وعامی سب اپنی آنکھوں سے مجاز کا نہیں، حقیقت کا مشاہدہ کرلیں گے۔ آج ''یاجوج'' کو مہلت ہے، آج وہ جتنا چاہے ہمارے دلوں اور دماغوں کو، ہماری عقلوں اور ذہنوں کو، ہماری آنکھوں اور کانوں کو، اپنے اقبال وحشم سے، اپنی تہذیب وتعلیم سے، اپنے علوم اور اپنے فنون سے، اپنے ڈاکٹروں اور اپنے انجینیر وں سے، اپنی سائنس اور اپنے آرٹ سے، اپنی توپوں اور اپنی رائفلوں سے، اپنی مشین گنوں اور اپنی سنگینوں سے، اپنے خزانوں اور اپنے طیاروں سے، اپنے بموں اور ایٹم بموں سے مرعوب اور مجنون اور مفلوج کرلے، لیکن یہ مہلت دائمی نہیں، اور کسے خبر کہ پردہ اٹھنے کا وقت قریب ہی آ لگا ہو!''

(ملاحظہ ہو: باب نمبر ۵، ص ۶۸ تا ۷۱)

جدے پہنچ کر مولانا دریابادی کا تاریخی ذوق اور ان کے شعور کی روانی ان کو ماضی کے اسلامی تمدن، تہذیب، ثقافت، عظمت، سطوت اور شان وشوکت کے مراکز کی بھرپور یاد دلاتی ہے اور وہ اپنے کرب، تاسف اور ملال کا اظہار یوں کرتے ہیں:

''جدہ سرزمین عرب کا پھاٹک ہے، حکومت اسلام کا پہلا شہر ہے۔ برا یا بھلا جیسا بھی ہے، اپنا ہے۔ اپنوں اور اپنے والوں کی چاہت کسے نہیں ہوتی؟ ---لیکن اے سب عزتوں کے مالک! ایک گستاخ مشت خاک کو یہ کہنے کی اجازت دے کہ ---اب تو کسی کو بھی اپنا کہتے ہوئے دل لرزتا ہے اور زبان ہچکچاتی ہے۔ خیر قرطبہ، غرناطہ کو تو مدت ہوئی

بھول چکے، لیکن ابھی کل کی بات ہے کہ بصرہ اپنا تھا، بغداد اپنا تھا، حلب اپنا تھا، بیروت اپنا تھا، دمشق اپنا تھا، بیت المقدس اپنا تھا، قاہرہ اپنا تھا، استنبول اپنا تھا اور کچھ ہی قبل شاہ جہاں آباد بھی اپنا تھا، اکبرآباد اپنا تھا، حیدرآباد اپنا تھا، لکھنؤ اپنا تھا، مرشدآباد اپنا تھا، عظیم آباد اپنا تھا، سورت اپنا تھا، بیجاپور اپنا تھا، کرناٹک اپنا تھا، آج ان میں سے کوئی اپنا ہے؟ پھر جدہ غریب کی خیر کب تک منائی جاسکتی ہے؟ یاجوج کا پھریرا گو آج ضابطے ورسم کے ساتھ وہاں نہ لہرا رہا ہو، لیکن جدے کے کوچہ وبازار، در ودیوار سب یاجوج ہی کے عظمت کے نقیب بن چکے ہیں۔ دکانوں میں مال ہے تو ولایتی، جسموں پر لباس ہے تو ولایتی، بازاروں میں سودا ہے تو ولایتی، مکانوں میں سامان ہے تو ولایتی، عقلیں مرعوب، قلوب مفلوج، کس چیز سے دل کو سمجھایے اور کیا کہہ کر اپنے کو دھوکہ دیجیے! سرزمین اسلام کا اسلامی شہر اور دل ترستارہ گیا کہ کسی محدث کی زیارت سے آنکھیں روشن ہوں، کسی بزرگ صاحب باطن کی نگاہ کرم دل کو گرمائے۔ کسی فقیہ کے حلقہ درس وافتاء کی تازگی وشگفتگی تھکے ماندے مسافر کی خستگی وماندگی کو دور کردے! پر آہ یہ کچھ بھی نہ ہونا تھا! ہر تمنا ناکام، ہر آرزو منفعل ہوکر رہنی تھی سو ہو کر رہی۔ مسجد میں نماز کئی وقت پڑھی، پر شہر کے عمائدو اکابر ایک وقت بھی مسجد کے اندر نہ دکھائی دیے اور دل نے تاسف کے ساتھ کہا کہ حضرت اکبر مرحوم کا تجربہ ع

کونسل میں بہت سید، مسجد میں فقط جمن

ہندوستان ہی تک محدود نہ تھا۔ دریائے جمنا کا کنارہ ہو یا بحر احمر کا ساحل، آج مسجد کی آبادی جہاں کہیں بھی قائم ہے، میاں جمن ہی کے دم سے"۔ (ملاحظہ ہو: باب نمبر ۷، ص ۹۷ تا ۹۹)

جدے میں دو دن گزار کر مولانا دریابادیؒ مدینۃ النبیؐ کی جانب روانہ ہوتے ہیں۔ یہی وہ مقدس سرزمین ہے جس کے لیے علامہ اقبالؒ نے کہا ہے ع

دید ہے کعبے کو تیری حج اکبر سے سوا

مدینہ منورہ کا یہ متبرک سفر مولانا ذوق کے پیروں سے نہیں شوق کے پروں سے

اڑ کر کرنا چاہتے ہیں۔ مولانا چوں کہ محض سفر نامہ نگار ہی نہیں بلکہ عالم کیف، اوردانائے رموز کم بھی تھے، اس لیے راہ مدینہ میں ان کا خامہ زرنگار، سوز وگداز، وجد و مستی، جذب دروں اور تب وتاب کے موتی رولتا ہے:

''موٹریں روانہ ہوئیں اور شب کی تاریکیوں میں سفر شروع ہوا۔ کس کا سفر، کہاں کا شروع ہوا؟--کون بتائے؟ کس کی زبان جواب دے؟ حاضری کی اجازت اسے مرحمت ہورہی ہے، جس کے نامۂ اعمال کی سیاہیاں شاید شب تار کی تاریکیوں سے بھی سیاہ تر ہیں۔ حضوری اس کے آستانے پر ہورہی ہے جو خود الطارق بن کر رات کی تاریکیوں کو منور کرنے آیا، جس کا ظہور اس گھڑی ہوا جب دنیا پر تاریکیوں اور سیاہیوں کے ایک سے ایک گہرے پردے پڑے ہوئے تھے اور جو اپنے ہم راہ نور اور اجالا لے کر آیا (صلی اللہ علیہ وسلم)---ابھی! یہ دل کیوں دھڑکتا جاتا ہے؟ یہ آنکھیں کیوں پُرنم ہورہی ہیں؟ یہ زبان کیوں خشک ہوتی چلی جاتی ہے؟ سامنا اس کا تو نہیں جو محض حاکم وآمر ہے، شارع وداعی ہے، دودھ کا دودھ پانی کا پانی الگ کرنے والا ہے (صلی اللہ علیہ وسلم)۔ حاضری تو اس کے دربار کی ہے جو ہمہ رحمت وہمہ مرحمت ہے، جو بدکاروں کی پردہ پوشی کرنے والا ہے، جس کا نام شفیع المذنبین ہے۔ یعنی نیکوں اور پاکوں کا نہیں، گناہ گاروں کا نجات دلانے والا، تباہ کاروں کا سہارا (صلی اللہ علیہ وسلم)۔ یہ سب کچھ سہی، یہ سب صحیح، پر دل اب بھی اپنے قابو میں نہیں۔ نفس کی شرارتیں، اندر کی خباثتیں، قلب کی قساوتیں، ایک ایک کر کے بے پردہ وبے نقاب سامنے آرہی ہیں! اور ریا ونفاق کا جامہ ہر ہر لمحہ چاک ہورہا ہے.....اے ریاکار! آج تیری اصلیت ظاہر ہوگئی ہے! اے ظاہر دار! اس وقت تیری کیچلی اتر رہی ہے، جب قوالی کی محفلوں میں یا شاعری کی دنیا میں ''دشت یثرب میں ناقہ کے پیچھے دوڑتے رہنے'' کا یا ''تلووں میں خار صحرائے مدینہ کے چبھنے'' کا ذکر آتا تھا، تو خوب گردن ہلا ہلا کر جھومتا تھا، جوش ومستی کا اظہار کرتا تھا اور ہمہ تن اشتیاق وتمنا بن بن

جاتا تھا۔ پھر آج تو یہ منظر سامنے ہے، تصور و خیال میں نہیں، مادی آنکھوں کے روبرو ہے۔ اس خاک کا سرمہ آنکھوں میں کیوں نہیں لگاتا؟ یہاں کے کانٹوں کو اپنے پیروں میں کیوں نہیں چبھنے دیتا؟ اس دشت میں ''جیب و گریباں کی دھجیاں اڑاتے ہوئے کیوں نہیں دوڑ لگاتا؟'' محبت رسولؐ کے دعوے زبانی تھے۔ دوستوں اور معتقدوں کے مجمع میں عشق سرکار مدینہ کی خوب خوب لاف زنی ہوتی تھی۔ آج سارے دعووں کی حقیقت کھل گئی۔ مرکز نور سے جوں جوں قرب حاصل ہوتا جاتا ہے، ہر شے کی اصلیت سے نقاب اٹھتا جارہا ہے۔ اے نفس کے غلام! کیا تو یہ سمجھے ہوئے تھا کہ تیری ریاکاری اور ظاہرداریوں پر پردہ یوں ہی پڑا رہنے دیا جائے گا۔

مولانا کا اشہب قلم راہ شوق میں مزید طرارے بھرتا ہے:

ہماری طرح خدا معلوم کتنی اور موٹریں اور لاریاں سواریوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی اسی راستے پر چل رہی ہیں۔ ہزارہا انسان اونٹوں کے قافلوں میں چلتے ہوئے مل رہے ہیں۔ سیکڑوں آدمی پیدل سفر کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں عورتیں بھی ہیں اور مرد بھی۔ بوڑھے بھی ہیں اور بچے بھی۔ غریب بھی ہیں اور امیر بھی۔ بنگالی بھی ہیں اور پنجابی بھی۔ دکھنی بھی ہیں اور گجراتی بھی۔ حجازی بھی ہیں اور نجدی بھی۔ مصری بھی ہیں اور سوڈانی بھی۔ جاوی بھی ہیں اور چینی بھی۔ برمی بھی ہیں اور بخاری بھی۔ افغانی بھی ہیں اور مراقشی بھی۔ یہ سب کے سب وطن اور عزیزان وطن کو چھوڑے ہوئے، تپتی ہوئی ریگ میں چلچلاتی ہوئی دھوپ میں کشمیر اور شملہ کو چھوڑ کر، سبزہ زاروں اور آبشاروں کو بھلا کر، بھوک اور پیاس کی مشقتیں جھیلتے ہوئے اور گرد و غبار میں غسل کرتے ہوئے کہاں کو چل رہے ہیں؟ رام پور کے حاتم وقت رئیس کلب علی خاں کو کس راستے کی خاک پھانکنے پر فخر تھا؟ بھوپال کی اہل دل فرماں روا سلطان جہاں بیگم کو کس کے آستانے کی گدائی پر ناز رہا ہے؟ مملکت آصفیہ کے تاج دار میر عثمان علی خاں نام دار کے دل کو آج بھی کس کے

کوچے کی آرزوئے جاروب کشی تڑپائے ہوئے ہے؟ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے ابوجہل اور ابولہب کی طرح جلنے والے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک کو اپنی ناپاکیوں اور گندگیوں پر قیاس کر کے مسخ کر کر کے پیش کرنے والے آج کاش اپنے اپنے مٹی کے گھروندوں سے باہر نکل کر دیکھیں کہ اس دور یاجوجیت، اس غلبۂ دجالیت کے باوجود دنیا کی کسی یونی ورسٹی اور کسی کالج میں، کسی جامعہ اور کسی اکاڈیمی میں، کسی کتب خانے اور کسی تجربہ گاہ میں، کسی ''ماہرفن'' کے لکچر روم میں، کسی پروفیسر کے حلقۂ درس میں، وہ کشش اور دل کشی، وہ قوت جذب ہے جو اس مقام میں ہے، جہاں اس امی کا جسد ظاہری آرام فرما رہا ہے جو اپنے رب کی سب سے زیادہ تعریف کرنے والا (احمدؐ) تھا اور جس کو اس کے رب نے ''تعریف کیا گیا'' (محمدؐ) کہہ کر پکارا؟''۔ (ملاحظہ ہو: باب ۸، ص: ۱۰۷ تا ۱۱۰)

آستانہ نبوت پہنچ کر مولانا کی کیفیت دیدنی ہے۔ ان کے اندرونی جذبات کا عکاسی انہی کا یہ شعر ہے۔

اک عمر کی گمراہی اک عمر کی سرتابی
جز تیری غلامی کے آخر نہ مفر پایا

"وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْآ اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَلَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّاباً رَّحِيْماً". (النساء: ٦٤) یہ کسی فقیہ کا اجتہاد نہیں جس پر ردو قدح کی گنجائش ہو، کسی بزرگ کا کشف نہیں جس میں غلطی اور دھوکے کا احتمال ہو، کوئی روایت حدیث نہیں جس کے اسناد میں گفتگو ہو سکے، خدائے پاک کے کلام کی ایک آیت ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ ''ان لوگوں نے جس وقت اپنے اوپر ظلم کیے تھے اے پیغمبر! اگر تمہارے پاس آگئے ہوتے اور اللہ سے اپنے قصور کی معافی چاہتے اور رسول بھی ان کے حق میں معافی چاہتے تو پاتے اللہ کو معاف کرنے والا، مہربان''۔ گویا گناہ گاروں اور تباہ کاروں کو یہ حکم ملا ہے کہ اپنے پروردگار سے معافی طلب کریں، لیکن تنہا اپنے گھروں پر بیٹھے

ہوئے نہیں بلکہ رسولؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر اور ان سے بھی اپنے حق میں دعا کرا کر۔ ظاہر ہے کہ حکم کا براہ راست تعلق کسی ایسے گروہ سے ہے جو حضور انورؐ کے زمانے میں موجود تھا۔ خوش نصیب تھے وہ افراد جنہیں اس حکم پر عمل کی توفیق نصیب ہوئی، جو رسولؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے، جنہوں نے اللہ سے گڑگڑا گڑگڑا کر معافی مانگی اور رسولؐ نے جن کے حق میں سفارش فرمائی، لیکن آج اس چودھویں صدی میں اس امت کا کوئی فاسق وفاجر، بدعمل ونامہ سیاہ اگر حکم "جآء وك" کی تعمیل کرنا چاہے تو کیا اس کے لیے اس سعادت وہدایت کا دروازہ خدانخواستہ قیامت تک کے لیے بالکل بند ہو چکا ہے؟ اور اس کی قسمت میں بجز مایوسی ومحرومی کے اور کچھ نہیں؟''۔

مولانا کا درد وسوز اور عشق رسولؐ میں ڈوبا ہوا سوال:

''موسم گل جب چمن سے رخصت ہو چکتا ہے اور کوئی بوئے گل کا متوالا آنکلتا ہے تو عرق گلاب کے شیشوں اور قرابوں کو غنیمت سمجھتا ہے، پھر اگر آج کوئی بوئے حبیب کا متوالا حکم "جآء وك" کی تعمیل میں، اپنے کو ہزاروں میل کے فاصلے سے دیار حبیب تک پہنچاتا ہے اور اپنے مظالم نفس کی تلافی وعذر خواہی کے لیے اپنے ایمان اور اپنی بیعت کی تجدید کے لیے اپنی تباہ کاریوں پر پشیمانی اور اشک افشانی کے لیے حبیب تک نہ سہی، آستانہ حبیب تک گرتا پڑتا پہنچتا ہے تو کیا اس پر ''بدعت'' و''شرک'' کا فتویٰ لگایا جائے گا؟ جہاں اللہ کے سب سے بڑے پرستار (صلی اللہ علیہ وسلم) نے نمازوں پر نمازیں پڑھیں اور آخری نمازیں پڑھیں، جہاں عبد ومعبود کے راز ونیاز، حیات ناسوتی کی آخری سانس تک جاری رہے، جہاں ہیبت وخشیت سے لرزتے ہوئے گھٹنے خدا معلوم کتنی بار رکوع میں جھکے، جہاں ذوق وشوق سے دمکتی ہوئی پیشانی بارہا سجدے میں گری، جہاں امت کے گنہ گاروں اور سیہ کاروں کے حق میں درد بھری دعاؤں کے لیے ہاتھ اٹھے اور ہلے، جہاں ٹوٹی ہوئی آس والوں کی بے شمار مرتبہ تشفی کرائی گئی، جہاں وہ آج جسد اطہر آرام فرما ہے جس کے طفیل میں آسمان بھی وجود میں آیا اور

زمین بھی، چاند بھی اور سورج بھی۔ اس عظمت وجلال والی، اس برکت اور نورانیت والی زمین پر مقدس مکین کے مقدس مکان پر بھی جبین نیاز کو خم کرنا اگر ''شرک'' و''بدعت'' ہے، تو خدا معلوم کس مقام اور کس مکان پر بھی حاضر ہونا کس آئین ''توحید'' وسنت کے مطابق ہوسکتا ہے؟''۔ (ملاحظہ ہو: باب نمبر ۱۰، ص: ۱۲۱ تا ۱۲۳)

حج کے اس ماجدی سفرنامے میں تاثرات، وجدانیات اور سوز وگداز کی لہریں پوری کتاب میں جاری وساری ہیں۔ گزشتہ صدی کی تیسری دہائی میں اسلامیان عالم کے زوال ونکبت اور زبوں حالی پر شکوہ کناں مولانا عبدالماجد دریابادیؒ جب کعبۂ مقصود اور روضۂ رسولؐ پہنچتے ہیں تو مسلم کلچر اور اسلامی عظمت وشوکت کی باز آفرینی کی ان کی خواہش شدید ہو جاتی ہے اور وہ ایسی بابرکت جگہ پر گویا اپنا دل چیر کر رکھ دیتے ہیں۔ مولانا اپنے احساسات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے آئینے میں امت کی ساری تاریخ کا عکس دکھایا گیا۔ جس رسولؐ پر ایک روز مکے کی زمین تنگ کردی گئی تھی آج اس کی امت پر عرصۂ عالم تنگ ہے۔ رسولؐ کی جان کے دشمن ایک ابوجہل اور ایک ابولہب تھے۔ رسولؐ کی عزت کے، رسولؐ کے پیام کے، رسولؐ کے دین کے دشمن، آج خدا معلوم کتنے ابوجہل اور کتنے ابولہب پیدا ہو گئے ہیں۔ ان مکی دشمنان حق کا خاتمہ ہلاکت وبربادی پر ہوا تھا۔ کیا یہ بیسویں صدی عیسوی کے ''روشن خیال'' اور ''وطن پرست'' ابوجہل وابولہب ہمیشہ مہلت ہی پاتے رہیں گے؟ مکہ کے مہاجر کو اپنے رب کا نام پکارنے، توحید کا کلمہ بلند کرنے کو قبا کا ایک ٹھکانا مل گیا تھا۔ کیا اس محبوب کی امت کی قسمت میں کوئی قبا نہیں؟ اور کیا اسے خدانخواستہ ہمیشہ بھٹکتے ہی رہنے دیا جائے گا؟ (ملاحظہ ہو: باب نمبر ۱۶، ص ۱۹۲۔۱۹۳)

بیت ماجد یعنی کعبۂ مقصود دیکھ کر بندہ ماجد کا قلم یوں وجد میں آتا ہے:

''اللہ اکبر! یہ کون سا گھر سامنے ہے؟ نگاہیں کس گھر کی دیواروں کی بلائیں لے

رہی ہیں؟ یہی تو وہ گھر ہے جس کی بابت کہا گیا ہے "دنیا کے بتکدہ میں پہلا وہ گھر خدا کا" روئے زمین پر سب سے پہلا عبادت خانہ! صدی دو صدی کی تعمیر نہیں، دو ہزار چار ہزار برس کی عمارت نہیں، دنیا کا سب سے پہلا عبادت خانہ! کون تاریخ اس وقت کا پتہ بتا سکتی ہے؟ کس نسل انسانی کا حافظہ وہ زمانہ یاد رکھ سکتا ہے؟ جس گھر کی بنیادیں خود آدمؑ نے اپنے ہاتھ سے رکھی ہوں، بنی آدمؑ میں کون اس وقت کی یاد اپنے حافظے میں رکھ سکتا ہے؟

اللہ اللہ! اس طویل اور بے حساب مدت میں اس ناقابل پیمائش عرصے میں کتنے عبادت خانے بنے اور بگڑے، کتنے مندر تعمیر ہوئے اور کھدے، کتنے گرجے آباد ہوئے اور اجڑے، کیسے کیسے انقلابات زمین نے دیکھے اور آسمان نے دکھلائے۔ بلندیاں پست ہوئیں، اور پستیاں بلند ہوئیں۔ بابل مٹا، مصر مٹا، چین مٹا، ہندوستان مٹا، ایران مٹا، یونان مٹا، رومہ مٹا، خدا معلوم کتنے اُبھرے اور ابھر کر مٹے۔ کتنے بڑھے اور بڑھ کر گھٹے۔ پر ایک عرب کے ریگستان میں خاک اور ریت کے سمندر میں، چٹانوں اور پہاڑوں کے وسط میں، وادیوں اور گھاٹیوں کے درمیان، یہ سیاہ چوکور گھر، جسے نہ کسی انجینیر نے بنایا نہ کسی مہندس نے، جوں کا توں کھڑا ہوا ہے! صدہا طوفان، ہزارہا انقلابات، بے شمار زلزلے آئے اور گزر گئے اور اس پاک اور پیارے گھر کو نہ کوئی ابرہہ مٹا سکا، نہ کوئی زار نکولس، اور نہ کوئی گلیڈ اسٹن! جو اسے مٹانے کو اٹھا وہ خود مٹ گیا، اور اللہ کے گھر میں اللہ کی جو عبادت آدمؑ اور حواؑ نے کی تھی وہی آج آدمؑ کے فرزند اور حواؑ کی بیٹیاں کر رہی ہیں"۔ (ملاحظہ ہو: باب ۲۴، ص ۲۸۷، ۲۸۸)

دیار خلیلؑ پہنچ کر خامہ ماجدی یوں گویا ہوتا ہے:

"مقام ابراہیم کا نام کلام مجید میں دو جگہ آیا ہے، لیکن بغیر حاجی ہوئے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ "مقام ابراہیمؑ" ہے کیا چیز؟ مقام ابراہیم کے لفظی معنی ہیں، ابراہیمؑ کے کھڑے ہونے کی جگہ۔ روایات حدیث میں آتا ہے کہ بیت اللہ کی تعمیر کے وقت جب خانہ کعبہ کی دیواریں اونچی ہونے لگیں تو قدرۃً پاڑ باندھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس

وقت حضرت جبرئیلؑ نے ایک پتھر لا کر رب جلیل کے خلیلؑ کی خدمت میں پیش کیا۔اس پر کھڑے ہو کر اللہ کے گھر کے اس معمار نے کعبہ کی دیواریں بلند کرنی شروع کر دیں۔ جب نیچے سے پتھر گارا وغیرہ اٹھانے کی ضرورت ہوتی تھی تو یہ پتھر خود بخود لچک کر نیچا ہو جاتا تھا اور جوں جوں دیواریں بلند ہوتی جاتی تھیں اور اونچے تک ہاتھ پہنچانے کی ضرورت ہوتی تھی یہ پتھر بھی از خود بلند ہو جاتا تھا۔ یہ پتھر حجر اسود کی طرح آج تک محفوظ چلا آتا ہے، اور بعض روایات میں آیا ہے کہ اس پر اللہ کے خلیلؑ کے قدم مبارک اور انگلیوں کے نشانات تک بنے ہوئے ہیں!--- پتھر کے متعلق یہ تو خیر مشہور ہے کہ وہ اس دنیا کا نہیں جنت سے لایا گیا تھا۔اس کے محفوظ رہ جانے پر اتنی حیرت نہ کیجیے لیکن ابراہیمؑ تو اسی مادی دنیا کے، اسی عالم ناسوت کے، اسی عالم آب وگل کے تھے، ان کی انگلیاں اور ان کے پیروں کے تلوے تو اسی گوشت و پوست کے بنے ہوئے تھے، آخر ان کے نشانات کیسے محفوظ رہ گئے؟ دھوپ کی کیسی کیسی کڑی شعاعیں پڑیں، بارش کس زور زور کی ہوتی رہی، ایک دو دن نہیں، سال دو سال نہیں، ہزار ہا برس تک سارے عناصر اپنا زور دکھاتے رہے، اور وہ نقش نہ مٹے! اتنی طویل مدت میں کون باقی رہا، کلدانیہ کا تمدن مٹ گیا، بابل کا اقبال افسانہ بن گیا، مصری تہذیب خواب وخیال ہو کر رہ گئی۔ رومہ مٹ گیا، یونان مٹ گیا، نہ دارا رہا نہ سکندر، نہ ہنی بال رہا نہ قیصر، نہ چنگیز رہا نہ ہلاکو۔ جن کو گھمنڈ اور دعویٰ تھا کہ ہم سب کو مٹا دیں گے اور خود نہ مٹیں گے، مٹ کر اور ملیا میٹ ہو کر رہ گئے پر ایک خاک کے پتلے کے نقش قدم ہیں کہ وہ کسی کے مٹائے نہ مٹے! وہ خاک کا پتلا اپنے اللہ کا مطیع ہو گیا تھا، کائنات کی ساری قوتیں خود اس کی مطیع کر دی گئیں۔و کذالك نجزی المحسنین۔ (ملاحظہ ہو ص: ۲۹۸ تا ۳۰۰)

رحمت الٰہی کی طلب اور تقویٰ شعاروں کی پیروی میں حج جیسے مقدس اور عظیم عمل کو اپنی نگاہوں میں حقیر سمجھتے ہوئے مسترشد دریابادیؒ نے حجاز مقدس سے واپس ممبئی پہنچتے ہی ۲/جون ۱۹۲۹ء کو اپنے مرشد حکیم الامت اشرف العلماء مولانا اشرف علی تھانویؒ کی خدمت

میں عریضہ ارسال کیا۔ جس میں دیگر باتوں کے ساتھ مرشد تھانویؒ سے یہ استدعا تھی کہ ''للہ دعا فرمایئے کہ ان سب بے ہودگیوں کے باوجود بھی اللہ تعالیٰ اس نمائشی حج کو قبول فرمائے''

اس کے جواب میں حکیم الامتؒ نے فرمایا:

''ان حالات کو آپ بے سروپا اور موجب تاسف فرمار ہے ہیں اور میں ان پر مسرور ہوں۔ اس لیے کہ ان ہی حالات سے یہ حج عاشقانہ ہو گیا ورنہ عاقلانہ ہوتا۔ عاشق کے حصے میں تو مایوسی اور حسرت اور ناکامی اور نامرادی ہی ہے۔ عاشق کو کبھی سیری اور تسلی نہیں ہوتی۔ پریشانی اور پشیمانی کبھی مفارق نہیں ہوتی۔ حج کرکے اگر یہ سمجھا جاتا کہ حج کیا تو عُجب تھا۔ اور اب یہ سمجھنا کہ کیا حج کیا، یہی عبدیت اور فنا ہے۔ اور اگر بالفرض کوتاہی ہے بھی، تو اس کا تدارک استغفار سے سہل ہے اور عُجب کا کوئی تدارک ہی نہیں کرتا۔ اس کا تو پتہ ہی نہیں لگتا'' (ملاحظہ ہو: حکیم الامت، نقوش وتاثرات، باب نمبر ۱۳، ص ۵۷)

مایہ ناز سیرت نگار رسولؐ وادیب سید الطائفہ علامہ سید سلیمان ندویؒ (متوفی ۱۹۵۳ء) اس ماجدی سفرنامے کے دیباچے میں رقم طراز ہیں:

''ہمارے صاحب دل اور درد آشنا دوست مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کی زندگی میں مدت سے بہ تدریج جو انقلاب ہو رہا تھا، میرے خیال میں اس کی تکمیل ۱۳۴۷ھ میں ہوئی، جب وہ سفر کے لیے روانہ ہوئے اور جو احوال ومشاہدات انہوں نے کتابوں میں پڑھے تھے، ان کا سفر حج میں جا کر برائی العین مشاہدہ کیا اور وہاں جو عینی مشاہدات، قلبی کیفیات اور روحانی تاثرات ان پر وارد ہوئے، انہوں نے اپنے اخبار ''سچ'' کے صفحات میں مضامین کی صورت میں منعکس کیا۔ موجودہ مجموعہ انہی مسلسل مضامین کا یک جا ذخیرہ ہے''۔

اسی ''دیباچے'' میں آگے خامہ سلیمانی صدق نگار قلم ماجدی کے مشاہدات، کیفیات، تاثرات اور دیگر خوبیوں کے بیان میں یوں گویا ہے:

اس سے پہلے جو سفرنامے لکھے گئے تھے یا وہ صرف عالم جذبات کی باتیں تھیں یا

محض ایک سیاح ووقائع نگار کے روزنامچے تھے، یا فقیہانہ مسائل اور حج ومناسک کے ہدایت نامے تھے، یا عازمین کے سفرِ حج کے لیے گائڈ بکیں تھیں۔ اس سفرنامے کی خصوصیت ان سب متفرق حیثیتوں کی دل کش جامعیت ہے۔ سفرنامے کے مختلف ابواب اور مباحث میں اس کا مصنف کہیں مؤرخ ہے، کہیں فقیہ، کہیں محدث، کہیں صوفی، کہیں شاعر، کہیں سیاسی، غرض اس کتاب میں وہ سب کچھ ہے جس کی حاجی کو اپنے سفر کے اتار چڑھاؤ کی مختلف حالتوں اور کیفیتوں میں ضرورت پیش آتی ہے۔ سفر کے ان واقعات، حج ومناسک کے مسائل، مختلف مقامات کی دعائیں، سفر کے ضروری ہدایات، حجاز کے ملکی حالات، آمد ورفت اور سفر کے وسائل، سواری، پانی، کرایہ، مکانات، مطوفین، راستے، مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے شہری حالات، امکنہ مقدسہ اور وہاں کے ضروری آداب، یہ تمام معلومات اس میں یک جا ہیں۔

لیکن اس سفرنامے کی اصلی حقیقت اور حقیقی عزت میری نگاہ میں دو باتوں سے ہے۔ ایک اس کی انشا پردازی کہ مصنف کے قلم نے اس میں انتہائی سادگی کا کمال حسن دکھایا ہے۔ سہل الفاظ، سادہ ترکیبیں، اور پھر شاعرانہ تخیل، اس لیے انشا کی حیثیت سے اس کی اہمیت بہت کافی ہے۔ دوسری چیز وہ تاثرات اور وجدانیات ہیں، جو اس کتاب کے فقرے فقرے سے نمایاں ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صاحب دل مصنف نے کاغذ کی سطح پر اپنے دل کے ٹکڑے پھیلا دیے ہیں۔ میں سفر حجاز کی یہ بھی برکت سمجھتا ہوں کہ ان کے قلم نے ان کے دل کی ایسی ترجمانی کی ہے اور روح نے جسم کا ایسا قالب اختیار کیا ہے کہ باطن ظاہر، محجوب منکشف اور نادیدہ دیدنی ہوگیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ فاضل مصنف کی تصنیفات میں ان کے قلم کی یہ سرسری تحریریں سب سے زیادہ دیرپا، سب سے زیادہ سودمند اور سب سے زیادہ مقبول ہوں گی...... انہوں نے یہ صفحات لکھ کر ہماری زبان، ادب، تاریخ، جغرافیہ، فقہ اور تصوف سب پر احسان کیا ہے اور ظاہر و باطن، لفظ و معنی اور روح و جسم کے مختلف مناظر ومظاہر کا ایک ایسا دل کش نظارہ گاہ تیار کیا ہے کہ ہر خیال وذوق کا آدمی اپنے اپنے خیال

وذوق کے مطابق اس سے بہرہ ور ہو سکتا ہے"۔ (ملاحظہ ہو: دیباچہ سفر حجاز، ص ۱۰، ۱۱)

معروف عالم دین مولانا محمد اویس نگرامی ندوی (متوفی ۱۹۷۶ء) سابق شیخ التفسیر دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ "سفر حجاز" کی تعریف یوں کرتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے فضل وکرم سے ۱۹۴۸ء میں حج بیت اللہ اور حاضری مدینہ طیبہ کا شرف عنایت فرمایا۔ کسی ادنیٰ مبالغے کے بغیر عرض کرتا ہوں کہ مجموعی حیثیت سے "حج وزیارت کے اس مکمل ہدایت نامہ" سے مجھ کو جو فائدہ ہوا وہ کسی دوسری کتاب سے نہیں ہوا"۔ (ملاحظہ ہو: "پیش لفظ" ص ۸، از حکیم عبدالقوی دریابادی)

مشہور عربی ادیب وصحافی مولانا مسعود عالم ندویؒ (متوفی ۱۹۵۴ء) نے اپنی کتاب "دیار عرب میں چند ماہ" میں اس ماجدی سفرنامے کی تاثر آفرینی اور سوز وگداز میں ڈوبے ہوئے اسلوب نگارش کا ذکر یوں کیا ہے:

"صبح کو امیر شکیب ارسلان کا سفرنامۂ حج پڑھتا رہا۔ زبان وبیان کی خوبی کے کیا کہنے؟ مگر سوز ودرد کی کمی محسوس ہوئی۔ سفر حج کی رودادیں بہت پڑھی ہیں مگر اب تک دل ودماغ پر جو اثر مولانا عبدالماجد دریابادی کے سفرنامۂ حج کا ہے اسے امیر شکیب کی بلاغت بھی محو نہیں کرسکی" (ملاحظہ ہو: ص ۷۰)

عالم اسلام کے مایہ ناز عالم ومفکر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ (متوفی ۱۹۹۹ء) سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ نے اس سفرنامے کی دل کشی اور دل آویزی ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے:

"۱۹۲۹ء میں مولانا نے حج وزیارت سے فراغت حاصل کی اور وہ سفرنامہ ان کے قلم سے نکلا جو نہ صرف ان کی تحریروں بلکہ ان لاتعداد کتابوں میں جو اس موضوع پر لکھی گئی ہیں امتیاز خاص رکھتا ہے۔ جہاں تک یاد ہے یہ مولانا کی پہلی کتاب تھی جو میں نے بڑے شغف وانہماک کے ساتھ پوری پڑھی۔ پڑھتا تھا اور مولانا کے زور قلم اور البیلے طرز تحریر پر جس میں

ادب اور وارداتِ قلبی کا نہایت حسین اور دل آویز امتزاج ہے جھوم جھوم جاتا تھا۔'' (ملاحظہ ہو: ص ۲۷، ماہنامہ فروغ اردو لکھنؤ، مولانا عبدالماجد دریابادی نمبر، اگست۔ اکتوبر، ۱۹۷۱ء)

حج بیت اللہ کا یہ مقدس سفرنامہ چالیس ابواب پر مشتمل ہے۔ مولانا کے قلم صدق رقم کا یہ شاہ کار اپنے ادبی اور انشائی محاسن کے لحاظ سے تو ہئی ہے قدر اول کی چیز، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ عام آدمی کے لیے بھی باعث تشویق، بہت کارآمد اور لائق مطالعہ ہے۔ یہ سفرنامہ محض حج کا ہدایت نامہ ہی نہیں ہے بلکہ اس میں وہ سب کچھ موجود ہے جس کی ضرورت عام حاجی کو ہوتی ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کا یہ سفرنامہ ۱۹۲۹ء میں ان کے مشہور ہفتہ وار اخبار ''سچ'' لکھنؤ میں قسط وار شایع ہوا اس کے بعد ان کی زندگی میں کتابی شکل میں تین مرتبہ طبع ہوا۔ ۱۹۸۰ء میں ادارہ انشائے ماجدی کولکاتا سے اس کا چوتھا ایڈیشن شایع ہوا۔ برسوں سے یہ کتاب نایاب تھی، ۲۰۰۶ء میں صدق فاؤنڈیشن لکھنؤ نے اسی چوتھے ایڈیشن کا عکس لے کر اس کو شایع کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ آمین

خطبات ماجد یا ہدیہ زوجین - ایک مطالعہ

خاتم الانبیاء رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی رب کریم کی آخری شریعت نے نکاح کو کوئی ضمنی اور ثانوی حیثیت کی چیز نہیں تسلیم کیا ہے۔ یہ تو اس کے احکامات کے مطابق ایک اہم اخلاقی، اجتماعی اور روحانی ادارہ ہے۔ اس کی منفعتیں اور مصلحتیں، فرد اور معاشرے کے لیے بے شمار ہیں۔

مفسر دریابادیؒ کے الفاظ میں:

''شریعت اسلام میں عقد نکاح بجائے خود ایک فضیلت کی چیز ہے کہ بقائے نوع کا مدار ہی اسی پر ہے۔ اور مرد وزن ہر دو جنس کی فلاح و بہبود، مسرت وراحت کا راز ازدواجی زندگی میں ہے۔ حسن معاشرت، حسن معیشت، صحت جسمانی، راحت قلب وسکون خاطر، ہر معیار سے اسلام اپنی امت میں، بیاہے نکاح ہوؤں ہی کو دیکھنا چاہتا ہے، نہ کہ بلاضرورت اور خواہ مخواہ کے مجردوں کو۔ مسیحیت کی طرح اسلام میں عقد نکاح ایک ناگزیر برائی کا نام نہیں''۔ (ملاحظہ ہو: سورۃ النور آیت نمبر ۳۲، تفسیر ماجدی جلد سوم)

اسلامی شریعت میں نکاح کی حیثیت کسی کلچرل یا سماجی تقریب کی نہیں بلکہ ایک عظیم عبادت کی ہے۔ ایک ایسی عبادت جس کے لیے معلم کائناتؐ کا ارشاد ہے: ''النکاح من سنتی'' یعنی نکاح تو میرا طریقہ اور میری سنت ہے۔

مرد وعورت کی باہمی مواصلت کا جائز طریقہ نکاح ہی ہے۔ عقد نکاح سے قبل رسول اکرمؐ کی پیروی میں نکاح کا خطبہ پڑھا جاتا ہے۔ اس خطبے کے الفاظ معلم اخلاقؐ نے

اپنے صحابی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو سکھائے تھے۔ چوں کہ یہ الفاظ رسول رحمتؐ سے ثابت ہیں اس لیے ہمیں ان کے مفہوم، مقصد، ضرورت اور پس منظر سے ضرور واقف ہونا چاہیے تاکہ ان متبرک الفاظ کی معنویت سے ہم پوری طرح آشنا ہوسکیں۔

معنویت وحکمت سے پُر اور افادیت سے مملو یہ خطبہ عربی زبان میں ہے، اس لیے ضروری تھا کہ اس کی مفید، مؤثر ترین تشریح وتفسیر اردو زبان میں کی جائے۔ یہ سعادت مفسر قرآن مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے لیے مقدر ہوئی۔ انہوں نے اپنی بھتیجی اور تین صاحب زادیوں کے عقد نکاح کی محلفوں میں اس خطبہ نبویؐ کی تشریح اپنے مسحورکن اسلوب اور صدق نگار قلم سے اردو میں ایسی کی کہ پڑھتے جایئے اور نکاح کی اہمیت وفضیلت، زوجین کے فرائض اور حقوق کے اسلامی اور شرعی پہلوؤں سے اچھی طرح واقف ہوتے جایئے۔

یہ چاروں خطبے نہایت قیمتی موعظے اور خاص طور پر زوجین کے لیے بیش قیمت ہدایتیں ہیں۔ قارئین کرام کی دل چسپی کے لیے ان خطبوں کا مختصر تعارف ذیل میں درج ہے:

خطبہ اول: یہ خطبہ مولانا مرحوم نے ۳۰ رصفر ۱۳۵۵ھ مطابق ۲۲ رمئی ۱۹۳۶ء بروز جمعہ اپنے برادر بزرگ ڈپٹی کلکٹر مولوی عبدالمجید دریابادی کی دختر محترمہ عابدہ خاتون (وفات: ۱۹ رجنوری ۲۰۰۳ء) کے نکاح کے وقت دیا تھا۔ ان کا نکاح مولانا مرحوم کے بھانجے محترم شیخ محمد قدیر الزماں (متوفی: ۹ رجون ۱۹۸۷ء) فرزند شیخ محمد نعیم الزماں رئیس سندیلہ ضلع ہردوئی کے ساتھ اس مثالی سادگی کے ساتھ ہوا تھا کہ تقریب سے محض ایک گھنٹہ قبل نوشہ اور عروس کو علم ہوا کہ ابھی ان کا نکاح ہونا ہے۔ محفل میں نوشہ کے ساتھ صرف دو آدمی تھے۔ ایک دوست دوسرے خادم۔

خطبہ دوم: مولانائے دریابادیؒ نے اپنی بڑی صاحبزادی محترمہ رافت النساء کے عقد نکاح کے وقت یہ خطبہ پڑھا تھا۔ ان کا نکاح مولاناؒ کے بڑے بھتیجے محترم حکیم

حافظ حاجی عبدالقوی دریابادی (متوفی: ۱۹۹۰ء) فرزند ڈپٹی کلکٹر مولوی عبدالمجید دریابادی کے ساتھ ۱۱ر شعبان ۱۳۵۶ھ مطابق ۱۷ر اکتوبر ۱۹۳۷ء بروز یکشنبہ ہوا تھا۔ سادگی اور خاموشی اس محفل میں بھی ایک مثال تھی۔

خطبہ سوم: مولانا مرحوم نے یہ خطبہ اپنی منجھلی صاحبزادی محترمہ حمیراء خاتون کے نکاح کے وقت دیا تھا۔ ان کا نکاح مولانا مرحوم کے منجھلے بھتیجے محترم حبیب احمد قدوائی (متوفی: ۱۷ر اکتوبر ۲۰۰۰ء) (ریٹائرڈ کارکن یوپی سکریٹریٹ) فرزند ڈپٹی کلکٹر مولوی عبدالمجید دریابادی کے ساتھ ۲۲ر شعبان ۱۳۵۸ھ مطابق ۷ر اکتوبر ۱۹۳۹ء بروز شنبہ ہوا تھا۔

خطبہ چہارم: مولانا مرحوم نے یہ خطبہ اپنی منجھلی صاحبزادی محترمہ زہیراء خاتون کے نکاح کے وقت پڑھا تھا۔ ان کا نکاح مولانا کے منجھلے بھتیجے محترم ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی (ریٹائرڈ ریڈر شعبہ پولٹیکل سائنس مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ اور سابق رکن راجیہ سبھا) فرزند ڈپٹی کلکٹر مولوی عبدالمجید دریابادی کے ساتھ ۷ر ذی الحجہ ۱۳۶۵ھ مطابق ۲۰ر اکتوبر ۱۹۴۶ء بروز یک شنبہ ہوا تھا۔

آیندہ سطور میں ان خطبات کے چند اقتباسات پیش ہیں:

''ہاں تو سن اے بچھڑنے والی اللہ کی بندی اور خود رو رو کر گھر بھر کو رلانے والی امانتِ الٰہی! سن اور سمجھ اپنی اور ہم سب کی ماں عائشہ صدیقہؓ کی حکایت کو۔ اس وقت سے بچنے کی کوئی صورت ممکن ہوتی، تو امت کی لڑکیوں میں اس کی حق دار سب سے بڑھ کر ابو بکرؓ ہی کی بیٹی ہو سکتی تھیں اور یا پھر ان سے بھی بڑھ کر آقائے ابو بکرؓ کی صاحبزادیؓ۔ پھر جب عائشہؓ اور فاطمہؓ کو اسی راہ پر چلنا اور اسی منزل سے گزرنا پڑا، تو دنیا کی کسی اور لڑکی کی بساط کیا ہے؟ ان کی کنیزی تیرے لیے باعث فخر اور جو قدم بھی ان کی پیروی میں اٹھ سکے، تیرے لیے سرمایۂ نجات! آنسو، رنج کے نہیں، خوشی کے بہا، کہ آج پیروی کس کی نصیب ہو رہی ہے! صدیقہؓ کہاں سے کس مرتبے پر پہنچیں! عالم نسوانیت کی سرتاج بن

کررہیں! مبارک ہیں امت کی وہ لڑکیاں، جن پر انؓ کا اور خاتون جنتؓ کا سایہ بھی پڑ جائے! اور پھر تیری قسمت میں تو مہینہ بھی وہی آیا، جو سنہ عیسوی میں حضرت صدیقہؓ کے لیے تھا۔ مبارک تر ہے وہ لڑکی، جس کی زندگی کا نیا دور اس خوش حالی کے ساتھ شروع ہورہا ہو"۔ (ملاحظہ ہو: ص ۱۱)

"جدا ہونے والی صبر و شکر کی پتلی! آج جس سادگی اور جس خاموشی سے یہ بزمِ نکاح ترتیب پا رہی ہے، عجب نہیں کہ اس پر خود غربت و مسکنت کو ترس آ گیا ہو، شادی کی محفل اور اتنی سونی! بیاہ کا گھر اور اتنا سناٹا! دروازے پر نہ موٹروں کا ہجوم، نہ ہاتھی گھوڑوں کی دھوم، نہ ایٹ ہوم کا سامان، نہ دعوتوں کے خوان، نہ ہوم ممبر نہ صوبے کے منسٹر، نہ ضلع کے کوئی اعلیٰ عہدہ دار، نہ قرب و جوار کے کوئی رئیس و تعلقہ دار۔ ڈپٹی کلکٹر کی لڑکی اور ڈپٹی کلکٹر کی پوتی، تو خیر بڑی چیز ہے، چپراسیوں اور پیادوں کی لڑکیاں بھی شاید اس طرح چپ چپاتے سونپ نہ دی جاتی ہوں گی! تجھے حق ہے کہ دل میں اپنی ناقدری کا خیال لائے اور جائز ہے کہ کبھی حرفِ شکایت زبان پر بھی آ جائے۔ لیکن اک ذرا صبر کر، عجب نہیں کہ کسی کی رحمتِ بے حساب کے انوار کی بارش اس سادی مختصر سی مجلس پر ہو رہی ہو اور اس کی قدر اس وقت جا کر کھلے جب دنیا کی ساری روشنیاں گل ہو چکیں، گیس کے ہنڈے اور بجلی کے قمقمے، سارے کے سارے بجھ چکیں اور اعلیٰ سے اعلیٰ موٹر نشینوں کے نام و نشان بھی باقی نہ رہ جائیں!

شریف بچیوں کو پہلا سبق اطاعت کا ملتا ہے، خدمت گزاری کا ملتا ہے، اپنے دل کو مار کر، کچل کر، دوسرے کا جی خوش کرنے کا ملتا ہے۔ شریف لڑکی! سبق کے امتحان کا وقت آ گیا۔ اِدھر نکاح کے دو بول منہ سے نکلے، اُدھر وہ امتحان شروع ہو گیا۔ بھلا دے آج سے، کہ پرورش کن نازوں میں ہوئی۔ بھول جا، کہ آج سے دنیا میں کوئی ناز بردار باقی ہے۔ وقف سمجھ لے آج سے اپنی زندگی، خدمت کے لیے، اطاعت کے لیے، صبر کے لیے۔ زہر میں قند کا مزا حاصل کرنا سیکھ، سوکھی روٹی کے ٹکڑے ملیں تو جنت کے خوان سمجھ۔ پھٹے

پرانے کپڑے پہننے میں آئیں تو زر و جواہر خیال کر۔ زبان درازیاں ہوں تو اپنے کانوں کو بہرا بنا لے۔ آوازے کسے جائیں تو اپنی زبان پر مہر لگا لے۔ کلیجے میں نشتر بن کر ہر چبھنے والے طعنے کو ماں کا لاڈ پیار سمجھ اور ہر چڑھی ہوئی قہر آلود تیوری میں اپنے مقدر کی مسکراہٹ کا جلوہ دیکھ! صبر و ضبط کے ساتھ شکر و اطمینان کے ساتھ، زندگی ساری کی ساری گزار دے، اور دنیا کو دکھا جا کہ اپنے بڑوں کے نام کی لاج رکھنے والیاں، خدائے واحد کی بندیاں، رسول برحقؐ کی باندیاں۔ عائشہؓ و فاطمہؓ کے قدموں پر نثار ہو جانے والیاں، اس چودھویں صدی میں بھی کیسی ہوتی ہیں!''۔ (ملاحظہ ہو: ص ۱۳، ۱۴)

''سسرال جیل خانے کا نام نہیں اور نہ لڑکی شادی کے بعد بیوی سے باندی بن جاتی ہے۔ آسان تھا کہ بجائے خطبے کی ان تصریحات کے، محض اتنا کہہ کر لڑکی کا ہاتھ پکڑا دیا جاتا کہ ''میاں لڑکی نہیں خدمت کو کنیز دی جا رہی ہے''۔ ان الفاظ سے دل، جو پہلے سے بھر آنے کے لیے تیار ہیں ضرور بھر آتے۔ لیکن حقیقت کی ترجمانی نہ ہوتی۔ اسلام میں بیوی کنیز نہیں ہو جاتی بیوی ہی رہتی ہے۔ آتی ہے تو اپنے حقوق لے کر۔ رہتی ہے تو اپنے حقوق پر جم کر۔ سب سے بڑے حکیم اور سب سے بڑے حاکم کا یہ فرمان کس مسلمان تک نہیں پہنچا ہے کہ "عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ"؟ بہ صیغۂ امر بطور حکم ارشاد ہو رہا ہے کہ بیوی کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ، حسن معاشرت قائم رکھو۔ قید کسی خاص عمر، کسی خاص حالت کی نہیں۔ جوانی میں بھی اور بڑھاپے میں بھی۔ وہ حسین و جمیل ہو تو اور حسن و جمال ظاہری سے محروم ہو تو، ڈھیروں مال لے کر آئے جب بھی اور خالی ہاتھ آئے جب بھی---عزت رکھتی ہے، شوہر کی آمدنی پر حق رکھتی ہے، حیثیت و مرتبہ رکھتی ہے۔ لازم ہے کہ لحاظ اس کی عزت کا، حیثیت کا، مرتبے کا رہے۔ "وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِىْ عَلَيْهِنَّ". جیسے مرد کے حقوق عورت کے ذمے ہیں ویسے ہی تو عورت کے بھی مرد کے ذمے ہیں۔ اور کیوں نہ ہوتے جب خلقت دونوں کی ایک رکھی گئی اور خلقت کی یکسانی کا گواہ کوئی دوسرا نہیں خود خالق

کائنات ہے"۔ (ملاحظہ ہو: ص ۱۶)

خطبہ دوم سے:

"وہ جو کل تک بچہ تھا، کھیل رہا تھا، خود گودوں میں کھلایا جارہا تھا، آج داڑھی مونچھوں والا ہے اور محفل کا نوشہ اور سب کی نگاہوں کا مرکز اور عن قریب خود ایک چھوٹے سے خاندان کا افسر بننے والا۔ اور جو ابھی کل تک ننھی بچی تھی، ماں کے گھٹنوں پر بیٹھنے والی، گھٹنیوں کے بل چل رہی تھی، گودوں میں پل رہی تھی، گڑیا کھیلنے والی، خود گھر بھر کی گڑیا تھی، آج قبول کررہی ہیں عملی دنیا کی سب سے بڑی ذمہ داری کو۔ قول دے رہی ہے کہ اب خود دوسروں کو پالے گی، بڑھائے گی، پڑھائے گی، پروان چڑھائے گی، آج سے لڑکی نہیں عورت کہلائے گی! بچپن کی معصومیت دونوں کی رخصت! ایک کے سر پر آیندہ کی فکر، کام کی ذمہ داریوں کا بار! دوسرے کے آنسوؤں کی جھڑی میں خدائے رحمٰن ورحیم سے اپنے نصیب کے کھلنے اور کھلنے کی پکار --- شریک بزم بیاہے ہوئے مرد اور پس پردہ بیاہی ہوئی بیویاں یاد کرلیں، سرد آہوں کے ساتھ وہ گھڑی جب یہ سنہری ہتھکڑی اول اول خود ان کے ہاتھوں میں پڑی تھی"۔ (ملاحظہ ہو: ص ۲۴، ۲۵)

"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰه". اے ایمان والو! ڈرو اللہ سے۔

پہلی بات جو ارشاد ہوئی، غور کر کے سنیے۔ یہ نہیں کہ خوش ہو، آج خوشی کا دن ہے اور مسرت کی گھڑی، بلکہ یہ ہے کہ ڈرو اللہ سے۔ یہ ڈرایا کس چیز سے جارہا ہے؟ کفر وشرک سے تو یہاں مراد نہیں ہوسکتی۔ اس لیے کہ خطاب کافروں سے نہیں، مؤمنین سے ہے اور مؤمن وہ ہے جو ان ہلاکتوں سے پہلے ہی ڈر چکا، جب ہی تو ایمان لایا، یا ایمان پر قائم رہا۔ مراد یہ ہے کہ اللہ سے ڈر پیدا کرو اور ڈرتے رہو اپنے اقوال میں، احوال میں، اپنے اعمال میں! جس نئی زندگی میں آج تم قدم رکھ رہے ہو، اس کا تکیہ، اس کا سہارا بناؤ، اسی

خرف خدا، اسی خشیت الٰہی کو! آیندہ کی ساری مسرتوں اور راحتوں کا راز، یہی خوف خدا ہے۔ ایک مرد ایک عورت دونوں، دنیا کے کاروبار میں ناتجربہ کار۔ ایک زبردست اور مستحکم معاہدہ کررہے ہیں، ایک دوسرے سے اللہ کا نام لے کر۔ اس معاہدے کی کنجی اسی کے نام کی ہے''۔ (ملاحظہ ہو: ص ۲۶)

''عزیزان بزم! دنیا کے سب سے بڑے عالمؐ اور سب سے بڑے معلمؐ اور سب سے بڑے خطیب کا مرتب کیا ہوا خطبۂ نکاح آپ نے سن لیا۔ دین کی شہزادیوں کے عقد میں پڑھا گیا۔ امت کی ماؤں کے جلسۂ نکاح میں سنایا گیا۔ عالم قدس سے نشر ہوا اور قدوسیوں کی وساطت سے ناسوت کی فضا میں پھیلا۔ اس میں کیا ملا؟ شاعری کی رنگینیاں، تخیل کی بلند پروازیاں، الفاظ کی طلسم بندیاں؟ یہ نہ سہی تو ہمارے قیاس ظاہری کے لحاظ سے کم از کم یہ تو ہوتا کہ نکاح کے فضائل کا بیان ہو، ازواج واولاد کا بصراحت اعلان ہو، دولہا دلہن کے لیے مبارک بادیں، عہد الفت و بیان محبت کی قراردیں!......اس کے برعکس یہاں ملا کیا؟ تنبیہ اور وعید، تخویف اور تہدید! گنتی کی چند آیتیں اور ان میں ایک جگہ نہیں چار جگہ اتقوا اللّٰہ کی تکرار!''۔ (ملاحظہ ہو: ص ۲۰)

''لڑکوں کو مبارک باد اس وقت نہیں دی جاتی، جب وہ امتحان کے کمرے میں پرچہ حل کرنے کو داخل ہوتے ہیں۔ مبارک باد کا وقت وہ ہوتا ہے جب کام یابی کا گزٹ چھپ چکتا ہے۔ آج کی محفل کا نوشہ! سن لے کہ یہ وقت عملی زندگی کے سب سے بڑے امتحان میں داخلے کا وقت ہے۔ نکاح کا وقت بلوغ کے بعد ٹھہرایا گیا ہے اور رضامندی معتبر صرف بالغ ہی کی ہوتی ہے۔ لیکن خود بلوغ کے معنی کیا ہیں۔ یہی نا کہ ذمہ داری کا احساس پیدا ہوگیا اور روح وجسم اور قلب ایک عظیم الشان ذمہ داری کے اٹھانے کو تیار ہوگئے۔ نفس خوش نہ ہو کہ عمر بھر کے لیے خدمت کو ایک باندی ہاتھ آ گئی۔ یہ تخیل اور جہاں کہیں کا بھی ہو، اسلام کا تخیل یقیناً نہیں۔ وقت غفلت کے قہقہوں کا، عیش ومسرت کی تالیوں کا نہیں، مقام

قلب سلیم کے ڈرنے اور لرز جانے کا ہے، کہ ایک عظیم الشان امانت سونپی جارہی ہے اور ایک اپنے برابر کی انسانی ہستی کی خبر گیری کا بار سر پر آپڑنے کو ہے! ع

امتحاں گاہ کو تو عیش کی مجلس نہ سمجھ

اب تک صرف کھانا تھا اب کھلانا بھی ہوگا۔ جیسا خود کھایا ویسا ہی کھلانا ہوگا! ان تطعمھا اذا طعمت. اب تک صرف پہننا تھا، اب پہنانا بھی ہوگا، جب اور جس وقت خود پہنا، اسی وقت اور اسی طرح پہنایا بھی۔ و تکسوھا اذا اکتسئت. اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اعتراض وعیب جوئی سے، نکتہ چینی سے، دل شکنی سے زبان روکنی ہوگی۔ و لا تقبح. ارشاد یہ نہیں ہوا کہ جھوٹے عیب نہ نکالے جائیں۔ عیب، سچے یا جھوٹے، کسی طرح بھی نہ نکالے جائیں۔ اور پھر نکتہ یہ ہے کہ کھلانا پہنانا جو کچھ بھی ہو، خیرات کی مد میں نہیں، بھک منگی کی جھولی میں ٹکڑا ڈال دینے کی حیثیت سے نہ ہو، بیوی کا حق اور اپنا فرض سمجھ کر ہو اور ان معاملات کے برتنے کا طریقہ بھی بہتر سے بہتر اور شائستہ سے شائستہ ہو۔ ہمارے اور آپ کے آقاؐ کے اصل الفاظ میں:

الا و حقھن علیکم ان تحسنوا الیھن فی کسوتھن و طعامھن. (ترمذی)

جس نے یہ احکام دیے، ان آداب کی تعلیم دی، اس نے ایک جامع اور مانع معیار انسان کے شرف وبزرگی کا، انسان کے ہاتھ میں دیا ہے۔

ان من اکمل المومنین ایمانا احسنھم خلقا و الطفھم باھلہ. (ترمذی)

مومنین میں کامل ترین ایمان میں وہ ہے جو خلق میں بہترین ہو اور اپنے اہل کے حق میں نرم ترین ہو"۔ (ملاحظہ ہو: ۳۶،۳۵)

خطبہ سوم سے:

"دنیا ہے اور چھٹی صدی عیسوی کے ثلث آخر کی دنیا۔ عالمِ انسانیت، جہل اور نادانیوں میں گرفتار اور فضائے کائنات، شرک اور وہم پرستیوں سے تیرہ وتار۔ رحمت حق

چاہیں یوں خاک سے پاک بنادیتے ہیں اور جسے اٹھانا چاہیں یوں فرش سے عرش پر پہنچادیتے ہیں۔اور پھر صلہ وانعام کو جب عام کرنے اور بخشش کو وقف دو جہاں کردینے پر آئیں تو جو امتحان اپنے خلیل کا ان کے ظرف وہمت کی مناسبت سے لیا، اس کا ایک ہلکا سا خواب، ملت ابراہیمی میں ہر بیٹی کے باپ کو دکھا، اس میں مناسبت مرتبہ خلیل سے پیدا کردیتے ہیں! مقصود تو خود ہی لطف ونوازش کرنی ہے اور شان کریمی کی جھلک دکھانی ہے اور اس کے لیے بہانے کیسے کیسے مہیا کردیے ہیں! ایک وقت میں لطیف بھی اور دلدوز بھی، ایک ہی ساتھ پر درد بھی اور دل نواز بھی!''۔(ملاحظہ ہو: ص ۴۴، ۴۵)

''گناہ گار باپ کی معصوم لڑکی! سپرد کیا اسی حافظ برحق وناصر مطلق کے، جس نے حفاظت کی یوسفؑ کی، کنویں کے اندھیروں میں اور بن یامین کی پردیس کے خطروں میں، جب ایک بزرگ پیغمبر تک بے بس ثابت ہوچکے تھے۔ وہی تیرا محافظ رہے زندگی کی ہر مشکل میں، سفرِ حیات کی ہر منزل میں۔آج بھی صبح زندگی کی کرن پھوٹتے وقت، اور کل بھی شام زندگی کی شفق پھولتے وقت! اس وقت بھی جب کہ تیرے سر پر ہاتھ رکھنے والے بڑے اور ان بڑوں کے بڑے زندہ وسلامت ہیں۔اور اس وقت بھی جب کہ خود تیرا شمار گھر کی بوڑھیوں میں، گھرانے کی نانیوں اور دادیوں میں، اور لڑکپن کی تازگی کی جگہ لے چکیں لٹوں کی سفیدیاں اور چہرے کی جھریاں، اور آج کے دعا گو خطبہ نویس کی ہڈیاں تک خاک میں مل کر خاک ہوچکی ہوں''۔(ملاحظہ ہو: ص ۴۷)

''نکاح اسلام کی نظر میں ایک معاہدہ ہے، ایک طرف سے اطاعت کا، خدمت کا، دوسری طرف حفاظت کا، کفالت کا۔اور دونوں طرف سے محبت کا، امانت کا، رفاقت کا، وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً. ایک نسبۃً ضعیف ونازک مخلوق زبان ہار رہی ہے کہ اپنے کو سپرد کررہی ہوں دوسرے کو۔دوسری نسبۃً قوی اور صاحب اقتدار ہستی قول دے رہی ہے کہ میں قبول کررہا ہوں دوسرے کی ذمہ داری کو۔اور دونوں اس قول وقرار پر گواہ ٹھہرا رہے

ہیں، قطع نظران دو عاقل بالغ گواہوں کے، جن کا تعلق صرف دنیا کے ضابطے سے ہے، خود عالم الغیب والشہادۃ اور اس کی غیبی و شہودی قوتوں کو۔ نہ ہو کہ عمر کے کسی مرحلے میں، حیات منزل کے کسی شعبے میں، غفلت کے کسی لمحے میں، نگاہِ استقامت بھٹکے، قدم ثبات پھسلے۔ مرد چونکہ ٹیم کا کپتان ہے، قوام ہے، بااختیار زیادہ ہے۔ اس لیے قدرۃً خطاب، خطبہ بھر میں براہِ راست مرد ہی سے ہے۔ اور حجۃ الوداع کے مشہور و معروف خطبے میں زبانِ نبوتؐ نے مردوں سے خطاب کی صراحت کردی ہے"۔ (ملاحظہ ہو: ص ۵۳)

خطبہ چہارم سے:

"جنت الٰہی ہے اور اسی کی یہی دل آویزیاں، ملائکہ قدس ہیں اور ان کی یہی زمزمہ سنجیاں، باغ بہشت کا چپہ چپہ انوار الٰہی سے معمور، الطاف کبریائی کا قدم قدم پر ظہور۔ تخلیق ابوالبشر کی ہوتی ہے۔ تشریف آوری، رونق بزم کائنات خلیفۃ اللہ کی ہوتی ہے، آپؑ آتے ہیں۔

جنت میں کس لطف و مسرت کی کمی؟ ہر سمت نعمتوں کی بارش، ہر طرف انوار کی تابش۔ اس پر بھی اپنے دل کا گوشہ خالی پاتے ہیں۔ محسوس ایسا ہوتا ہے کہ جیسے اب بھی کوئی خلا ہے۔ اتمام حجت کے لیے یہ نہیں ہوتا کہ جنت کی لذات مادی میں کچھ بڑھا دیا جائے، سرور روحانی کے سامان میں کچھ اضافہ کردیا جائے، بلکہ تخلیق ہوتی ہے آدمؑ سے ملتی جلتی، لیکن پھر بھی اس سے ذرا الگ ایک اور مخلوق کی۔ توریت میں یہ قصہ ذرا شرح و تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے:

"اور خداوند خدا نے کہا کہ اچھا نہیں کہ آدم اکیلا رہے۔ میں اس کے لیے ایک ساتھی اس کی مانند بناؤں گا۔ اور خداوند خدا نے میدان کے ہر ایک جانور اور آسمان کے پرندوں کو زمین سے بنا کر آدم کے پاس پہنچایا۔۔۔۔ اور آدم نے سب مویشیوں اور آسمان کے پرندوں اور ہر ایک جنگلی جانور کا نام رکھا۔ پر آدم کو اس کی مانند کوئی ساتھی نہ ملا۔ اور

درمیان کوئی روک نہیں..... یہ آخری منزل نظر کے سامنے ہو اور یہ دستور العمل ہاتھ میں، تو صحرائے ہستی کا ہر کانٹا ان شاء اللہ پھول بن کر کھلے گا اور راہ کا ہر پتھر پانی ہو کر بہے گا"۔
(ملاحظہ ہو: ص ٦٦، ٦٧)

مولانا دریابادی کے دوسرے خطبے پر ماہ نامہ فاران کراچی کے مدیر اور معروف مبصر جناب ماہر القادری یہ تبصرہ کرتے ہیں:

"مولانا عبد الماجد دریابادی نے اپنی بیٹی کی شادی پر جو خطبہ دیا تھا، وہ نہ صرف اردو ادب بلکہ عالمی لٹریچر میں اپنی آپ ہی مثال ہے۔ شباب کا زمانہ کس قدر عارضی بلکہ شعلۂ مستعجل ہے ـــــــ صنفی تعلقات کی لذتیں بھی آنی ہیں۔ جوانی چلتی پھرتی چھاؤں ہے۔ جوان بیٹی اور عفت پرورده دوشیزہ کو یہ باتیں سمجھانی کس قدر دشوار، نازک اور خطرناک کام ہے، مگر مولانا دریابادی کا راہ وار خامہ آب گینوں اور دبابوں سے جس احتیاط سے گزرا ہے، اسے کرامت نہ کہیے تو اور کیا کہیے۔ یہ خطبہ زبان وادب کا دستور واخلاق کا منشور ہے"۔ (ملاحظہ ہو: ص ۱۷۸، ماہ نامہ فروغ اردو لکھنؤ، مولانا عبد الماجد دریابادی نمبر)

اس خطبے کا گجراتی اور کئی زبانوں میں ترجمہ ہوا۔

ماجدی خطبات کا یہ مجموعہ پہلی بار ۱۹۷۸ء میں شایع ہوا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۹۷ء میں راقم سطور نے اس کا دوسرا ایڈیشن شایع کیا تھا۔ اب الحمد للہ صدق فاؤنڈیشن کی جانب سے اس کی اشاعت عمل میں آئی ہے۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ (آمین)

محمد علی: ذاتی ڈائری کے چند ورق

ایک مطالعہ

رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہرؒ (۱۹۳۱ء-۱۸۷۸ء) غیر منقسم ہندوستان کے ایسے بطل جلیل تھے، جنھوں نے بیسویں صدی کے ابتدائی ۳۰ برسوں میں ملک کی تاریخ کو اپنی متحرک جدوجہد، اپنے بے مثل صحافیانہ کارناموں، منفرد اسلوب خطابت، صداقت، بے باکی، بے خوفی، اللہ کے دین کی سربلندی کی تڑپ اور صدق گفتاری واجتہادی زاویۂ نگاہ کے حوالے سے متاثر ومنور کیا۔ خصوصاً تحریک خلافت کے باب میں ان کا اور ان کے برادر بزرگ مولانا شوکت علیؒ کا نام ہمیشہ جلی اور روشن الفاظ میں لکھا جاتا رہے گا۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی تحریر کردہ یہ ''ذاتی ڈائری'' اصطلاحی معنوں میں باضابطہ سوانح عمری نہیں کہی جاسکتی کیوں کہ اس میں نہ تو مولانا جوہرؒ کا حسب ونسب اور خاندانی حالات درج ہیں اور نہ ان کی ابتدائی تعلیم وتربیت کا تذکرہ ہی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس کتاب میں مولانا محمد علی جوہرؒ کی دل نواز شخصیت اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ مولانا دریابادیؒ کا صدق نگار قلم اپنی محبوب شخصیت کے تذکرے میں اس خوبی سے جولانیاں دکھاتا نظر آتا ہے کہ اس کے ممدوح کے تمام خدوخال نمایاں ہوجائیں۔ فی الحقیقت کام یاب سوانح نگاری کے لیے یہی ضروری ہے۔

اس ''ڈائری'' کے مطالعے سے مولانا جوہرؒ کے تمسک بالقرآن والسنۃ، اسلام سے

ان کی زبردست فکری وجذباتی وابستگی اوراس سے والہانہ عشق، اس کی تبلیغ واشاعت کی قابل صدرشک دھن، اسلامیان عالم کے تئیں ان کی اخوت ومودت کے بے لوث جذبات، ان کی دینی غیرت وحمیت، حکیمانہ طرزفکراور خطیبانہ حرارت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

کام یاب سوانح نگاروہی ہوتا ہے جو اپنے ممدوح سے ذہنی یگانگت، فکری اتحاد رکھتا ہو۔ اسے اس کی ذات سے دل چسپی اور ہم دردی ہو نیز اس کی نفسیات سے بخوبی واقف ہو۔ یہ ساری باتیں اس وقت ممکن ہیں جب سوانح نگارکواپنے ممدوح کی اچھی طرح رفاقت ومعیت حاصل رہی ہواوراس نے اس کی کتاب زندگی کے تمام گوشوں اور پہلوؤں کا بہ نظرغائر جائزہ لیا ہو۔ مولانا دریابادیؒ کو برس ہا برس مولانا جوہرؒ کی رفاقت ومعیت حاصل رہی۔ انہوں نے مدتوں ان کے ماتحت اور رفیق کار کی حیثیت سے کام بھی کیا۔ اس ''ذاتی ڈائری'' کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا دریابادی اپنے ممدوح کی زندگی کے مختلف گوشوں سے اچھی طرح واقفیت رکھتے تھے۔

مولانا محمد علی کیا تھے؟ ان کی شخصیت کا جوہر اصلی کیا تھا؟ ان کا طرز سیاست کیا تھا؟ دیارِفرنگ میں ان کی تعلیمی زندگی کن مراحل سے گزری؟ ان کا ابتدائی سیاسی کیریئر کیسا تھا؟ مرشد روحانی مولانا قیام الدین محمد عبدالباری فرنگی محلی (متوفی ۱۹۲۶ء) اورسیاسی رہنما موہن داس کرم چند گاندھی (متوفی ۱۹۴۸ء) سے بیک وقت ان کی عقیدت اوروابستگی کے کیا اسباب تھے؟ گاندھی جی ان کے نزدیک کس حیثیت کے حامل تھے؟ صحافت ان کے لیے کس عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ تھی؟ بیسویں صدی مسیحی کی ابتدائی تین دہائیوں میں ملکی سیاست اور عالمی سیاست کس رخ پر تھی اور مولانا جوہرؒ کا اس سلسلے میں کیا ردّعمل تھا؟ انہوں نے عالمی پیمانے پر فرزندان توحید کے اتحاد کا کیسا خواب دیکھا تھا؟ برطانوی سیاست کووہ کس نظر سے دیکھتے تھے؟ ان کا طریقہ قرآن خوانی وقرآن فہمی کیا تھا؟ ان کا رحمٰن دنیا اور رحیم آخرت کی ذات اقدس پر کتنا مضبوط ایمان تھا؟ وہ مالک الملک اور خالق

کائنات کے وعدوں اور رحمۃ للعالمین خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارتوں پر کس حد یقین رکھتے تھے؟ وہ اسلام کی حقانیت اور اس کی عظمت کے اثبات کے لیے کتنے سرگرم رہتے تھے؟ وہ اسلام کی دعوت و تبلیغ اور اشاعت کے لیے کتنے بے چین رہتے تھے؟ عشق الٰہی اور حب محمدیؐ میں وہ کتنا سرشار تھے؟ ان کو خلفائے راشدینؓ اور صحابہ کرامؓ جیسی قدوسی جماعت سے کیسی شیفتگی اور وابستگی تھی؟ دیگر مذاہب پر وہ کیسی نظر رکھتے تھے؟ اپنے احباب و متوسلین سے ان کا طرز سلوک اور طریقہ افہام و تفہیم کیسا تھا؟ وہ جب تک کانگریس میں رہے ان کا طرز عمل کیا رہا؟ اپنے مخالفین کے بارے میں وہ کیا سوچ رکھتے تھے؟ ان کی عائلی زندگی کیسی تھی؟ ان کی اولاد کتنی اور کیسی تھیں؟ مولانا محمد علیؒ کی وفات کے وقت ملک پر اور خصوصاً امت اسلامیہ پر کیا گزری؟ بحیثیت مبلغ اسلام، مفسر وشارح اور مناظر ان کا کیا مرتبہ تھا؟ اپنی عمر کے آخری دور میں خدائے بزرگ و برتر کا وہ اچھا بندہ دو عالم سے خفا تھا تو کس کے لیے؟

ان تمام سوالوں کے جوابات مولانا دریابادیؒ نے مولانا جوہرؒ کے ساتھ اپنی برسوں کی رفاقت و معیت کی روشنی میں دیے ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ یہ تفصیل ''شنیدہ'' نہیں بلکہ تمام تر ''دیدہ'' ہے۔ اس لیے کہ ڈائری نویس مولانا جوہر کے ساتھ تحریک خلافت کے سرگرم رکن تھے اور انہوں نے سارے ہنگامے سبک ساران ساحل کی طرح نہیں دیکھے بلکہ کسی قدر موجوں کے تھپیڑے بھی کھائے ہیں۔

مولانا دریابادیؒ نے اپنی زندگی میں متعدد شخصیتوں سے اثرات قبول کیے جن میں علامہ شبلی نعمانیؒ (متوفی ۱۹۱۴ء) اور لسان العصر اکبر الٰہ آبادیؒ (متوفی ۱۹۲۱ء) سے لے کر مجاہد اعظم شیخ احمد شریف سنوسیؒ (متوفی ۱۹۳۳ء) اور حکیم الامت اشرف العلماء مولانا اشرف علی تھانویؒ (متوفی ۱۹۴۳ء) جیسے جلیل القدر علماء و صلحاء شامل ہیں۔ لیکن ان کی سیرت سازی میں سب سے زیادہ مؤثر اور پائے دار ذات مولانا محمد علی جوہرؒ کی ہوئی۔ اس

سلسلے میں وہ اپنی خودنوشت ''آپ بیتی'' میں رقم طراز ہیں:

''یہ میرے گویا محبوب تھے۔ ان کا نام بچپن سے سننے میں آرہا تھا اور ان کی انگریزی مضمون نگاری اور انشاپردازی کی دھاک شروع سے دل میں بیٹھی ہوئی تھی۔ عمر میں مجھ سے چودہ سال بڑے تھے۔ شخصی تعارف اخیر ۱۹۱۲ء میں ہوا۔ محبت وعقیدت دور ہی دور سے بڑھتی رہی۔ ستمبر ۱۹۲۱ء میں جب یہ دوبارہ اسیر فرنگ ہوئے اور کراچی میں سزایاب تو، زبان ودماغ پر ان کی اخلاقی وروحانی عظمت کا کلمہ رواں تھا اور ان کی ذات شیفتگی درجہ عشق تک پہنچ چکی تھی۔ ۱۹۲۳ء کے آخر سے ختم ۱۹۳۰ء تک قرب واتصال کے موقع کثرت سے حاصل رہیت اور عشق میں ترقی بھی ہوتی رہی۔ ان کی نہ کوئی بات دل کو بری لگتی نہ ان پر کسی حیثیت سے تنقید کرنے کو جی چاہتا۔ یہی جی میں رہتا کہ ان کے قلم اور ان کی انگلیوں کو چوم چوم لوں۔ اسلام اور رسول اسلامؐ سے اس درجہ شیفتگی، اللہ کے وعدوں پر اس شدت سے اعتماد، یہ اخلاص، یہ للٰہیت، تصنع ومنافقت سے اس درجہ گریز، حق کے معاملے میں عزیزوں قریبوں، بزرگوں تک سے بے مروتی اور پھر ایسی فہم وذکا، علم وآگہی، غرض میرے لیے تو ایک بے مثال شخصیت تھی۔ اللہ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔'' (ملاحظہ ہو صفحہ ۳۵۸)

مولانا محمد علیؒ سے اپنے تعلق کا اظہار مولانا دریابادیؒ ایک اور جگہ یوں کرتے ہیں:

''عقیدت دینی، مذہبی، روحانی رنگ کی جس زور وقوت، جوش وولولہ سے حضرت حکیم الامت کے ساتھ ہوئی کسی دوسری زندہ ہستی کے ساتھ نہ تھی۔ لیکن عقیدت سے ذرا ہٹ کر ایک شے محبت بھی ہے۔ یہ محبت اسی جوش وقوت کے ساتھ محمد علیؒ سے تھی۔ گویا ایک مقتدا تھے تو دوسرے محبوب''۔ (ملاحظہ ہو: حکیم الامت۔ نقوش وتاثرات صفحہ ۱۴۴)

''محمد علی - ذاتی ڈائری کے چند ورق'' اسی محبوب ماجدی کی حیات مستعار کے آخری ۱۸ برسوں کی یادوں پر مشتمل ایک دلچسپ اور پُرکیف داستان ہے۔ یہ ''ڈائری'' ماجدی اسلوب کا شاہ کار ہے۔ یاد آفرینی، سلاست بیانی اور شگفتہ نگاری کے سبب یہ کتاب

اردو کے سوانحی ادب میں امتیازی وانفرادی حیثیت کی حامل ہے۔

ایسی البیلی، اثر انگیز، ولولہ خیز اور انقلاب آفریں کتاب کے سلسلے میں مولانا دریابادی کے چند معاصر علمائے کرام اور اکابر ملت کے تاثرات اور تبصرے ملاحظہ ہوں:

مولانا محمد اویس نگرامی ندویؒ (متوفی ۱۹۷۶ء) سابق شیخ التفسیر دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے تاثرات:

''جس کتاب کا مدت دراز سے انتظار تھا، بالآخر اس کا حصہ اول خدا خدا کر کے شایع ہو گیا۔ یہ حصہ ۲۰×۲۶ تقطیع کے ۴۲۷ صفحوں میں آیا ہے۔ اس میں ۱۹۲۷ء تک کے واقعات ہیں اور کل کتاب کے ۶۲ باب اس میں آگئے ہیں۔ عزیزی مولانا محمد اویس ندوی نگرامی سلمہ اللہ ایڈیٹر رسالۂ صبح صادق (لکھنؤ) نے کتاب پڑھتے ہی اپنے تاثرات ایک مکتوب میں یوں قلم بند کیے ہیں۔

''دن کے دس بجے کتاب ملی بوجہ علالت مدرسے نہیں گیا تھا۔ لیٹے لیٹے دیکھنا شروع کیا اور دو بجے ختم کر دیا۔ کیا عرض کروں کہ مجھ پر اس کتاب کا کتنا اثر ہوا۔ دو تین مقامات پر تو بے اختیار رو دیا۔ بیوی قریب ہی بیٹھی تھیں وہ گھبرا گئیں۔ اب وہ خود پڑھ رہی ہیں۔

کتاب اپنے کمالات انشاء سے قطع نظر اسلامی حمیت کے بے دار کرنے کے لیے بہترین نسخہ ہے۔ جس دور کے حالات اس میں مذکور ہیں وہ میرے بچپن سے تعلق رکھتے ہیں۔ کان ان تمام تحریکات سے آشنا ہیں۔ اس لیے عجیب لذت وسرور کے عالم میں پڑھا، اب موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لیے یہ سب واقعات انتہائی حیرت انگیز ہوں گے۔ بہر حال مجھ پر تو اس کتاب کا خاص اثر یہ پڑا کہ اسلامیت کے شعور کو زندہ کرنے کے لیے نئی نسلوں کو اس کتاب کا مطالعہ کرانا ضروری ہے۔ میں نے تو اپنے بچوں کو یہی سمجھا کر کتاب پڑھنے کو دی ہے''۔

مولانا دریابادی اس تاثر کے بعد تحریر کرتے ہیں:

عزیز موصوف نے یقیناً کتاب کو محبت کی آنکھوں سے دیکھا اور حسن ظن کی عینک

سے پڑھا--- بہر حال عاشق کی حکایت میں اتنی کرامت تو ہوتی ہی ہے کہ سننے والے کا دل اس کی طرف بے اختیار کھنچنے لگتا ہے اور محمد علی کے سراپا سوز ہونے میں شک کس کو ہوسکتا ہے؟ محمد علی کی زندگی کی کہانی کا خود اسلام کی ایک تبلیغ بن جانا بالکل قدرتی ہے۔ (ملاحظہ ہو، ص:۲ صدق جدید لکھنؤ، ۱۷ ستمبر ۱۹۵۴ء)

مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ (متوفی ۱۹۵۶ء) سابق شیخ الحدیث جامعہ عثمانیہ حیدر آباد کا تاثراتی مکتوب:

'اکبر نامہ' کے چند ہی روز بعد، اللہ اللہ، اس مست روز الست کا کارنامہ اور وہ بھی آپ کے قلم سے، سامنے آیا۔ جس کے ہر ہر ورق پر جی چاہتا تھا کہ چیخیں مار مار کر روؤں۔ ساری زندگی نذر ناکامی و نامرادی ہوگئی، لیکن اللہ کے اس دیوانے کی نہ ہمت میں فتور ہی پیدا ہوا اور نہ آگے بڑھنے کی جگہ قدم پیچھے ہٹانے کا خیال ہی اس کے دماغ میں کبھی آیا۔ مولانا محمد علی قدس اللہ سرہ کی زندگی کے ایسے مختلف پہلو اس کتاب سے سامنے آجاتے ہیں جن سے دنیا ناواقف ہے۔ مجھ پر تو سب سے زیادہ اثر ان کی دینی فہم کا ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہ این ہمہ وارفتگی فطرتاً وہ فقیہ النفس تھے۔ آپ نے اشاروں اشارے میں ان کے اس ملکہ کا ذکر کیا ہے۔ مگر میرا دماغ، انہی اشاروں سے کیا عرض کروں کہاں کہاں گیا۔ بلکہ اس کا افسوس ہوتا ہے کہ انگریزی ادب وانشا کے ملکۂ فائقہ وراسخہ کے ساتھ یورپ وامریکہ میں اسلام اور اس کے نظام کے پیش کرنے پر ان کا قلم آمادہ ہوجاتا اور مسلمانوں کو حکم راں بنانے کی جدوجہد میں جو وقت ان کا صرف ہوا۔ کاش یہی وقت حکم راں قوموں کو مسلمان بنانے کی طرف متوجہ ہوجاتا، تو شاید ان کی زندگی ہی میں ہم دیکھ لیتے کہ تاریخ فتنہ تاتار کے افسانے کو دہرا رہی ہے اور صنم خانے سے کعبے کی حفاظت کے لیے لوگ فوج درفوج کی شکل میں چلے آرہے ہیں۔ آپ نے چند ہی باتوں کا ذکر فرمایا ہے۔ لیکن ان کی دینی فہم وفراست کی گہرائیوں کا اندازہ لگانے کے لیے وہی کافی ہیں۔

آخر میں آپ کی صلح پسندیا مسالمت آفریں قلم کی داد دیتا ہوں پیرومرید کے تعلقات میں جو الجھاؤ پیدا ہوا، اسی الجھاؤ میں سلجھاؤ کے اسرار پوشیدہ تھے۔اس نازک مسئلے کو میں تو نہیں سمجھتا کہ اتنی کامیابی کے ساتھ کسی اور کا قلم سلجھا سکتا تھا۔اس میں دخل خود آپ کی فطرت اور افتادطبع کو ہے۔فجزاکم اللّٰہ عن المسلمین خیرالجزا .آپ کی فطرت کا یہ صوفیانہ رجحان ہے۔(ملاحظہ ہوصدق جدید لکھنؤ،۲۴رستمبر۱۹۵۴ء)

مولانا شاہ عبدالباری ندویؒ (متوفی ۱۹۷۶ء) سابق پروفیسر شعبہ دینیات، جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد کا مکتوب:

"دوسرے ہی دن دفتر صدق سے ڈائری منگوالی جب تک حرف حرف پڑھ کر آج ختم نہ کرلی، اخبار کے سوا کوئی دوسری چیز نہ پڑھی۔ماشاءاللہ "جوہر" شناسی کا حق ادا کردیا۔

عجب طرفہ تماشا سیرت وشخصیت کی مصوری آپ کے قلم نے فرمائی ہے۔اتنے جوش میں اتنا ہوش۔ایسے دماغ کے پہلو میں ایسا دل۔شدت غیظ وغضب کے ساتھ انتہائی لطف وکرم۔شاہانہ خرچ پر فقیرانہ شان اور سب سے بڑھ کر علی گڑھ اور آکسفورڈ کی آتش نمرود کے اندر سے ایمان ابراہیمؑ کا ظہور۔بڑا ہی نادر اور جمع اضداد۔بس اللہ ہی کی دین!

بہت کم کوئی کتاب زندگی میں اتنے تاثر واستغراق کے ساتھ پڑھی ہوگی، جی نہ چاہتا تھا کہ ختم ہو۔(ملاحظہ ہو:صدق جدید لکھنؤ،ص:۸۔یکم اکتوبر۱۹۵۴ء)

مفکراسلام حضرت مولانا سیدابوالحسن علی حسنی ندویؒ (متوفی ۱۹۹۹ء) سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے تاثرات:

"تحریک خلافت کے عہد شباب کے آخری ایام اور اس کا دم واپسیں اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے عمر اگرچہ کم تھی مگر وہ تحریک اتنی ہمہ گیر، زلزلہ انگیز اور موثر تھی کہ کم سنی کے باوجود اس کے نقوش دل ودماغ پر ابھی تک تازہ ہیں۔اکثر خیال ہوتا تھا اور یہ خیال کرکے قلق ہوتا تھا کہ اس دور کی تصویر تاریخ کے مرقع سے اس طرح گم ہوگئی کہ جس نے نہیں

دیکھا اس کو کسی طرح اس کا تصور نہیں کرایا جا سکتا۔ تاریخ جس پر سکون ماحول میں مرتب کی جاتی ہے اور مورخ جان دار واقعات، پر شور فضا اور پر تلاطم زندگی کو جس طرح بے جان الفاظ میں منتقل کر دیتا ہے، وہ گویا پورے دور کی زندہ تاریخ کو جمل کے اعداد میں لکھ دیتا ہے۔ اس تاریخ کو اس زندگی سے وہی نسبت ہوتی ہے جو بلا شبہ ۷۸۶ کے اعداد کو ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' سے ہے۔ سوچتا تھا کہ تحریک خلافت کے زمانے کی فضا، اس دور کا شور و ہنگامہ، عوام کا جوش وخروش، مسلمانوں کے جذبات، زعمائے خلافت کی بالخصوص علی برادران کی مقبولیت اور بے تاج بادشاہی، ان سب مناظر کا اب کہاں ریکارڈ ہے جو نئی نسل کے لوگوں کو دکھایا جا سکے؟ اس کے لیے تو کوئی ناطق فلم یا کوئی طویل اور مسلسل رکارڈ ہوتا تو اس کا تصور کرایا جا سکتا تھا۔ اسی کے ساتھ مولانا محمد علی کو بڑا مظلوم سمجھتا کہ ان کی کوئی شایان شان سیرت مرتب نہ ہو سکی۔ ان کی سیرت کے لیے ایک مرتب و منضبط تالیف موزوں نہیں ہے جو تسلسل اور سکون قلب کے ساتھ مرتب کی جائے۔ ان کی سیرت نویسی کے لیے قلم وقلب دونوں کی مدد درکار ہے اس میں بھی کسی قدر عدم تصنیف وتالیف کے جامد محدود اصول وضوابط سے سرکشی اور کسی قدر ''شان قلندری'' کی ضرورت ہے یہ شرائط جیسے ایک ''ڈائری'' میں پائے جا سکتے ہیں کسی سوانح عمری یا سیرت وتاریخ میں جمع نہیں ہو سکتے۔

ڈائری میں مجھے اپنی دونوں گم شدہ اور عزیز چیزیں مل گئیں، یعنی اس عہد رفتہ کی بولتی ہوئی تصویر اور اس مرد قلندر کی شوخی تقریر، جرم عشق اور اس کی تعزیر، غرض اس کی زندگی کا پورا جوہر ہے۔ آپ نے شعرائے عمر رفتہ اور عہد طفلی کو بہت یاد کیا ہے اور اس کی بازگشت سے مایوسی ظاہر کی ہے۔ عرب شاعر نے کہا ہے یالیت ایام الصبا تعود آپ نے بھی ایک باب کا عنوان لکھا ہے ع ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا۔ لیکن مجھے تو حقیقتاً اس کتاب کے صفحات میں اپنے بچپن کی تصویر نظر آئی اور کئی مرتبہ ورق الٹنے سے اس عہد کے ٹھنڈے جھونکے آ گئے۔ معلوم نہیں مجھ جیسے اور کتنے لوگوں کا یہی تاثر ہوگا ''بولیں اماں محمد علی کی'' والی نظم نے

تو سماں باندھ دیا اور اس دور کا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ عرصے سے اس محبوب اور اس دور کی سب سے مشہور نظم کے اشعار کی تلاش تھی، اب ''تازہ واردان بساط ہوائے دل'' کو کیا بتلایا جائے کہ اس میں کیا دل کشی تھی اور کس فضا میں یہ پڑھی جاتی تھی۔

اس مصوری و کام یاب عکاسی کے علاوہ کتاب میں اور بہت سی خوبیاں ہیں جو پورے ایک تبصرے اور مضمون کی محتاج ہیں۔ ان میں سے ایک مصنف کا اشخاص اور جماعتوں کے تذکرے میں توازن و اعتدال اور واقعے کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنا، ممدوح کی زندگی کے نازک اور باریک گوشوں کو اجاگر کرنا، تحریر کی بے ساختگی اور کہیں کہیں ادب و انشاء کے ایسے نمونے جو ہماری زبان کے ادبی منتخبات میں جگہ پانے کے قابل ہیں، لیکن کتاب کا سب سے نمایاں وصف ''زندگی'' ہے۔ آپ کی قابل فخر تصنیفات کی ادنیٰ تنقیص کیے بغیر صاف عرض کرتا ہوں کہ آپ کی کتابوں میں یہ سب سے زیادہ جان دار اور موثر کتاب ہے۔ اس کے مختلف اسباب ہیں جن کی تفصیل اس وقت مشکل ہے، لیکن ایک بڑا سبب یہ ہے کہ آپ کو صاحب سیرت سے جتنی محبت اور زندہ تعلق معلوم ہوتا ہے اس نوع کا تعلق (عقیدت و عظمت الگ چیز ہے) ان لوگوں میں سے کسی اور سے نہیں معلوم ہوتا جن کی آپ نے کبھی سیرت و سوانح لکھی ہے۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ صاحب سیرت کی زندگی کا نمایاں اور غالب وصف بھی یہی ''زندگی اور حرکت'' ہے اور آپ نے اپنے نقوش و تاثرات تاثر کے عالم میں لکھے ہیں۔

میرا بس چلے تو ہر عربی مدرسے اور اسلامی ادارہ، تعلیم گاہ کے طلبہ اور نوجوانوں کو یہ کتاب پڑھاؤں، تاکہ ان میں بھی زندگی کی چنگاری، ایمان کی حرارت اور مغربی تہذیب و تمدن سے بغاوت پیدا ہو۔ اس مقصد کے لیے اقبال کا کلام اور محمد علی کی وہ سیرت جو آپ نے ڈائری میں پیش کی ہے جتنی مفید ہے نئے لٹریچر میں میرے محدود علم کے اندر دوسری چیز نہیں۔

(ملاحظہ ہو: صدق جدید لکھنؤ ص: ۸۔ ۱۵/ اکتوبر ۱۹۵۴ء)

مولانا محمد طیب عثمانی ندوی۔ ایڈیٹر 'نقیب' (پٹنہ)، نئی نسلیں (لکھنؤ) کا مکتوب:

محمد علی ڈائری ابھی ختم کی ہے۔ کل ہی ایک صاحب سے ملی تھی، اس شرط پر کہ ایک دن میں پڑھ کر دے دوں، پہلے خیال ہوا کہ اس قدر ضخیم کتاب ایک دن میں کس طرح پڑھ سکتا ہوں لیکن ''حکیم الامت'' پڑھے ہوئے ابھی کچھ ہی دن ہوئے تھے اسے میں نے بڑے ذوق وشوق سے از اول تا آخر چند ہی دنوں میں پڑھ ڈالا تھا۔ اس سے محمد علی کے لیے بھی یہ شرط بشوق قبول کرلی جب پڑھنا شروع کیا تو نہ کھانے کا سوال تھا نہ سونے کا، محمد علی کی کہانی تھی اور آپ کی زبانی، بس لطف آ گیا، ناول کا مزہ آیا، کہیں پڑھتے پڑھتے رو دیا۔ کہیں مسکرایا اور کہیں ہنس دیا۔ کتاب کاہے کو ہے، پھولوں کا ایک گل دستہ ہے۔ عجب باغ و بہار ہے۔

مولانا محمد علی کا زمانہ ہمارے بچپنے سے بھی پہلے کا زمانہ ہے۔ حضرت والد علیہ الرحمۃ اور ہمارے دوسرے بزرگوں نے تحریک خلافت میں بڑے زور شور سے حصہ لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کان بچپن ہی سے ان سے آشنا تھے۔ ''سیرت محمد علی''، ''مضامین محمد علی'' (مرتبہ رئیس احمد جعفری ندوی) وغیرہ اکثر دیکھ چکا تھا۔ لیکن محمد علی: ڈائری پڑھ کر ایسا محسوس ہو کہ جیسے ان کی پوری زندگی خلوت وجلوت دونوں پردہ سیمیں پر آنکھوں کے سامنے پھر گئی اور آج سے پچیس تیس سال پہلے کی سیاسی ودینی تحریکات کا ایک نقشہ سامنے آ گیا---- کتاب کیا ہے، ایک سیاسی دستاویز، حکمت وبصیرت کا نمونہ اور ادب وانشا کا مرقع ہے۔

جی چاہتا ہے کہ علم وادب کا یہ حقیر طالب علم اس کتاب پر جناب کی خدمت اقدس میں ہدیہ تبریک پیش کرے۔ ع

گر قبول افتد زہے عزو شرف!

والسلام مع الاکرام

(ملاحظہ ہو: صدق جدید، ص: ۸، ۲۲؍اکتوبر ۱۹۵۵ء)

ڈاکٹر سید عبدالباری شبنم سبحانی (متوفی ۲۰۱۳ء) اپنے تجزیاتی مضمون ''محمد علی:

ذاتی ڈائری کے چند ورق-ایک انوکھے قائد کی سوانح ایک انوکھے انشاپرداز کے قلم سے''۔
میں تحریر کرتے ہیں:

''محمد علی-ذاتی ڈائری کے چند ورق'' مولانا عبدالماجد دریابادی کو اس صدی کے سب سے ممتاز سوانح نگاروں میں شمار کرنے کے لیے کافی ہے۔ یہ ایک عجیب کتاب ہے جو ایک عجیب شخصیت پر عجیب والہانہ مگر سائنٹفک انداز سے لکھی گئی ہے۔ اسے دیکھیے تو بغیر پس وپیش یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے انگریزی ادب کی اٹھارہویں صدی کے شہرۂ آفاق سوانح نگار جیمس باسویل کی ممتاز تصنیف ''دی لائف آف ڈاکٹر جانسن'' کو بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ اس دل چسپ سوانح میں جسے مصنف نے ''ذاتی ڈائری کے چند ورق'' کا عنوان دیا ہے، ہمیں ایک قیامت خیز، انقلاب آفریں، زندہ و متحرک ہستی کا نہایت جیتا جاگتا پیکر صفحۂ قرطاس پر متحرک، سیماب پا مضطرب و بے قرار نظر آتا ہے۔ جس طرح باسویل نے ڈاکٹر جانسن کی تحریروں، تقریروں، مجلسی گفتگوؤں، مذاکروں و مکالموں کی مدد سے ایک نہایت دل نواز و دل کش پیکر کو ہمارے سامنے لا کھڑا کیا ہے اسی طرح مولانا دریابادی کے طلسم آفریں قلم نے بھی اس صدی کے انوکھے قائد کی بازیافت کی ہے۔ مولانا ماجد کی خوش قسمتی ہے کہ ان کا ہیرو باسویل کے ہیرو سے کئی گنا زیادہ قد آور، درّاک، فعال اور دل کش ہے۔ مولانا عبدالماجد نے اپنے پیر و مرشد مولانا اشرف علی تھانوی کی اس سے کہیں زیادہ ضخیم، بھرپور، معلومات افزا اور نوک پلک سے درست سوانح لکھی ہے، مگر وہ ''محمد علی-ذاتی ڈائری'' کے مقابلے میں ایسی ہی ہے جیسے کہ حالی کی ''یادگار غالب'' کے سامنے ''حیات جاوید''۔ ''یادگار غالب'' کی طرح ''محمد علی-ذاتی ڈائری کے چند ورق'' بے حد تاثیر انگیز، سائنٹفک اور ادبی چاشنی سے بھرپور تصنیف ہے۔ (ملاحظہ: ہوسہ ماہی کاروان ادب لکھنؤ، بابت اکتوبر-دسمبر ۱۹۹۶ء، جنوری-مارچ ۱۹۹۷ء، ص: ۲۱۷)

ذیل میں گوناگوں خوبیوں سے معمور اس دل کش کتاب کے کچھ اقتباسات پیش ہیں:

مولانا دریابادی اس ''ڈائری'' کے دیباچے میں رقم طراز ہیں:

''رئیس الاحرار مولانا محمد علیؒ ماضی قریب میں (یہ ''قریب'' و ''بعید'' اضافی ہی مفہوم رکھتے ہیں) مسلمانان ہند کے سب سے بڑے سردار تھے۔ مجھے ان سے شرف نیاز وسط ۱۹۱۲ء سے ان کی آخری عمر یعنی ختم ۱۹۳۰ء تک، کہنا چاہیے کہ ۱۷، ۱۸ سال کی مدت تک حاصل رہا۔ آیندہ صفحات میں میں نے اپنے اتنے دن کے تاثرات ومشاہدات کو یک جا اور قلم بند کردینے کی کوشش کی ہے۔ ان کی مستقل سیرت یا سوانح عمری ایک بالکل الگ چیز ہے۔ کوئی صاحب اس ''ذاتی ڈائری'' کو اس کا بدل یا قائم مقام نہ خیال فرمالیں''۔ (ملاحظہ ہو: ص: ۱۵)

مولانا دریابادی مولانا محمد علی کی اولین زیارت اور دیدار کا بیان کرتے ہیں۔ موقع تھا مسلم یونی ورسٹی کی کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کے اجلاس اگست ۱۹۱۲ء کا۔ مولانا جوہر اس اجلاس میں شرکت کے لیے لکھنؤ تشریف لائے تھے۔ مولانا دریابادی ان کی دید کے شوق میں اجلاس گاہ راجہ صاحب محمود آباد کے قصر قیصر باغ پہنچے۔ وہاں کی منظر کشی مولانا کے الفاظ میں:

''کمیٹی کے سامنے وقت کے بڑے بڑے اہم اور نازک مسئلے چھڑے ہوئے اور ملت کے دل ودماغ کا عطر جیسے کھینچ کر یہیں آگیا ہے۔ سر راجہ صاحب (نام، جس سے کم ہی لوگ واقف ومانوس تھے، علی محمد خاں) وسیع ڈرائنگ روم کے صدر میں تشریف فرما۔ سامنے ایک بڑی لمبی میز، دورویہ کرسیوں کی قطار۔ میز کی ایک سمت میں ایک جوان رعنا، تن درست وتنومند، کوئی ۳۳، ۳۴ سال کی عمر کا، اعلیٰ درجے کے انگریزی سوٹ میں ملبوس بیٹھا ہوا۔ داڑھی تازی منڈی ہوئی، مونچھیں ذرا گھنی اور نوکیلی۔ ذہانت بشرے سے ٹپکتی ہوئی، شوخی وذکاوت چہرے سے برستی ہوئی۔ ممبروں میں سے ایک سے ایک قابل وفاضل۔ اس کے بڑے اور مخدوم بھی۔ لیکن نظریں بار بار اسی کی طرف اٹھ رہی ہیں اور کان اسی کی آواز پر لگے ہوئے۔ وہ بولا تو سب سننے لگے۔ وہ اٹھا تو کوئی ہنسا اور کوئی بگڑا، مگر متوجہ سب ہی ہوگئے یہ تھا کامریڈ کا شہرۂ آفاق ایڈیٹر محمد علی، رام پور کا باشندہ اور علی گڑھ

اور آکسفورڈ کا گریجویٹ۔ جس کی جادونگاری اور انگریزی انشا پردازی کا سکہ اس وقت بھی دلوں پر بیٹھ چکا تھا، حال آں کہ ''کامریڈ'' کو نکلے ہوئے ابھی سال ڈیڑھ سال کا عرصہ ہوا تھا اور اردو روزنامہ ''ہم درد'' کا ابھی وجود بھی نہ تھا''۔ (ملاحظہ ہو: باب ۱، ص: ۱۷، ۱۸)

اجلاس کے بعد شام کا منظر:

''دن کی میٹنگ اگر خواص کی مجلس تھی، تو شام کی یہ تقریب ایک دربار عام۔ اسلامی ہند کے چُنے ہوئے لیڈر اور مشاہیر عوام کے درمیان ایک جگہ مجتمع، آزادی اور بے تکلفی کے ساتھ ہنس بول رہے ہیں، لیکن بارات کا دولہا اس وقت بھی ''کامریڈ'' کا ایڈیٹر ہے۔ سج دھج صبح سے اس وقت بالکل مختلف، بجائے ہیٹ اور انگریزی سوٹ کے، سر پر ترچھی رام پوری پگڑی، جسم پر باریک ونفیس انگرکھا، چوڑی دار تنگ موری کا پاجامہ، دلی کا جوتا۔ محمد علی اپنی زندگی کے اس دور میں بھی صاحبیت میں یک سر غرق نہیں ہوئے تھے۔ معاشرت میں فی الجملہ مشرقیت واسلامیت اس وقت بھی ملحوظ رکھتے تھے ملنے اور بات چیت کرنے کی ہمت تو کیا ہوتی، دل اسی سے نہال ہوا جا رہا تھا کہ اتنے قریب سے دیکھنے اور گفتگو سننے کا موقع تو مل گیا۔'' کامریڈ کی سحر نگاری سے مسلمان تو مسلمان، کالج کے ہندو لڑکے بھی متاثر تھے۔ ان کے سامنے محمد علی کا نام لے کر فخر کرنے کے لیے یہ کچھ کم تھا''۔ (ص: ۱۹، ۲۰)

۱۹۱۶ء میں جب مولانا دریابادی تشکیک والحاد کے بحر ظلمات میں سرگرداں تھے، اسی زمانے میں نفسیات اجتماعی پر ان کی انگریزی کتاب سائیکالوجی آف لیڈرشپ (Psychology of Leadrship) لندن سے شایع ہوئی۔ ان دنوں مولانا محمد علی جوہر چھندواڑہ میں نظر بند تھے۔ مولانا دریابادی نے ان کی خدمت میں اپنی کتاب برائے تبصرہ بھیجی۔ مولانا جوہر نے کتاب پر مفصل تبصرہ کیا۔ خاص بات یہ ہے کہ مولانا دریابادی اور مولانا جوہر میں اس وقت خط وکتابت انگریزی زبان میں ہو رہی تھی۔ تبصرہ بھی انگریزی میں تھا۔ مولانا نے اس کا اردو ترجمہ ''ڈائری'' میں دیا ہے۔ مولانا جوہر کے

تبصرے کے اقتباسات ذیل میں درج ہیں:

''کتاب مصنف کی جس غور وفکر، وسعت مطالعہ اور زبردست قوت مشاہدہ کی شہادت دے رہی ہے، اس کے لحاظ سے میں داد دیتا ہوں۔ ہمارے پڑھے لکھوں سے غور وفکر کی طرح ذوق مطالعہ بھی عنقا ہوگیا ہے..... میرا خیال ہے کہ آپ کو مقصود میری ''تقریظ'' نہیں بلکہ ''تنقید'' ہے..... آپ یقین کیجیے کہ میں عموماً مطالعہ بہت آہستہ آہستہ کرتا ہوں اور آپ کی کتاب کا بغور مطالعہ تو میں نے کئی دن میں کیا۔ بہرحال میرے منتشر نوٹ حسب ذیل ہیں:

۱۔ **عبارت**: موجودہ فلسفیانہ زبان پر آپ کو جو قدرت بلکہ عبور حاصل ہے، اس پر دلی مبارک باد پیش دیتا ہوں۔ بیان ہر جگہ صاف ہے اور جو شخص نفسیات جدید سے واقف ہے اسے آپ کے مفہوم کے سمجھنے میں کہیں بھی دقت نہیں ہوسکتی۔ لیکن اس ضرورت کو تو آپ بھی نظر انداز نہیں کر سکتے کہ پڑھنے والوں کی ایک تعداد اہل ''اجتماع'' کی بھی ہوگی اور آپ ان ''عوام'' کی داد وتحسین سے خواہ کتنے ہی بے نیاز ہوں، لیکن ان کی ضرورتوں سے تو آپ قطع نظر نہیں کر سکتے۔ اور ان کی ضرورتوں کا تقاضہ یہ ہے کہ زبان میں مصطلحات ذرا کم استعمال کیے جائیں، یا یوں کہیے کہ نفسیاتی زبان کے ساتھ ساتھ توضیحات اور مثالوں کا حصہ ذرا زیادہ ہو۔

۲۔ **مغز**: مغز کے لحاظ سے میں سمجھتا ہوں کہ اجتماع سے تو آپ نے بڑی تفصیلی بحث کی ہے، لیکن ''قائدین'' (لیڈروں) میں اُسی قدر اجمال سے کام لیا ہے..... کتاب کی نظر ثانی کے وقت، میں آپ سے پُر زور سفارش کرتا ہوں کہ لیڈروں کے متعلق اپنے اس تناسب کو بدل دیجیے۔ کتاب کا یہ حصہ زیادہ تفصیل کا مستحق ہے اور اس حصے میں مزید شرح وبسط کی گنجایش ہی نہیں، ضرورت بھی ہیں۔

۳۔ **اجتماع**: اجتماعات سے متعلق آپ کے نظریات سے اجمالاً متفق ہوں، لیکن یہاں بھی مزید تفصیل وتقسیم کی ضرورت تھی..... مجھے آپ سے توقع یہ تھی کہ آپ مختلف

اجتماعات کی مختلف نفسیتوں پر نظر رکھیں گے۔ مومنین کی وہ آزاد جماعت جو (حضرت) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ۲۳ سالہ مدت نبوت اور خلافت راشدہ کے ۳۰ سالہ زمانے میں موجود رہی، ایک ایسے ہی اجتماع کی مثال ہے جو اپنے قائدین کی سلیم ترین منبع ثابت ہوئی۔ کیا (حضرت) عمرؓ کے متبعین میں کبھی بھی ایسا ہوا ہے کہ نکتہ چیں نہ رہے ہوں۔

۴۔ **قیادت**: آپ کے فحوائے کلام سے یہ متبادر ہوتا ہے کہ قیادت جس کا نام ہے وہ محض ایک تسلسل ہے چال بازیوں اور فریب کاریوں کا، احمق عوام الناس کے احمق بنائے جاتے رہنے کا..... کتاب کا یہ حصہ بہت ہی سرسری ہے اور اتنا مجمل ہے کہ مطالعہ نفسیات میں اس سے مدد نہیں مل سکتی۔

۵۔ **نظائر**: مثالیں اور نظیریں، جیسا میں پہلے کہہ آیا ہوں میری رائے ناقص میں کافی تعداد میں موجود نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی تقسیم بھی نامساوی و نامتناسب ہے۔

۶۔ **پیغمبر خداؐ کا ذکر**: میری تنقید کا آخری عنوان آپ کے ان تذکروں سے متعلق ہے جو آپ نے پیغمبر خداؐ اور قرآن مجید کی تمثیل لاتے وقت کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ سچے اور حقیقی مسلمان ہیں۔ اس بنا پر مجھے سخت حیرت ہو رہی ہے کہ آپ نے ایسی مقدس شخصیت اور ایسی مقدس آسمانی کتاب کا ذکر کس ہلکے پن سے کیا ہے۔ کیا آورد اور تصنع اپنی ''ناطرف داری'' اور ''خالص علمی تحقیق'' کے اظہار کے لیے ہے یا کیا؟

.....میرا شکریہ قبول ہو کہ آپ نے ایسا تحفہ مجھے دیا جس کے باعث مجھے بھی بہت کچھ غور کا موقع مل گیا''۔ (ملاحظہ ہو: ص: ۱۴۱ تا ۱۵۰ باختصار باب ۶)

اس تبصرے پر مولانا دریابادی لکھتے ہیں:

''کتاب پر تبصرے بہتوں نے کیے تھے، اچھے اچھے پیشہ ور تبصرہ نگاروں نے بھی۔ محمد علی کا تبصرہ، سب سے بڑھ چڑھ کر رہا۔ کوئی دوسرا ریویو اتنا جامع نہ تھا، نہ اتنا مفصل، نہ اتنا گہرا، نہ اتنا مبصرانہ، نہ اتنا پُر مغز، نہ اتنا مخلصانہ، نہ بے جامداحی نہ خوامخواہ کی

تنقیص، اور فنی پہلوؤں سے قطع نظر کیجیے تو تبلیغ کا انجکشن شروع سے آخر تک جا بجا موجود!'' (ملاحظہ ہو: ص۵۲، باب ۷)

مولانا دریابادی نے مولانا محمد علی کو اس تنقید نامے کا جو جواب لکھا اس میں یہ بھی ذکر تھا کہ ''اب انگریزی میں ''نفسیات قرآنی'' (سائیکالوجی آف دی قرآن) پر لکھنے کا ارادہ کر رہا ہوں''۔ اس کے جواب میں مولانا جوہر نے جو مفصل مکتوب لکھا اس کا ایک اقتباس:

''....غالباً آپ نفسیات القرآن سے یہ ثابت کرنا چاہیں کہ بڑے سے بڑا Psychologist بھی انسانی نفسیات کے اسرار و نکات سے نہ اس طرح واقف ہو سکتا ہے نہ ان کے اظہار کے لیے الفاظ اور ترکیبیں اور فقرے کسی زبان میں پا سکتا ہے، جس طرح خود اس ذات پاک نے قرآن کریم میں ظاہر فرما دیا ہے، جو عالم الغیب والشہادہ اور انسان کا پیدا کرنے والا ہے۔ اگر آپ کا یہ خیال ہے، تو میدان نہایت وسیع ہے مگر رہرو کو ہر قدم پھونک کر اٹھانا پڑتا ہے۔ میں ہرگز ان لوگوں کے طرف داروں میں نہیں ہوں جو کلام ربانی سے اس درجے خائف ہو جائیں کہ اسے کبھی سمجھ کر پڑھنے کی کوشش کریں نہ اس کے متعلق کچھ سوچیں، نہ پوچھیں پچھیں۔ کلام پاک ریشم کے جزدانوں اور الماری کے بالاترین حصوں اور وہاں کے گرد و غبار کے لیے آسمان سے نازل نہیں ہوا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ قرآن پاک کا ہر ایک نسخہ اس کثرت سے مستعمل ہو کہ پنسل کے نشان، کاغذ کی پٹیاں، بین الاوراق یہاں تک کہ انگوٹھے اور انگلیوں کے نشان ہر جگہ نظر آئیں اور ثابت کر دیں کہ اس کتاب سے زیادہ اس کے ماننے والے کسی کتاب کو نہیں پڑھتے، نہ اس سے زیادہ کسی کتاب کے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر مجھے ان لوگوں سے ہم دردی ضرور ہے جو قرآن کو نہایت احتیاط و اہتمام کے ساتھ چھوتے ہیں، گو برس دو برس میں ایک ہی دفعہ کیوں نہ ہو۔ یہ ام الکتاب ہے اور اس کا ادب باقی رکھنا اس لیے لازم ہے کہ اگر اتنی احتیاط نہ برتی جائے تو تحریف کا اندیشہ ہے۔

...... مجھے امید ہے جو کچھ بھی آپ لکھیں گے، آداب قرآن کو ملحوظ رکھیں گے۔ مگر لکھیے ضرور۔ اس سے ہرگز نہ خائف ہوجیے، یہ تو ایسی سیدھی سادی کتاب غیر ذی عوج ہے کہ عرب کے گنوار مدینہ منورہ جاتے اور نبی اکرمؐ سے اسے سنتے اور ہم سے کہیں زیادہ سچے اور پکے مسلمان بن کر اپنے بالوں والے خیموں اور ریگستان اور اپنے گلوں میں واپس آجاتے''۔ (ملاحظہ ہو: ص ۵۷، ۵۸، باب ۷)

اس کے بعد مولانا دریابادی نے مولانا جوہر کو یکے بعد دیگرے تین خط لکھے۔ ایک خط میں لکھا:

''آپ میری زیر نظر ''نفسیات القرآن'' (سائیکالوجی آف دی قرآن) میں مجھ سے کسی مولویت یا اسلامیت کی توقع کیوں رکھتے ہیں، میں تو قرآن کے فلسفے پر (نعوذ باللہ) اسی طرح لکھوں گا جس طرح یونان اور یورپ کے بڑے بڑے فلسفی ارسطو یا کانٹ پر لکھا جاتا ہے۔ یہ بھی مسرت کے ساتھ ذکر تھا کہ مشہور برطانوی صحافی سر ویلنٹائن شیرول (Chirol) نے سائیکالوجی آف لیڈرشپ پر اچھی رائے لکھ کر بھیجی ہے''۔

مولانا جوہر ۱۰ر نومبر ۱۹۱۶ء کو اس کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سائیکالوجی آف لیڈرشپ پر میں تو اپنی رائے دے چکا ہوں۔ سر ویلنٹائن شیرول ایک خبیث و بد باطن شخص ہے، نہ معلوم اس کی تعریف کی آپ نے کس طرح وقعت کی۔ وہ ہمارے لیے غلامی اور اپنے لیے خواجگی ہی کو پسند کرتا ہے''۔

اسی خط میں مولانا جوہر مولانا دریابادی کو یہ مشورہ دیتے ہیں:

''اگر آپ اس طرح لکھیں کہ اپنا ایمان مقدمۂ کتاب میں واضح ہوجائے اور محض Faith کی تشریح اصل کتاب میں جس سے خود آپ کے قلب کی لوح سادہ پر بہ تدریج ایمان وعقیدہ منقش ہوگیا، تاکہ ناطرف دار تو ناطرف دار خود مخالفین کے دلوں پر کفر وشرک کے نقوش دھندلے پڑتے جائیں اور بہ تدریج مٹ جائیں اور پھر اس ورق

سادہ پر آپ کی کتاب کلمہ لا الہٰ الا اللہ محمد رسول اللہ جلی حروف میں لکھ دے تو میں واقعی آپ کی نفسیات کی قدر کروں گا"۔

اسی مکتوب میں مولانا محمد علی مولانا دریابادی کو اس طرح تبلیغ کرتے ہیں:

"برادرم! ایمان ہر شے پر مقدم ہے اور میرا خیال ہے کہ جب مسلمانوں نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو خلیفۂ اول بنایا تو دراصل اس امر کا اعتراف کیا کہ ایمان ابوبکرؓ، عدل عمرؓ، غنا و حیائے عثمانؓ اور فقر و شجاعت علیؓ سے بھی زیادہ قابل قدر تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب آفتاب محمدیؐ بہ تقاضائے بشری ۲۳ سال کی نبوت کے بعد غروب ہو گیا اور سارے عالم پر اندھیرا سا چھا گیا تو جو لوگ ہر امر میں اس شمع ہدایت کی روشنی کے عادی ہو گئے تھے، خدا کی دی ہوئی آنکھیں بھی گویا کھو بیٹھے اور بعض مؤلفۃ القلوب کے ارتداد اور زندیق ہو جانے سے ان کے ایمان بھی تھوڑی دیر کے لیے معرض خطر میں آ گئے۔ یہاں تک کہ حضرت عمرؓ کو سوائے اس کے کچھ نہ سوجھا کہ تلوار نکال کر کھڑے ہو گئے اور چلّانے لگے کہ اگر کسی نے کہا کہ (حضرت) محمدؐ (روحی فداہ) قضا کر گئے تو اس کی قضا اسی وقت اسی تلوار کے ذریعے اس تک پہنچ جائے گی۔ ایسے وقت میں وہ آمنا وصدقنا کہنے والا آیا اور اس نے ایک بدیہی امر اُن سراسیمہ اور پریشان لوگوں کو جتلایا۔ آفتاب محمدیؐ غروب ہو گیا تھا مگر خدا کا شمار آفلین میں نہ تھا۔ آفتاب اسلام اسی طرح درخشاں تھا۔ بھائی، یہ سب ایمان کے کرشمے تھے۔ یہ فطرت صدیقی تھی، اگر کچھ کمی تھی تو اس امین اعظمؐ کے ایمان نے پوری کر دی تھی۔ جب غار ثور میں ابوبکرؓ کو بتایا گیا تھا کہ وہاں سینکڑوں دشمنوں سے خائف اور مارے ڈر کے غار میں چھپے ہوئے صرف دو بندگان خدا ہی نہ تھے، بلکہ ایک تیسرا اور بھی وہاں موجود تھا، جو ان دونوں کا نگراں و نگہ بان تھا۔ ان اللہ معنا کی تعلیم کے بعد ایمان ابوبکرؓ پختہ ہو گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ امین کی خلافت صدیقؓ کو ملی۔

.....غزالی کا فلسفہ مجھ سے زیادہ آپ نے پڑھا ہوگا۔ ان کی احیاء العلوم کا

اگر ترجمہ فرانسیسی زبان میں ہو گیا ہوتا تو ڈیکارٹ کو دنیا چور سمجھتی۔ مگر ان کی خود تصنیف کردہ سیرت بلکہ سوانح قلبی و دماغ کو ملاحظہ فرمایئے، آخر میں اسی کا اعتراف ہے کہ اصل وہی مشاہدہ ہے جو حسیات ظاہرہ سے مستغنی اور استدلال و حجت سے بے نیاز ہے''۔ (ملاحظہ ہو: ص ۷۱-۷۴، باب ۹)

اسی طویل جوابی مکتوب میں مولانا جوہر مولانا دریابادی کے قلب و ذہن کو اس طرح بے دار کرتے ہیں:

''آپ کو تو بفضلہٖ تعالیٰ خدا اور رسولؐ کا انکار نہیں ہے۔ برائے خدا اور رسولؐ اپنی عقل و تمیز، علم و تحقیقات کو اسلام اور صرف اسلام کے لیے وقف کر دیجیے اور اس دانش حاضر کے حجاب اکبر میں مستور و محجوب نہ رہیے۔

آپ نے مارگولیتھ کا ذکر فرمایا ہے۔ میں وہ بدنصیب ہوں کہ اس مردود و خبیث و لعین سے آکسفورڈ میں عربی پڑھی ہے۔ عربی اس کی مادری زبان ہے (مارگولیتھ کی ماں ایک شامی عورت تھی) قابلیت علمی بے شک بہت رکھتا تھا مگر دشمن اسلام ہے اور سب سے زیادہ زہر آلود کتاب سیرۃ النبیؐ پر اسی لئیم کی تصنیف کردہ ہے۔ مجھے خوف ہے کہ ہمارے لٹریری نوجوان اس کے پھندے میں آ کر نبی امیؐ (روحی فداک یا رسول اللہؐ) کو عرب کا بطل اعظم نہ سمجھنے لگیں اور رحمۃ للعالمینؐ کے خدائی لقب سے محروم نہ کر دیں''۔ (ملاحظہ ہو: ص ۷۸، باب ۹)

۱۹۲۰ء کی آخری سہ میں مولانا محمد علی جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاسیس، نصاب تعلیم اور تدریس میں مشغول ہوئے۔ انہوں نے جامعہ میں فلسفے کی تدریس کے لیے مولانا دریابادی کو خط لکھا۔

ڈائری نویس رقم طراز ہیں:

''مہم علی گڑھ کے معاً بعد محمد علی ایک سرکاری اثر سے آزاد ''جامعہ ملیہ اسلامیہ'' کی

طرح ڈالنے میں لگ گئے۔ خود ہی بڑی محنت سے اس کا نصاب بنایا، اس پر مضامین لکھے، ان کی نشر و اشاعت کی، کلاس قائم کیے اور خود ہی پڑھائی بھی شروع کر دی جامعہ ملیہ آج بھی ماشاء اللہ قائم ہی نہیں، بلکہ بڑی اچھی حالت میں ہے، لیکن یہ یاد دلاتے رہنے کی ضرورت آج بھی باقی ہے کہ اس کے اصل بانی محمد علی ہی تھے۔ جیسے علی گڑھ کے اصل بانی سرسید۔ رفیقوں، شریکوں کی رفاقت و شرکت سے اصل بانی کی شخصیت مشتبہ نہ ہونی چاہیے۔

سال کی یہ آخری سہ ماہی محمد علی کے لیے بڑی آزمائش کی سہ ماہی تھی۔ علی گڑھ کی تخریب اور جامعہ کی تعمیر، دونوں کے کام ساتھ ساتھ۔ فرصت بالکل عنقا۔ خدا جانے کھانے اور سونے کے اوقات کہاں سے نکالتے تھے۔ بہر حال جنوری ۱۹۲۱ء میں جب ذرا دم میں دم آیا، تو ۱۳ر جنوری کو مجھے جامعہ آنے کی دعوت دی۔ مراسلت اب عرصہ دراز سے بندتھی۔ یہ مکتوب پا کر مسرت کے ساتھ حیرت بھی ہو۔ اصل خط ملاحظہ ہو:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۳ر جنوری ۱۹۲۱ء ‏ ‏ ‏ ‏ قومی مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

برادرم! ‏ ‏ ‏ ‏ السلام علیکم

اپنی عدیم الفرصتی کا اب کیا دکھڑا روؤں۔ آپ خود اندازہ فرما سکتے ہیں۔ اسی باعث مفصل خط لکھنے سے معذور ہوں اور مجملاً لکھنے کا نتیجہ غالباً یہ ہوگا کہ آپ میرے مفہوم کو نہ سمجھ سکیں گے۔ بہر حال یا قسمت یا نصیب کہہ کر لکھتا ہوں۔

جی چاہتا ہے کہ آپ کو یہاں دیکھوں، مگر علم سے زیادہ مذہب عزیز ہے اور ایک مسلمان کے مذہب کے متعلق اگر قومی مسلم یونی ورسٹی میں بھی شک وشبہ کیا جائے گا تو ہم یہ کہہ کر پیچھا نہیں چھڑا سکتے کہ ہر شخص کا مذہب اس کا ذاتی معاملہ ہے، جس سے اس دار العلوم کا کوئی تعلق نہیں۔ اب تک عمداً میں نے فلسفے کے سینیر پروفیسر کی جگہ کے متعلق کوئی سفارش نہیں کی

ہے۔ چوں کہ اردو میں تعلیم دلانا منظور ہے، اس لیے اور بھی آپ کی ضرورت ہے۔ اگر تکلیف نہ ہو تو ایک دو دن کے لیے میرے مہمان بن کر یہاں کی دال روٹی کھایے اور تمام معاملات کا تصفیہ کیجیے۔ اگر ہم دونوں ایک ہی بات پر راضی ہو گئے تو مجھے یقین ہے کہ دار العلوم کو آپ سے بیش قیمت مدد مل سکے گی۔ ممکن ہے کہ آپ شروع ہی سے یہاں آنے سے انکار کرتے ہوں اور مذہب کے متعلق میرے اس قدر لکھنے کو بھی خواہ مخواہ کا دخل در معقولات تصور کریں، لیکن مجھے تو پروپیگنڈا کرنا ہے۔ اس لیے تبلیغ ہی کا موقع دیجیے اور آجایے۔ بہر حال آپ سے نصاب و نظام تعلیمات کے متعلق مشورہ کرنا ہے، اسی کے لیے آجایے۔

اب رخصت ہوتا ہوں۔ والسلام

آپ کا قدیم نیاز مند محمد علی

مولانا دریابادی اس پیش کش کے بعد لکھتے ہیں:

''اس ارشاد کی تعمیل تو میں کیا کرتا اور اپنا لکھنؤ کا گوشۂ عافیت (خاتون منزل) چھوڑ، سرکاری یا قومی کسی قسم کی بھی قید ملازمت میں اب کیا پڑتا، بلکہ اب تو اس منزل میں تھا کہ خود لکھنؤ کی سکونت بار معلوم ہو رہی تھی اور سال ہا سال کے قیام کے بعد اور گوناگوں دل چسپیوں کے باوجود اپنے وطن قدیم دریاباد کو از سر نو آباد کرنے کا ارادہ کر رہا تھا، اس لیے جواب میں تو غالباً محض معذرت لکھ بھیجی۔ لیکن یہاں ذکر میرے جواب کا نہیں، ذکر مولانا کے اصل مکتوب کا ہے عبارت مکرر ملاحظہ کر لی جائے۔..........

میں بحمد اللہ اس وقت تک الحاد و دہریت کے چکر سے پوری طرح نجات پا چکا تھا اور پختہ مسلم ہو چکا تھا، مولانا کو ان تفصیلات کی اطلاع نہ تھی۔ وہ اپنی پرانی واقفیت کی بنا پر اب تک میرے عقائد کو ناقابل اطمینان سمجھ رہے تھے۔ اسلام اور اللہ کے دین کا یہ گہرا درد اُن کے دل میں تھا کہ مجھے بلا بھی رہے ہیں، میرا ہونا وہاں دل سے بھی چاہ رہے ہیں اور اس کو جامعہ کے حق میں مفید بھی پا رہے ہیں، لیکن اس سب کے باوجود اس کے ذرا بھی

روادار نہیں کہ ایک ملی درس گاہ میں الحاد و دہریت کے جراثیم لیے ہوئے میں قدم رکھوں۔ محمد علی کی سیرت کا سارا نچوڑ اس ایک مختصر سے خط بلکہ اس کے ایک فقرے کے اندر آ گیا۔ دین کے لیے اتنی صلاحیت اچھے اچھے علماء میں بھی اس دور میں کم تر ہی دیکھنے میں آئی ہے۔ نہیں کہ محمد علی کو اپنے دوستوں، عزیزوں، رفیقوں سے محبت نہ ہو۔ محبت میں کمی کیسی اور زیادتی ہی رہتی تھی۔ لیکن اللہ اور اس کے دین کی محبت، ان سب محبتوں پر حاکم اور غالب۔وَالَّذِيْنَ آمَنُوا اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ کی عملی تفسیر۔

کہتے ہیں کہ علی برادران کی ان ہی والہانہ خدا پرستیوں کو دیکھ کر ایک بار ان کے مرشد مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ نے فرمادیا تھا کہ ''یہ دونوں بھائی اگر عہد نبویؐ میں ہوتے تو ان کی مسلسل فدا کاریاں تو ایسی ہیں کہ جیسے خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے دس مخصوص صحابیوں کے نام ایک صحبت میں لے لے کر انہیں جنت کی بشارت دے دی تھی، ایسے ہی ان دونوں کے لیے بھی کیا عجب ہے کہ نام لے کر ارشاد ہو جاتا کہ "محمد علی فی الجنة، شوکت علی فی الجنة"....اور کون کہہ سکتا ہے کہ مرشد کا یہ قول حقیقت سے خالی اور نری تخیل پر مبنی تھا''۔(ملاحظہ ہو: ص ۹۶ تا ۹۹ باب ۱۳)

مولانا محمد علی کی قید فرنگ پر مولانا دریابادی کے تاثرات:

''اللہ اللہ کیا سماں تھا! آکسفورڈ کا گریجویٹ، آنرز پایا ہوا گریجویٹ، ''کامریڈ کا ایڈیٹر، ملک کا ایک معروف ترین لیڈر'' چوروں اور نقب زنوں، ڈاکوؤں اور خونیوں کے ساتھ قفس میں بند! اور جس کے ملنے والوں میں ابھی کل تک گورنر اور نصف گورنر، راجے اور مہاراجے، ایگزیکٹیو، کونسلر اور خود وائسرائے بہادر تھا، آج اس کی عزت جیل کے ادنیٰ پہرہ داروں اور برق اندازوں کے رحم و کرم پر تھی! کوچ اور صوفے اور گدے اور قالین کی جگہ زمین کا کھردرا فرش، اور غذا وہ مل رہی تھی جو کبھی اس کے چاکروں اور خدمت گاروں نے بھی کیوں کھائی ہوگی!

اور یہ سب کچھ دعوائے اسلام کے جرم میں! محبت اسلام کے پاداش میں! فرد جرم جو لگی تھی، اس میں آزادی ہند، سوراج وغیرہ کا کہیں نام نہ تھا۔ الزام یہ تھا کہ جو احکام قرآن اور احادیث رسولؐ قتل مسلم کی وعید میں ہیں، ان کو مسلمان سپاہیوں تک پہنچانے کی کوشش کیوں کی تھی۔ تاریخ ہلکے پیمانے پر سوا تیرہ سو برس کے بعد اپنا اعادہ کر رہی تھی..... اَلَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ. (سورۃ الحج:۴۰) اور وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ یُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ. (سورۃ البروج:۸) اور اسی قسم کی دوسری آیتوں کی تفسیر کا مشاہدہ لفظ وعبارت کی وساطت کے بغیر ہو رہا تھا۔

ادھر محمد علی جیل گئے اور ادھر بچے بچے کی زبان پر

کہہ رہے ہیں کراچی کے قیدی ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو

کا ترانہ آگیا!..... جس پر اپنے بیوی بچوں، عزیزوں، دوستوں سے دو چار دن کی بھی جدائی شاق تھی، اسے حکم ۲۴ مہینوں تک، سب سے الگ، قید فرنگ میں بند رہنے کا..... اللہ اللہ! کیا شان بے نیازی ہے! اپنے عاشقوں کے امتحان کیسے کیسے کرائے جاتے ہیں۔ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ. (سورۃ العنکبوت:۲) (ملاحظہ ہو: ص ۱۰۵، ۱۰۶، باب ۱۵)

۱۹۲۳ء میں مولانا محمد علی قید فرنگ سے رہا ہوئے تو کانگریس پارٹی کے صدر منتخب ہوئے، اسی زمانے میں لکھنؤ آئے، یہاں ان کو متعدد جگہوں پر ایڈریس دیے گئے۔ مدرسہ نظامیہ فرنگی محل کی طرف سے مولانا کے مرشد مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ نے عصرانے کا اہتمام کیا، بعد مغرب امین الدولہ پارک میں عظیم الشان جلسہ عام ہوا۔ اس کی صدارت لکھنؤ میونسپل بورڈ کے صدر اور معروف لیڈر چودھری خلیق الزماں نے کی۔ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ بڑی تعداد میں برادران وطن بھی شریک جلسہ تھے۔ اسی جلسے میں کچھ شریروں نے ہینڈ بل تقسیم کرنے شروع کردیے کہ یہ محمد علی وہی ہیں جنہوں نے جامع مسجد علی گڑھ میں ایک تازہ تقریر میں کہا ہے کہ میں ایک فاجر وفاسق مسلمان کو بھی گاندھی جی پر ترجیح دیتا

ہوں، ایسا شخص بھلا کانگریس پارٹی کا صدر کیسے مانا جا سکتا ہے؟

مولانا محمد علی کی ہمت مردانہ اور جرأت مومنانہ ملاحظہ ہو:

''احباب و مخلصین کچھ پریشان سے ہو گئے۔ بہتوں نے کہا کہ سوال بالکل بے محل ہے، خود صدر جلسہ نے سائل کو خاموش ہو جانے اور بیٹھ جانے کا حکم دیا، لیکن ہزاروں کے اس مجمع میں ایک شخص ایسا بھی تھا جو سوال سے مطلق نہ گھبرایا، وہ دل میں پورا اطمینان رکھے ہوئے تھا اور وہ شخص خود محمد علی تھا! صدر نے سائل سے پکار کر کہا'' آپ بیٹھ جایے، میں سوال کی اجازت نہیں دیتا''۔ معاً محمد علی چمک کر بولے مگر میں اجازت دیتا ہوں، آپ اپنے سوال کا جواب لیجیے اور اس کے بعد یوں گویا ہوئے:

''علی گڑھ میں میں نے جو کچھ کہا اسے دہرانے کے لیے یہاں بھی تیار ہوں اور ہر جگہ، گاندھی جی اس وقت آزادئ ملک کے لیے جو خدمات انجام دے رہے ہیں، ان کے لحاظ سے وہ اپنا نظیر نہیں رکھتے اور جہاں تک ان کی بیش بہا خدمات وطن کا تعلق ہے، میں مہاتما جی کو اپنے ہی سے افضل نہیں، بلکہ اپنی والدہ ماجدہ سے بھی زیادہ قابل تعظیم اور اپنے پیرومرشد حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی سے بھی بڑھ کر قابل احترام سمجھتا ہوں، لیکن ایک دوسری حیثیت اعتقاد وایمان کی ہے۔ میں عقیدتاً مسلمان ہوں اور اس کے معنی یہ ہیں کہ عقیدۂ اسلام کو اور تمام عقائد سے کہیں بہتر اور اعلیٰ تر سمجھتا ہوں اور اس لحاظ سے، یعنی جہاں تک عقائد ایمانی کا تعلق ہے، میں اکیلے گاندھی جی ہی سے نہیں تمام ہندوؤں، تمام عیسائیوں، تمام غیر مسلموں کے مجموعے سے ہر ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان، ہر بدعمل سے بدعمل کلمہ گو کو بہتر سمجھتا ہوں۔ اسلام کی افضلیت میرا جزو ایمان ہے۔ اگر آج میں خدانخواستہ اس کا قائل نہ رہوں تو پھر مسلمان رہنے کی بھی کوئی وجہ نہیں رہتی۔ میری بات کوئی انوکھی بات نہیں، جس طرح میں اپنے عقیدے کی افضلیت کا قائل ہوں، اسی طرح ہر مذہب والا اپنے عقیدے کو افضل تسلیم کرتا ہے، کیا پنڈت مدن موہن مالوی جی

اپنے عقیدے کو سب سے افضل خیال نہیں کرتے؟ (ملاحظہ ہو: ص ۱۳۳، ۱۳۴، باب ۱۹)

فروری ۱۹۲۶ء میں مولانا محمد علی سخت علیل ہوئے اسی زمانے میں گوناگوں اسباب کی بناپر ان کا مشہور انگریزی ہفتہ وار ''کامریڈ'' (The Cmrade) بند ہو گیا۔ اس کا تذکرہ مولانا دریابادی کے قلم سے:

''اس طرح کوئی ۱۵ مہینے کی آب وتاب کے بعد یہ آفتاب صحافت غروب ہو گیا اور اب کی مرتبہ اس کی تدفین انگریز حکومت کے جبر وتشدد کے ہاتھوں نہیں، خود اپنی قوم کی ناقدریوں کے ہاتھ ہوئی۔

محمد علی کا اصلی جوہر تحریر اردو کا نہیں، انگریزی انشا کا میدان تھا، ساتھ ہی قوت استدلال غضب کی۔ بیان کی دل آویزی، زبان کی شگفتگی، دلائل کی قوت، بحث کے اطراف وجوانب کی جامعیت، سب مل ملا کر عجب سماں پیدا کر دیتے...... ''کامریڈ'' جس دن بند ہوا ہے حکام والا مقام کے علاوہ خود ہم چشم لیڈروں میں سے بھی خدا جانے کتنوں نے اطمینان کا سانس لیا ہوگا کہ ایک بڑا کانٹا پہلو سے دور ہو گیا، وہ درۂ احتساب گم ہو گیا جو بڑے اور چھوٹے کے درمیان صرف انصاف کرنا جانتا تھا۔ ''کامریڈ'' نامی ایک اخبار بند نہیں ہوا، مظلوموں کا ایک فریادرس اور مسلمانوں کا ایک بڑا ترجمان دنیا سے اٹھ گیا۔
(ملاحظہ ہو: ص ۱۹۴، ۱۹۵، باب ۳۱)

سعودی شریفی تنازعے میں جب مدتوں کی عقیدت اور خلوص کا خاتمہ ہو رہا تھا۔ مولانا محمد علی اور ان کے مرشد مولانا عبدالباری فرنگی محلی میں دوریاں بہت بڑھ گئی تھیں برسوں کی محبت، مدتوں کی عقیدت اور خلوص کا حاتمہ ہو رہا تھا۔ اس دور میں مولانا محمد علی نے ''تقاضائے وفا'' کے عنوان سے اپنے روزنامے ''ہم درد'' دہلی میں ایک مضمون لکھا، اس کے اقتباسات ملاحظہ ہوں:

''اسلام وخلافت ہی کے لیے ہم نے علمائے ہند اور صوفیائے ہند سے رشتہ جوڑا تھا

اور کبھی نکث عہد کے ہم مرتکب نہیں ہوئے، لیکن اسلام وخلافت ہی کے لیے ہم ایک بار نہیں، ہزار باران سے اپنے رشتے کو توڑ دیں گے اور صرف اس خدا سے رشتہ جوڑے رہیں گے جس سے عالم وجود میں آنے سے پہلے ہی ہم نے سوال الست بربکم کے جواب میں بلیٰ کہہ کر رشتہ جوڑ لیا تھا۔ ہم اپنے پیرو مرشد کے پاس فنافی الشیخ ہونے کی غرض سے نہیں گئے تھے، بلکہ فنا فی اللہ ہونے کی غرض سے۔ اور ہمارے لیے وہی پرانا طریقہ آج بھی موجود ہے کہ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ. (سورۃ النساء:۵۹)

آگے جو کچھ لکھا ہے، روشنائی سے نہیں، خون دل سے لکھا ہے طیش وغضب سے بگڑ کر نہیں، حزن وشکستگی سے گھٹ گھٹ کر "بحمد اللہ میں مولانا صاحب کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے پیشتر بھی مسلمان تھا، آج بھی مسلمان ہوں اور ان شاء اللہ ہمیشہ مسلمان رہوں گا، جب آٹھ برس علی گڑھ اور چار برس آکسفورڈ میں رہ کر مجھ میں کفر والحاد نے سرایت نہ کی تو اب جب کہ اسلام کی خاطر میں نے علی گڑھ سے منھ موڑا اور آکسفورڈ پر بھی لات ماری، کیا خداوند کریم مجھے کفر والحاد کی طرف لے جائے گا؟ اب موت روز قریب تر معلوم ہوتی ہے، اب تو یہی دعا ہے کہ گو زندگی عبادات وریاضات میں صرف نہ ہوئی، مگر موت آخری عبادت وریاضات میں نصیب ہو، جس کا نام شہادت ہے اور میرا شعر سچا ثابت ہو ؎

جیتے جی تو کچھ نہ دکھلایا مگر — مر کے جوہر آپ کے جوہر کھلے

فَاطِرَ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ.........بِالصّٰلِحِیْنَ. (۱)

(اے آسمان اور زمین کے پیدا کرنے والے! دین ودنیا میں تو ہی ولی ہے، مجھے اسلام پر موت دے اور صلحاء میں مجھے شامل فرما)

مجھے فقط تیری خوش نودی منظور ہے ؎

کیا ڈر ہے جو ساری خدائی بھی مخالف — کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے

(۱) پوری آیت یہ ہے: فَاطِرَ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ. (سورہ یوسف:۱۰۱)

مجھ سے سب بے زار ہو جائیں مگر تو اور تیرا رسولؐ بے زار نہ ہوں۔ کسی سے بھی نکث عہد ہو، مگر تجھ سے اور تیرے رسولؐ سے نہ ہو، دنیا بھر کی بیعتیں فسخ ہو جائیں مگر وہ بیعت فسخ نہ ہو جو سب سے پہلی بیعت ہے۔ خداوند میں اقرار کرتا ہوں کہ میں تجھ سے راضی ہوں اور تیرے رسول پاکؐ سے اور تیرے قرآن سے اور تیرے رسولؐ کی سنت سے۔ اے کاش تو اور تیرا رسولؐ بھی مجھ سے راضی ہو جائیں۔ اگر تیری اور تیرے رسولؐ کی خوشنودی حاصل ہو جائے تو پھر کیا ہے۔ تب تو تیرا حشر ہوگا اور میں ہوں گا اور میرا یہ شعر میرا طغرائے امتیاز ہوگا ؎

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے — یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

(ملاحظہ ہو: ص ۲۸۹ تا ۲۹۱، باب ۵۰)

مولانا محمد علی ایسے بندۂ مومن تھے جو ؏

زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

وہ وہی کہتے تھے جسے حق سمجھتے تھے۔ اس سلسلے میں مولانا دریابادی کے تاثرات ملاحظہ ہوں:

''صحابیوں کے سرتاج عمر فاروقؓ سے متعلق جب حدیث نبویؐ میں یہ مضمون نظر سے گزرا تھا کہ عمرؓ کی حق گوئی نے ان کا کوئی دوست باقی نہ رکھا، تو دل پر بڑا اثر پڑا تھا اور حیرت بھی ہوئی تھی۔ قدرت حق نے اس کا ایک ہلکا سا نمونہ آنکھوں کو دکھایا۔ محمد علی اس آفتاب کے سامنے ایک ذرہ سہی، لیکن بہرحال اس ذرے پر بھی اس آفتاب کا پرتو پڑ رہا تھا۔ یہ مخالف وہ مخالف، عمر بھر کے دوست، رفیق، عزیز مخالف، جو اپنے خاص دست و بازو تھے وہ مخالف۔ اب کارٹون ان کے نکل رہے ہیں اور مخالفانہ مضمونوں اور تقریروں کی تو حد ہی نہیں اور یہ ساری یورش، اس محمد علی پر، جس کی بائیں آنکھ تو بالکل ہی جا چکی اور دوسری آنکھ کے بھی چلے جانے کا ہر وقت خطرہ، زور سے بات کرنا تک منع تھا!''۔ (ملاحظہ ہو: ص ۵۱۲، باب ۸۲)

''امیر المومنین سیدنا حضرت علیؓ کی خلافت کے حالات جب تاریخ و سیر کی

کتابوں میں نظر سے گزرتے ہیں تو حیرت اور عبرت دونوں شدت کے ساتھ ہوتی ہیں۔ رسول اکرمؐ کے قریب ترین عزیز، اسلام لانے میں شرف اوّلیت سے ممتاز، شجاعت میں بے مثال، علم، عمل، تفقہ و ورع میں اپنی نظیر آپ۔ تمام صحابیؓ، آپؓ کے فضل و کمال کے قائل، اس پر یہ حال کہ آپؓ خلیفہ ہوئے نہیں کہ بغاوتیں ہر طرف پھوٹ پڑیں۔ ادھر شورش، ادھر بدامنی، آج اس مخلص نے بغاوت کر دی، کل وہ وفادار غدار بن گیا۔ بڑے بڑے قدیم مخلص غدر و فساد پر آمادہ، سرکشی و گستاخی پر مستعد، ہر فرد معترض و نکتہ چیں، جیسے کسی کی زبان میں لگام نہیں۔ آنکھوں نے اس منظر کو ایک ہلکے پیمانے پر محمد علی کی زندگی کے آخر دور میں دیکھ لیا۔ علیؓ صحابی ہی نہیں، خلیفہ راشد بھی تھے، محمد علی بے چارے عام امتی۔ اس کھلے ہوئے فرق مراتب سے قطع نظر کر لیجیے، تو تاریخ اپنے کو دہراتی ہوئی موجود۔ محمد علی بھی چند سال قبل ملت کے عملاً ''امیر المومنین'' ہی تھے۔ مسلمانان ہند کے مقبول ترین لیڈر۔ یا اب یہ حال ہو گیا کہ بچہ بچہ دشمن و نکتہ چیں۔ خال خال اخبارات مثلاً ''انقلاب'' (لاہور)، و''الامان'' (دہلی) ساتھ رہ گئے اور ''سچ'' تو اپنی محدود بساط کے ساتھ مخلص تھا ہی۔ باقی سارے کے سارے اخبارات اور اخبار نویس بس آستین چڑھائے ہوئے۔ جی میں بے اختیار آیا کہ ایک مستقل مقالہ ''علیؓ اور محمد علی'' کے عنوان سے لکھیے اور دنیا کو دکھایے کہ خادم کے حصے میں بھی قسمت کچھ مخدوم ہی کی سی آ رہی ہے۔ اور اپنا یہ منصوبہ مولانا کو لکھ بھی بھیجا۔ یہ بھی عرض کر دیا کہ اپنا پریس ایجنٹ اب مجھی کو کر دیجیے۔ سب سے لڑ لوں گا، بھگت لوں گا۔ نت نئے جھوٹے سے جھوٹے اور گندے سے گندے الزامات اب ہم نیازمندوں کے لیے برداشت سے باہر ہو گئے ہیں۔ لکھنؤ کے حاجی ظفر الملک علوی (سچ کے منیجر اور بانی) کہاں ابھی کل ڈیڑھ برس ہوئے ''ہمدرد'' کی منیجری بلا معاوضہ کرنا اپنے لیے باعث فخر و سعادت سمجھ رہے تھے اور کہاں اب مقابلے و مخالفت میں قلم درکف''!

(ملاحظہ ہو: ص ۵۲۵، ۵۲۶، باب نمبر ۸۴)

مولانا محمد علی ۳۰ رستمبر ۱۹۳۰ء کو مولانا دریابادیؒ کے نام ایک پر درد اور مؤثر مکتوب لکھتے ہیں۔ اس کا ایک اقتباس:

''اب تک صاحب فراش ہوں۔ کانفرنس کے روزانہ اجلاس میں نہ صرف ہندوؤں اور انگریزوں بلکہ سب سے زیادہ خود مسلمان بھائیوں سے ایک ایک نقطے پر جنگ کرنا پڑے گی۔ ان تین محاذوں پر جنگ کرنے میں ہر وقت دل کی حرکت یکا یک بند ہو جانے اور موت کا اندیشہ ہے۔(۱) سب سے زائد کہ اب لکھ پڑھ نہیں سکتا۔ کامل نابینائی کا ماہر علاج چشم نے پورا یقین دلا دیا ہے کہ اگر میں سب کام چھوڑ کر نیپال جیسے ملک کو نہ چلا جاؤں جہاں دنیا کی کوئی خبر نہ ملے۔ لیکن اس پر بھی میں سمجھتا ہوں کہ میرا مذہبی فرض ہے کہ اس کانفرنس میں شریک ہوں اور وہاں سلطان جابر اور رعایائے جائز دونوں کے سامنے کلمہ حق کہہ کر سب سے افضل جہاد کروں (۲) تا آں کہ اس کام میں مر جاؤں، اس لیے قرض دام لے کر، بھیک مانگ کر اور جس طرح بھی ہو سکے گا تین چار ہزار روپے فراہم کر کے اپنی اہلیہ کو بھی ساتھ لے چلوں گا، اس لیے کہ وہ زندگی کے سارے منازل و مراحل میں میری رفیق سفر رہی۔ جب منزل مقصود کے لیے احرام باندھوں تو چاہتا ہوں کہ وہ موجود ہو (۳) ورنہ لندن کا بدترین موسم ہے اور ہر متمول انگریز اور میم انگلستان تک کو چھوڑ کر دوسرے ملکوں کو بھاگ جاتے ہیں۔ بہر حال وائسرائے کا دعوت نامہ اور میرا جواب ملفوف ہے۔ میرے خط بنام وائسرائے کو بطور خط کے نہ چھاپیے۔ اپنے مضمون میں آپ اس کے خیالات کو میرے ہی الفاظ میں شایع کر سکتے ہیں، اخبار ہی اس کے لیے بہتر ہوگا۔

جب آپ یہاں آئیں گے تو آپ کو وہ خطوط دکھاؤں گا جو مسلمانوں کی نمایندگی کے

---

(۱) یہ بہادر مجاہد جس کے خلاف ہر قسم کے اتہامات کے نعرے خود اسی کی قوم کے اکابر لگا رہے تھے۔

(۲) اشارہ ہے اس حدیث نبویؐ کی طرف جس میں یہ ارشاد ہوا ہے کہ سب سے بڑا جہاد یہ ہے کہ سلطان جائر کے سامنے کلمۂ حق کہا جائے۔

(۳) سچے بندے کی یہ دردناک پیشین گوئی کیسی سچی اتری۔

متعلق میں نے بستر مرض پر سے وائسرائے کو لکھے تھے''۔ (ملاحظہ ہو: ص ۵۳۶، باب ۸۵)

مولانا محمد علیؒ جب گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے انگلستان گئے تو روز نامہ ''زمین دار'' لاہور میں ان کے خلاف طنز وتعریض سے بھرپور ایک مضمون شایع ہوا۔ اس کا ایک اقتباس:

''جس اعزاز کے حصول کے لیے مولانا ممدوح نے اپنے اصول کو چھوڑا، اس سے کچھ فائدہ اٹھانے کا موقع آپ کو نہ مل سکے گا۔ دعا ہے کہ خدا مولانا کو صحت عطا فرمائے تاکہ آقایانِ فرنگ کے آستانے پر ناصیہ فرسائی کرنے کی جو آرزو انہیں اس پیرانہ سالی میں کشاں کشاں یورپ لے گئی ہے، پوری ہو جائے''۔ (۱)

اور یہ تحریر جو محض نمونے کے طور پر درج ہوئی، نہ اس اخبار ہی کی آخری اور اکیلی تحریر تھی اور نہ خود یہ اخبار اپنے اس رنگ تحریر میں منفرد تھا! ______ محمد علی کا شمار یوں بھی صالحین امت میں تھا، پھر بھی خدا جانے زبان کے کتنے گناہ ان سے سرزد ہوتے رہے ہوں گے۔ حکمت خداوندی نے کیا اچھا سامان ان گناہوں کے دھل جانے کا یوں بدزبانوں کے زبان وقلم سے ادا کرا دیا!''۔ (ملاحظہ ہو: ص ۵۴۱، باب ۸۷)

لندن کی گول میز کانفرنس میں سلطان جائر کے روبرو شیر خدا کی آخری گرج:

''ہم دونوں بھائی وہ پہلے شخص ہیں جنہیں لارڈ ریڈنگ نے جیل میں ڈال

---

(۱) کتنا مختلف تھا نومبر و دسمبر ۱۹۳۰ء کا ''زمین دار'' جنوری ۱۹۵۲ء کے ''زمین دار'' سے، جواب یہ لکھتا ہے: ''وہ باتیں کرتا تو سننے والے ایسا محسوس کرتے جیسے شیر نر کچھار میں گونج رہا ہے، تقریر کے لیے کھڑا ہوتا تو سامعین یہ سمجھتے کہ آسمان کے آغوش میں بادل گرج رہا ہے، منبر پر ہوتو امام غزالی کی زندہ تصویر، میدان میں ہوتو محمد بن قاسم کا قابل فخر نمونہ، اسلامیان ہند کا قائد اولوالعزم اور مجاہد سپہ سالار، چلتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا کہ اس کے مضبوط قدموں سے کرۂ ارض کا سینہ بیٹھا جاتا ہے۔ دوران تقریر میں اپنا تنا ہوا ہاتھ جوش کے ساتھ لہراتا تو ایسا محسوس ہوتا کہ آہنی پنجے سے گردش افلاک کو مروڑ ڈالنے کو آگے بڑھ رہا ہے۔ مختصر یہ کہ وہ ایک ہی وقت میں بلند پایہ شاعر، بے مثال ادیب، متبحر عالم، حقیقت بیان خطیب، عدیم النظیر مقرر، اعلیٰ ترین مدبر، کوہ وقار مجاہد، اولوالعزم سپہ سالار، لاثانی اخبار نویس، جلیل القدر رہنما اور بہترین سیاست داں تھے۔ افسوس ہے کہ پاکستان کو اس مجسمۂ علم وعمل اور تصویر عزم وہمت جرنیل کی قیادت نصیب نہ ہوسکی۔

دیا تھا۔ لارڈ ریڈنگ سے مجھے انتقام لینا مقصود نہیں، لیکن اپنے ملک کی آزادی کا تو میں اس وقت قائل ہوں گا، جب مجھے یہ اختیار حاصل ہو جائے کہ میں جب چاہوں، لارڈ ریڈنگ کو ان کے کسی جرم پر جیل بھجوا دوں۔

میں درجۂ نوآبادیات کا قائل نہیں۔ میں تو آزادیٔ کامل کو اپنا مسلک قرار دے چکا ہوں۔ برطانیہ کا سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ اس نے ہندوستان کو نامرد و بزدل بنا دیا ہے، لیکن ۳۳ کروڑ (خیال رہے کہ یہ تعداد ۱۹۳۰ء کی ہے) کی جس آبادی نے خود اپنے میں مر جانے کی ہمت پیدا کر لی ہے، اسے مار ڈالنا کچھ آسان نہیں۔ اصلی مسئلہ اس وقت ہندو مسلم مفاہمت کا مسئلہ ہے۔ دونوں کو آپس میں لڑا کر حکومت کرانے کا مسئلہ اب ایک بھولا ہوا خواب ہے۔ میں مریض ہوں اور اپنے بستر مرض ہی سے یہاں آیا ہوں، اب میں اس وقت تک اپنے غلام ملک میں زندہ واپس نہ جاؤں گا جب تک کہ اپنے ہم راہ روح آزادی کو لے کر نہ جاؤں۔ اگر آپ نے یہ نہ دیا تو میرے لیے اپنے ہاں قبر کی جگہ دیجیے"۔ (ملاحظہ ہو: ص ۵۴۲، باب ۸۶)

سردار ملت کی وفات پر حکیم الامت اشرف العلماء مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ نے مولانا دریابادی کو یہ تعزیت نامہ لکھا:

"محمد علی کی وفات کا میرے قلب پر جو اثر ہے، بیان نہیں کر سکتا۔ خدا جانے کتنی دفعہ دعا کر چکا ہوں اور کر رہا ہوں۔ مجھ کو مرحوم کی جس صفت کا اعتقاد اور اسی اعتقاد کی بنا پر محبت ہے، وہ صرف ایک صفت مسلمانوں کی سچی بے غرض محبت ہے۔ باقی دوسری صفات دیکھنے والے جانتے ہیں۔ میں نے کبھی دیکھا نہیں۔ اس لیے ایک ہی صفت سے محبت ہے اور اس کو میں روح الصفات سمجھتا ہوں"۔ (ملاحظہ ہو: ص ۵۵۹، باب ۸۸)

مولانا محمد علی کی دو خاص صفات کا تذکرہ مولانا دریابادی ان لفظوں میں کرتے ہیں:

"۱۔ ایک اسلام اور امت اسلامی سے بے انتہا محبت۔ دنیا میں کہیں کسی مسلمان کو تکلیف پہنچے اور ممکن نہ تھا کہ محمد علی کا قلب اس سے نہ دکھے، کانٹا افریقہ کے کسی مسلمان

کے چبھا اور اس کی چبھن محمد علی یہاں بیٹھے محسوس کر رہے ہوں۔

۲۔ دوسرے سچائی اور حق گوئی۔ پارٹی کی مصلحتوں سے متاثر ہوتے میں نے ہندوستان کے چیدہ سے چیدہ مسلم اور ہندو لیڈروں کو دیکھا اور تحزب (جماعت بندی) میں مبتلا بڑے بڑے علماء و مشائخ کو پایا ہے۔ بے لاگ اور بے دھڑک، دوست، عزیز، بزرگ، کسی کی پروا کیے بغیر دل کی بات زبان پر لے آنے والا، محمد علی کا سا کوئی دوسرا دیکھنے میں نہ آیا۔ سادگی، اخلاص، بے تکلفی، بے تصنعی یہ سب صفات اس ایک صفت کے لازمی برگ و بار تھے۔

اتنی خوبیوں اور ظرف و کردار کی ان ملکوتی بلندیوں کے بعد، عجب کیا جو حق تعالیٰ حشر میں ان کے پیر و مرشد مولانا عبدالباری فرنگی محلی قدس سرہ (متوفی ۱۹۲۶ء) کے اس وجدانی حسن ظن کو صحیح ثابت کر دکھائے کہ اگر علی برادران عہد نبویؐ میں ہوتے تو ان کے جذبات ایمانی سے کیا بعید ہے کہ خود حضورؐ ان ہی کے نام کے ساتھ جنت کی بشارت دے دیتے کہ محمد علی فی الجنة و شوکت علی فی الجنة- رضی اللہ عنہم ورضوا عنه. (ملاحظہ ہو: ص ۵۶۲، باب ۸۹)

مولانا جوہرؒ کی وفات (جنوری ۱۹۳۱ء) کے بعد ہی مولانا دریابادیؒ نے اپنے ہفتہ وار اخبار 'سچ' لکھنؤ میں یہ ''ڈائری'' لکھنا شروع کی تھی جو بالاقساط میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد اسی کو بنیاد بنا کر مولانا دریابادیؒ نے ازسرنو کتاب لکھنا شروع کی اور ۸۸ ابواب اور متعدد ضمیموں کے ساتھ ۲ جلدوں میں مکمل کی۔ جس کی پہلی جلد ۱۹۵۴ء میں اور دوسری جلد ۱۹۵۶ء میں دارالمصنفین اعظم گڑھ سے شائع ہوئی۔ عرصہ دراز سے یہ 'ڈائری' نایاب تھی مولانا دریابادیؒ کے ایک نادیدہ معتقد جناب محمد راشد شیخ صاحب نے اپنے اشاعتی ادارے ادارۂ علم و فن، کراچی، پاکستان سے ۲۰۰۱ء میں دونوں جلدوں کو یکجا کر کے شایع کیا تھا۔ صدق فاؤنڈیشن لکھنؤ نے اسی پاکستانی ایڈیشن کا عکس لے کر شایع کیا ہے۔ رب کریم قبول فرمائے۔ آمین

سچی باتیں (جلد اول) - ایک مطالعہ

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ صحافت میں نمایاں اور امتیازی حیثیت کے حامل صحافی تھے۔ ایک ایسے صدق نگار اور صداقت شعار صحافی جنہوں نے آیت ربانی "وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ". (زمر:۳۳) (ترجمہ: اور جو لوگ سچی بات لے کر آئے اور (خود بھی) اس کو سچ جانا تو یہی لوگ تو پرہیزگار ہیں۔) کو اپنا نصب العین بنا رکھا تھا۔ مولانا کے نزدیک صحافت کی کیا حیثیت تھی؟ اس کی وضاحت انہوں نے ایک استفسار کے جواب میں تحریر کردہ اپنے مضمون "ہفتہ وار صحافت کے آداب" (صدق جدید ۲۹/مارچ ۱۹۶۸ء) میں کی ہے۔ اس کے اہم نکات یہ ہیں:

۱۔ مقصود خدمت دین وملت رکھیے۔ عام خدمت خلق بھی اس کے تحت میں آجاتی ہے۔

۲۔ پبلک کے جذبات کی محض نمایندگی پر ہرگز اکتفانہ کرنا چاہیے۔ پبلک کے مذاق اور جذبات کی اصلاح کی کوشش کیجیے۔

۳۔ صحافت ایک قسم کی تجارت نہیں بلکہ ایک قسم کی عبادت ہے۔ بس اسی کو نصب العین بنا کر ہمیشہ اپنے سامنے رکھیے۔

۴۔ دیانت کے امتحان بھی اس راہ میں سخت سخت آتے رہتے ہیں۔ اپنے کو بچانے کا اہتمام سامنے رکھیے۔

۵۔ جس طرح زبان سے نکلی ہوئی ایک ایک بات قابل گرفت ہوتی ہے، اسی طرح قلم سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ بھی جرح کی زد میں آسکتا ہے۔ خیال کیجیے اور

ڈرتے رہیے اس وقت سے جب آپ کا سارا دفتر آپ کے سامنے ہوگا اور
آخری اور حقیقی عدالت میں اس کے ایک ایک لفظ پر سوال ہو رہا ہوگا۔
مولانا دریابادیؒ تا زندگی ان اصولوں پر عمل پیرا رہے اور ان کے اخبار بھی انہی
اصولوں پر گام زن رہے۔

ایک سچے آدمی کی علامت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے باطن کے خلاف گواہی نہیں دیتا اور اپنے ضمیر کی آواز کو خاموش نہیں کرتا ہے۔ مولانا دریابادیؒ کی شخصیت اسی کلیے سے عبارت تھی اور اس کا اظہار ان کی تمام تحریروں میں واضح طور پر ہوتا ہے۔

مولانا دریابادیؒ نے صحافت کے میدان میں باقاعدہ قدم ۱۹۲۵ء میں رکھا۔ گوکہ اس سے قبل وہ متعدد پرچوں اور اخباروں سے بحیثیت مرتب اور مضمون نگار منسلک رہ چکے تھے۔ ۲؍جنوری ۱۹۲۵ء وہ تاریخ ہے جب لکھنؤ سے ہفتہ وار ''سچ'' کا اجراء ہوا۔ اس کی ادارت میں مولانا ظفر الملک علویؒ، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ، مولانا عبدالرحمٰن نگرامیؒ شریک تھے۔ اگست ۱۹۲۵ء میں مولانا دریابادیؒ اس کے ایڈیٹر ہوگئے۔ یہ اخبار ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۳ء تک نکلتا رہا۔ ہفتہ وار ''سچ'' کا مقصود اصلی صحیح عقائد کی ترویج، اسلامی تعلیمات کی تبلیغ، بدعات و رسومات کا خاتمہ، معاشرے کی اصلاح، خلافت کے احیاء کی کوشش، ملک کی آزادی میں حصہ لینا، باطل نظریات کی بیخ کنی، فرنگی تمدن اور مغربی سیلاب کو روکنا تھا۔ ان اعلیٰ مقاصد میں اس کو اپنے محدود وسائل کے باوجود بفضلہٖ خاطر خواہ کام یابی حاصل ہوئی۔

''سچ'' ایک ہفتہ وار اخبار ہی نہیں بلکہ ایک اصلاحی صحیفے کی حیثیت بھی رکھتا تھا۔ اس کی خدمات کا اعتراف متعدد اہل قلم نے کیا ہے۔

''سچ'' کے دوسرے شمارے (۹؍جنوری ۱۹۲۵ء) ہی سے مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے اپنے شہرہ آفاق کالم ''سچی باتیں'' کا آغاز کیا۔ مولانا کا یہ افتتاحی کالم اتنا مقبول اور مشہور ہوا کہ بلا شائبہ تردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ بیسویں صدی کی اردو صحافت میں اس کی

مثال نایاب تونہیں کم یاب تو ضرور رہی ہے۔اس کالم کا سلسلہ مولانا کی وفات (۶ر جنوری ۱۹۷۷ء) سے کچھ عرصہ قبل تک جاری رہا۔

مولانا کے اس کالم کے متعلق پروفیسر محمد شافع قدوائی چیرمین شعبہ صحافت وابلاغ عامہ، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ اپنے مضمون ''سچی باتیں -ایک تجزیاتی مطالعہ'' میں رقم طراز ہیں: ''اردو میں کالم نویسی اب تک ایک باقاعدہ اور مستقل صنف کے طور پر رائج نہیں ہوسکی ہے۔ اردو میں کالم سے مراد عام طور پر حالات حاضرہ پر شگفتہ انداز میں تبصرہ ہوتا ہے۔کالم کا بالواسطہ تعلق طنز ومزاح سے سمجھا جاتا ہے اور ہلکے پھلکے تاثرات کا ذریعۂ اظہار گردانا جاتا ہے۔اردو صحافت کی تاریخ کے مطالعے سے منکشف ہوتا ہے کہ ''اودھ پنچ'' نے حالاتِ حاضرہ پر طنز ومزاح کے پیرائے میں تبصرے شایع کر کے کالم نگاری کی راہ ہم وار کردی تھی اور پھر مولانا ابوالکلام آزاد نے ۱۹۱۲ء میں ''الہلال'' میں ''افکار وحوادث'' کے عنوان سے مزاحیہ کالم لکھ کر کالم نگاری کا رشتہ طنز ومزاح سے مستحکم کردیا۔مولانا ظفر علی خاں نے مولانا آزاد کا اتباع کرتے ہوئے ۱۹۱۷ء میں ''ستارۂ صبح'' کے نام سے فکاہیہ کالم لکھا۔ اس کے بعد حسن نظامی اور مولانا محمد علی جوہر نے بھی فکاہیہ کالم لکھے۔ مولانا آزاد، مولانا ظفر علی خاں اور حسن نظامی کے فکاہیہ، طنزیہ اور مزاحیہ کالموں کی مقبولیت کے باعث اردو کالم نگاروں نے سنجیدہ مسائل اور فکری موضوعات پر توجہ مرکوز کرنے کے بجائے طنز ومزاح کو اپنا مقصود جانا اور سیاسی موضوعات پر شگفتہ انداز میں رائے زنی کرتے رہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ جنہوں نے صرف بارہ سال کی عمر میں یعنی ۱۹۰۴ء میں ''اودھ اخبار'' میں ایک مذہبی عنوان پر مضمون لکھ کر اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کیا تھا،فکری مباحث اور مذہبی واخلاقی موضوعات کی طرف متوجہ ہوئے اور انہوں نے اپنے کالم ''سچی باتیں'' کی اساس ان موضوعات پر رکھی۔ مولانا دریابادی نے ۱۹۲۵ء میں ایک ہفتہ وار ''سچ'' نکالا، جس کے صفحہ اول پر ان کا اداریہ نما کالم ''سچی باتیں'' شایع ہوتا تھا۔ ہر چند کہ مولانا

نے اس کالم میں مقبول عام روش کے مطابق سیاسی موضوعات پر طنزیہ پیرائے میں اظہار خیال بھی کیا مگر انھوں نے ''سچی باتوں'' کو بنیادی طور پر معاشرتی اصلاح اور اخلاق کی درستی کے لیے وقف کر دیا تھا۔ ''سچی باتیں'' مولانا کے مخصوص نصب العین یعنی اخلاقی قدروں کی باز آفرینی اور مذہب کی سربلندی اور احیا کے جذبے کی آئینہ دار ہوتی تھیں۔ نصف صدی کو محیط مولانا کی صحافتی زندگی کا بنیادی موضوع روحانی اور اخلاقی اقدار ہیں۔ ان کی تقریباً تمام تحریریں اسی ایک نقطے کی تشریح و توضیح کرتی ہیں۔ ادبی موضوعات ہوں یا روزمرہ کے واقعات، مولانا دریابادی ہر واقعے سے عبرت اور سبق آموزی کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور نکال لیتے تھے اور اپنے کالم میں اسی پہلو کی معنویت کو آشکارا کرتے تھے۔ اس لحاظ سے مولانا کی تمام تحریریں اسالیب بیان کے تنوع اور موضوعات کی رنگا رنگی کے باوجود اپنی غایت کی سطح پر باہم متحد و مربوط ہیں۔ انہوں نے ''سچی باتوں'' کے حوالے سے کائناتی مظاہر میں مستور ایک مرکزی حقیقت کی تلاش کو اپنی فکر کا مرکز بنایا تھا۔ مولانا نے ''سچ'' کے بعد ''صدق'' اور پھر ''صدق جدید'' نکالا۔ ان پرچوں میں بھی ان کی تحریروں کا مرکزی حوالہ وہی رہا''۔ (ملاحظہ ہو: ص ۵۱-۵۲، دوماہی اکادمی لکھنؤ، عبدالماجد دریابادی نمبر، نومبر، دسمبر ۱۹۹۰ء، جنوری، فروری ۱۹۹۱ء)

مولاناؒ کی یہ ''سچی باتیں'' دینی، اخلاقی، علمی، ادبی، فکری، تہذیبی، تاریخی، سیاسی اور معاشرتی موضوعات کی جامع ہوتی تھیں۔ ان میں فکر و تدبر اور تذکیر و موعظت اور فنا و عبرت کے ایسے بیش قیمت عناصر شامل ہوتے تھے کہ اس زمانے کے موقر اخبارات و جرائد، بڑی اہمیت کے ساتھ انہیں اپنے ہاں نقل کرتے تھے۔ مختلف زبانوں میں ان کا ترجمہ ہوتا تھا، مسجدوں میں اور اصلاحی جلسوں میں انہیں پڑھ کر سنایا جاتا تھا۔ مولانا دریابادیؒ قرآن مجید، سیرت نبویؐ، اسوۂ صحابہؓ اور حالات صوفیہ سے عموماً وہ گوشے منتخب کر کے 'سچی باتوں' میں شایع کرتے تھے جن کی روشنی میں عہد حاضر کے مسلمانوں کی رہبری کا فرض انجام دیا جا سکے۔

پروفیسر قدوائی اپنے اسی مضمون میں آگے رقم طراز ہیں:

''مولانا کے گہرے تاریخی شعور اور وسعت مطالعہ نے ''سچی باتوں'' کی انفرادیت اور مقبولیت کے نقش کو اور بھی گہرا کر دیا تھا۔ مولانا دریابادی تاریخی حقائق سے عبرت اور سبق کا درس لینے کی تلقین کرتے تھے.... مولانا کی گہری مذہبیت نے انہیں مذہبی تعصب سے پاک کر دیا تھا۔ لہٰذا اگر برادران وطن میں انہیں اچھائی کا کوئی پہلو نظر آتا تو ''سچی باتوں'' میں اس کا برملا ذکر کرتے اور اس سے سبق لینے کا درس دیتے''۔ (ص:۶۲، ۶۳)

پروفیسر موصوف مزید تحریر کرتے ہیں:

''مولانا کا کالم ''سچی باتیں'' ایک مرکزی موضوع کا تابع ہونے کے باوجود مواد کے تنوع اور اسلوب بیان کی دل کشی اور ادبی چاشنی کے باعث برصغیر کے علمی حلقوں میں بڑی دل چسپی سے پڑھا جاتا تھا۔ مولانا دریابادی نے اپنے کالم میں صرف مذہبی موضوعات کی تعبیر و تشریح نہیں بلکہ اکثر حکایتوں کے توسط سے کسی مقتدر شخصیت کے تعارف کا فریضہ بھی انجام دیا۔ انہوں نے بزرگان دین کی خشکی اور مزاج کی درشتی سے متعلق مشہور عام غلط فہمی کا ازالہ بھی کیا نیز اپنے کالموں میں بعض ایسے حقائق اور واقعات کا بھی ذکر کیا جن سے متعلقہ شخص کے شخصی خصائص اور زیادہ نمایاں ہو گئے''۔ (ص:۶۵، ۶۶)

''سچی باتوں'' کے اسلوب کا تجزیہ کرتے ہوئے پروفیسر قدوائی تحریر کرتے ہیں:

''اگر ''سچی باتوں'' کے اسلوب کا تجزیہ کیا جائے تو منکشف ہوگا کہ مولانا دریابادی کے کالم کا مزاج مختلف اسالیب کے امتزاج سے مرتب ہوتا ہے۔ مولانا دریابادی کے اسلوب کا مابہ الامتیاز عنصر طنز (Irony) ہے، جو اکثر صورتوں میں طنز کی زہرناکی کے بجائے قاری کو المیاتی احساس سے دوچار کراتا ہے۔ مولانا نے ''سچی باتوں'' میں طنز، استہزا، تمسخر، مایوسی، حسرت، تاسف اور غصے کے اسالیب آزمائے۔ مولانا کا اسلوب بنیادی طور پر خطیبانہ ہے، جو پیہم سوالات کی آویزش سے متشکل ہوتا ہے۔ انہوں نے تحریر

کو زیادہ موثر بنانے اور قاری کو قائل کرنے کے ایک خطیبانہ حربے (Rhetori Call Questions) سے خاصا استفادہ کیا اور اپنے کالم میں دیکھیے ، ملاحظہ کیجیے ، سنیے ، سبق لیجیے ، سنتے ہیں آپ ، جی ہاں ، ہے کوئی وغیرہ پر مشتمل خطابیہ جملے لکھ کر اپنی تحریر میں گفتگو کی سی برجستگی پیدا کردی تھی ۔ مولانا کے اسلوبی خصائص میں طنز اور استفہامیہ لہجے کو بنیادی اہمیت حاصل ہے'' ۔ (ص: ۶۸، ۶۹)

مولانا کے اسلوب کی انفرادیت بیان کرتے ہوئے پروفیسر قدوائی رقم طراز ہیں:

''مولانا نے طنز، تمسخر اور استہزا کے ساتھ غم ، غصے اور خوف کے اسالیب بھی آزمائے اور رعایت لفظی ، تلمیح ، استعارہ ، کنایہ، ضلع جگت اور اشعار نیز مصرعوں کے برمحل استعمال سے اپنے اسلوب کی انفرادیت کا تعین کیا۔

مولانا دریابادی کے کالم کا اہم ترین وصف ادبی اور علمی اسلوب ہے۔ مولانا نے اپنی تخلیقی فطانت اور علمیت کے وسیلۂ اظہار کے طور پر ایک صحافتی صنف 'کالم' کو اختیار کیا اور مواد اور اسلوب دونوں سطحوں پر اس صنف کے منظرنامے کو وسیع کیا۔ مولانا دریابادی نے ادبی جمود اور تعطل کے دور میں '' کالم'' کو مکالمے کا بنیادی ذریعہ بنایا اور اسی کی وساطت سے معاشرتی اصلاح کا فریضہ انجام دینے کی کوشش کی ۔ مولانا کے کالم '' سچی باتیں'' کا حوالہ موضوعاتی تنوع اور اسلوب بیان کی ندرت کے باعث اردو کالم نویسی کی روایت میں ناگزیر رہے گا'' ۔ (ص: ۷۱)

مولانا دریابادی کی تحریر کردہ '' سچی باتیں'' ان کے کردار، رجحانات اور میلانات کی عکاس ہوتی تھیں ۔ ذیل میں ان ہی سچی باتوں کے چند نمونے پیش ہیں:

رمضان المبارک کے روزوں اور اعمال صالحہ کی ترغیب:

يَـا اَيُّهَـا الَّـذِيْـنَ آمَنُـوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ٥ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ. (بقرہ: ۱۸۳، ۱۸۴)

اے ایمان والو! تمہارے اوپر روزہ اسی طرح فرض کیا گیا، جس طرح تم سے قبل والوں پر فرض کیا گیا تھا تا کہ تم پرہیزگار بن جاؤ، چند روز کے لیے۔

وہ مہینہ، جس میں روزہ رکھنے کا حکم، ہر بڑے اور چھوٹے، امیر وغریب، عالم وعامی، مسلمانوں کے لیے ہے، آ گیا۔ آپ اس حکم کی تعمیل کے لیے تیار ہیں؟

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِىْ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْآنُ هُدىً لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدىٰ وَالْفُرْقَانِ، فَمَنْ شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ. (بقرہ:۱۸۵)

یہ رمضان کا مہینہ ہے، جس میں قرآن اتارا گیا ہے، جو لوگوں کے لیے ہدایت ہے، اور ہدایت کی کھلی دلیلیں رکھتا ہے اور حق و باطل کو الگ کر دیتا ہے۔ پس تم میں سے جو کوئی اس مہینے کو پائے، اسے چاہیے کہ وہ اس کے روزے رکھے۔

وہ بابرکت مہینہ، جس میں دنیا کی ہدایت ورہبری، روشنی ورہنمائی کا سب سے بڑا اور کامیاب نسخہ ہاتھ آیا، آ گیا، کیا آپ اس کے ادب واحترام پر آمادہ نہیں؟

اِنَّـا اَنْزَلْنَاهُ فِىْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ o وَمَـا اَدْرَاكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ o لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ o تَنَزَّلُ الْمَلاَئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ o سَلاَمٌ هِىَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ.

ہم نے قرآن کو شب قدر میں اتارا ہے۔ اور تمہیں کیا خبر کہ شب قدر کیا چیز ہے؟ شب قدر ہزار مہینوں سے بھی بہتر ہے۔ اس میں فرشتے اور روح، اپنے پروردگار کے حکم سے ہر امر خیر و برکت کو لیے ہوئے اترتے ہیں، اور سلامتی جو طلوع فجر تک رہتی ہے۔

جس متبرک مہینے میں ایک ایسی متبرک رات آتی ہے، وہ آ گیا۔ کیا آپ کے مشاغل اس قدر ومنزلت والی رات کی قدر ومنزلت کرنے کی اجازت آپ کو دیں گے؟

"عن ابن عباس قال كان رسول الله ﷺ اذا دخل شهر رمضان اطلق كل أسير وأعطىٰ كل سائل".

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ جب رمضان کا مہینہ آجاتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر قیدی کو چھوڑ دیتے تھے اور ہر مانگنے والے کو (اپنی عام عادت سے بڑھ کر) دینے لگتے۔

کچھ ہرج ہوگا، اگر اس عادت مبارک کی پیروی آپ بھی رمضان بھر اپنے اوپر لازم کریں؟

"عن ابن عمر ان رسول اللہ ﷺ قال الصیام و القرآن یشفعان للعبد - یقول الصیام! رب انی منعتہ الطعام و الشھوات بالنھار فشفعنی فیہ و یقول القرآن منعتہ النوم باللیل فشفعنی فیہ فیشفعان".

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ روزہ اور قرآن، بندے کی شفاعت کریں گے۔ روزہ یہ کہے گا کہ اے پروردگار، میرے سبب سے یہ دن بھر کھانے اور دیگر خواہشات کے پورا کرنے سے رکا رہا، پس میری شفاعت اس کے حق میں قبول کر اور قرآن کہے گا کہ مجھ میں مشغول رہ کر یہ رات کو سویا نہیں، پس میری شفاعت اس کے حق میں قبول کر، پس ان دونوں کی شفاعتیں قبول کی جائیں گی۔

کیا آپ اپنے تئیں رمضان کی شفاعت سے بے نیاز رکھنا چاہتے ہیں؟ کیا آپ کو رمضان کے ہم درد و دوست بنا لینے کی ضرورت نہیں؟ کیا آپ رمضان کے دنوں میں ضبط خواہشات اور راتوں میں جاگنے کی مشق نہ فرمائیں گے؟ روزے کے طبی فوائد تو اب غیروں کو بھی تسلیم ہونے لگے ہیں، آپ کے لیے اس کی جسمانی و روحانی دونوں قسم کی برکتوں سے فائدہ اٹھانے کے پورے موقعے حاصل ہیں، کیا آپ ان برکتوں کے تجربے سے بھی خدانخواستہ اپنے تئیں محروم رکھیں گے"۔ (ص: ۸۴تا۸۶)

سیرت رسول اکرمؐ پر عمل کرنے کی تبلیغ:

"ربیع الاول کا مہینہ ختم ہوگیا۔ جس مہینے میں دنیا کے لیے آخری اور انتہائی پیام

رحمت لانے والا دنیا میں آیا تھا، اس کی آخری تاریخ آگئی۔ اب گیارہ مہینے تک پھر اسی بابرکت مہینے کی آمد کا انتظار دیکھنا ہوگا اور اس درمیان میں خدا معلوم کتنی زندگیاں ختم ہوچکیں گی۔ قبل اس کے کہ دوسروں کو حساب دینا پڑے، ذرا آیئے ہم اور آپ مل کر خود اپنا اپنا حساب لیں۔ ہمارے سرور و سردار نمازیں بہت کثرت سے پڑھتے تھے، ہم نے اس مہینے میں کوئی نماز ترک تو نہیں کی؟ فرض نمازوں کے علاوہ وہ نماز تہجد پابندی و اہتمام کے ساتھ پڑھتے تھے، ہم نے بھی سنتوں اور نفلوں کی پابندی پر کچھ توجہ کی؟ ان کے لیے دنیا میں سب سے زیادہ دل چسپ چیز نماز تھی، ہم نے نمازوں میں کچھ دل لگایا؟ ان کے انتہائی لطف ولذت کی چیز رکوع وسجود تھی، ہم نے بھی کچھ ذوق ان سے پیدا کیا؟ وہ نماز اس طرح ادا فرماتے تھے کہ گویا پروردگار کا بالکل سامنا ہے، ہم کو نماز پڑھنے میں کچھ دھندلا سا تصور بھی اس طرح کا پیدا ہوا؟ ان کو حالت نماز میں گریہ وبُکا ہوتا تھا، ہماری آنکھیں بھی خشیت الٰہی سے کبھی نم ہوئیں؟ وہ دوران نماز میں دنیا کی ہر فکر سے بالکل آزاد ہو جاتے تھے، ہم کو وسوسوں سے کچھ دیر کے لیے بھی نجات ملی؟

ماہ مبارک ربیع میں ظاہر ہونے والا ہمارا سردار و آقا (جس پر خدائے رحمٰن ورحیم کی بے شمار رحمتیں نازل ہوں) دوسروں سے کام لینے کے بجائے خود دوسروں کے کام کر دیا کرتا تھا، ہم کو بھی ایسی توفیق کبھی نصیب ہوئی؟ حضورؐ سب سے نرمی اور محبت کے ساتھ پیش آتے تھے، ہم نے بھی اپنا برتاؤ ایسا رکھا؟ وہ سب کے ساتھ خاکساری وفروتنی برتتے تھے، ہم نے بھی اپنے دل کو جھکایا؟ وہ اپنی مجلس میں کسی کی بدگوئی وشکوہ وشکایت کے روادار نہ تھے، ہم نے اپنی زبان کو غیبت وبدگوئی سے کہاں تک بازرکھا؟ وہ دوست ودشمن اپنے اور بے گانے سب کی خدمت کرنے والے تھے، ہم نے رحمت عالمؐ کی پیروی کی کچھ بھی کوشش کی؟ وہ ہمیشہ کم کھاتے اور بعض اوقات فاقہ بھی فرماتے تھے، ہم بھی اپنی بھوک اور اپنی زبان کے چٹخارے کو اپنے قابو میں لاسکے ہیں؟ وہ لباس بہت ہی سادہ زیب جسم

فرماتے تھے، ہم نے بھی لباس کے تکلفات کو غیر ضروری سمجھنا شروع کیا ہے؟ وہ غریبوں سے میل جول رکھنا پسند فرماتے تھے، ہم کو غریبوں سے زیادہ ملنے میں کچھ تامل تو نہیں ہوتا؟ وہ بجائے نسب پر فخر کرنے کے سارا زور حسن عمل اور نیک کرداری پر دیتے تھے، ہم بھی اپنے دلوں میں یہ جذبہ وولولہ پیدا کر سکے ہیں؟ روپے پیسے کی فکر ان کے پاس تک نہ آتی تھی، ہم بھی اپنے تئیں روپے پیسے کی فکروں سے کچھ آزاد کر سکے ہیں؟ ان کا وقت دوسروں کی خیر خواہی وخبر گیری میں صرف ہوتا تھا، ہم نے بھی اپنے وقت کا کچھ حصہ اپنی ذات وتن کی پرورش کے علاوہ کسی کام کے لے الگ کر رکھا ہے؟

اگر ہم نے ان میں سے کسی چیز پر توجہ نہیں کی تو ہمارے لیے ربیع الاول کا آنا اور نہ آنا یکساں رہا۔ ہمارے لیے سرور عالم کا ظہور بے کار رہا۔ ہمارنے لیے آفتاب ہدایت کا طلوع لا حاصل ہی رہا۔ بارش ہوئی اور ہم نے اپنی کھیتی سوکھی رہنے دی، ہوا چلی اور ہم نے اپنا پھول نہ کھلنے دیا۔ آفتاب چمکا اور ہم نے اپنی آنکھیں بند رکھیں۔ اس میں قصور کس کا ہے؟ اس کی ذمہ داری کس کے سر ہے؟ اس کی بابت سوال خود ہم ہی سے ہوگا یا کسی اور سے؟ پھر جس وقت ہم سے یہ سوالات ہوں گے اس وقت کے لیے کوئی معقول جواب ہمارے پاس ہے؟ اس وقت ہمارا کوئی عذر کام دے سکے گا؟ اس وقت کے لیے ہم کوئی صفائی اپنے پاس موجود رکھتے ہیں؟ اگر آج ان سوالات کو غیر ضروری سمجھ کر ہم سرسری نظر سے انھیں ٹال دینا چاہتے ہیں تو آج بے شبہ ہمیں اختیار حاصل ہے لیکن ''کل'' جب یہ اختیار باقی نہ رہے گا، ''کل'' جب غفلت کا پردہ اٹھ چکا ہوگا، ''کل'' جب ہنسی اور تمسخر پر قدرت نہ باقی رہے گا ''کل'' جب ہر شے آئینہ ہوگی، ''کل'' جب کوئی مادی قوت پناہ نہ دے سکے گی، ''کل'' جب تلافی کا کوئی موقع باقی نہ رہے گا، ''کل'' جب اپنی بے بسی اور بے کسی پوری طرح روشن ہو چکے گی، اس وقت ---؟ اس وقت خدائے رحمٰن ورحیم ہی ہماری آپ کی مشکل کو آسان کرے''۔ (ص:۲۹،۳۰)

محرم کا پیام

"چاند کی سالانہ گردش ایک بار پھر اپنا دورہ تمام کر چکی۔ اسلامی جنتری میں "قربانی" کا مبارک مہینہ اور مبارک دن گزر چکا۔ اور "شہادت" کا مبارک مہینہ اور مبارک دن آ پہنچا۔ عید قرباں کا مہینہ اگر اس لیے تھا کہ آپ اپنا سب کچھ حق کی راہ میں لٹا دیں، تو محرم کا مہینہ یہ پیام لاتا ہے کہ آپ خود اپنے کو شہادت کے لیے پیش کر دیں۔ پچھلا مہینہ "آپ سے" مانگ رہا تھا۔ اگلا مہینہ "آپ کو" مانگ رہا ہے۔ دنیا کی ایک نہایت زبردست، متمدن و ظالم حکومت کی کشتی حیات اسی مہینے کی ۱۰ تاریخ کو دریائے نیل میں غرق ہوئی۔ موسیٰ علیہ السلام کی مظلوم قوم کو رب موسیٰ و ہارونؑ نے اسی مبارک تاریخ کو آزادی دلائی۔ اور اللہ کے کلیمؑ نے اس "یوم آزادی" کی مستقل یادگار روزۂ عاشوراء کی شکل میں قائم کر دی۔ دنیا کے سب سے بڑے ہادی، سب سے بڑے معلم اور سب سے بڑے آزادی دلانے والے نے اس پاک دن کی پاک یادگار کو یہی نہیں کہ جائز رکھا ہو، بلکہ خود بھی پابندی کے ساتھ روزہ رکھا، اور اپنی امت کو بھی اس کی تاکید فرمائی۔

ہجرت نبویؐ کی نصف صدی بعد تاریخ نے پھر اپنے تئیں دہرایا۔ اسی مہینے کی اسی تاریخ کو سرزمین کربلا پر حق و باطل، ملوکیت و حیوانیت، آزادی و ملکوتیت کے درمیان ایک بار پھر معرکہ آرائی ہوئی۔ ایک طرف دولت تھی، حکومت تھی، سلطنت تھی، مادی قوت تھی، شاہی خزانہ تھا، شاہی فوج تھی، ہزارہا سپاہیوں کا لشکر جرار تھا، قوت کا نشہ تھا، حکومت قائم کرانے کی دھن تھی۔ دوسری طرف غربت تھی، مسکینیت تھی، فقر و فاقہ تھا، ادائے فرض کا احساس تھا، حق پرستی کے جوش سے بھرے ہوئے چند دل تھے، دلوں کے اندر حق کی راہ میں مٹنے اور مٹ جانے کا بے تاب کر دینے والا ولولہ تھا، باطل کے آگے نہ جھکنے والی چند گردنیں تھیں۔ لاشیں تڑپیں اور جس خون کا ایک ایک قطرہ پروردگار عالم کی نظر میں، دونوں جہانوں کے موجودات سے زیادہ قدر و قیمت رکھتا تھا، اس کی ندیاں بہیں! اللہ کے

کلیمؑ کی امت نے سب کچھ جھیل کر عاشورۂ محرم کو اپنی آزادی حاصل کی تھی۔ اللہ کے حبیبؐ کے نواسےؓ نے خود اپنی جان نذر کر کے ابدی آزادی و سرمدی مسرت حاصل کر لی۔

موسیٰ کلیمؑ نے مع اپنی ساری امت کے، وطن سے بے وطن ہو کر عاشورۂ محرم کا استقبال کیا تھا۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم روزہ و عبادت کے ساتھ اس تقریب کو مناتے تھے۔ حسین بن علی رضی اللہ عنہما نے اپنے عزیزوں اور فرزندوں کے ساتھ خود اپنی جان نذر کر کے اس روزِ سعید کی پیشوائی کی۔ اب ارشاد ہو کہ آپ کس طریقے پر اس تاریخ کی پیشوائی کے لیے آمادہ ہیں؟ آپ آزادی کی خاطر جلاوطنی کے لیے تیار ہیں؟ آپ طاعت و عبادت، روزہ و ریاضت کے خوگر ہیں؟ آپ فاسق حکومت کے ظلم و جبر کا مقابلہ اپنے گوشت اور پوست سے کرنے کی ہمت رکھتے ہیں؟ اگر خدانخواستہ یہ کچھ نہیں، تو یہ محرم کس کا ہے؟ بانس کی تیلیوں پر خوش نما کاغذ منڈھنا، ان کاغذی عمارتوں پر تیل بتی جلانا، ڈھول تاشہ بجانا، کیا یہی سامان، عاشورۂ محرم کے استقبال و مدارات کا ہے؟ یہ آپ کے دل کا گڑھا ہوا محرم آخر کس کا ہے؟ کیا ابراہیم خلیلؑ کا؟ کیا موسیٰ کلیمؑ کا؟ کیا خاتم النبیینؐ کا؟ کیا ابوبکرؓ و عمرؓ، عثمانؓ و علیؓ کا؟ کیا حسن بصریؒ و جنیدؒ، شیخ جیلانیؒ و خواجہ اجمیریؒ کا؟ آخر قرآن و حدیث، فقہ و تصوف، شریعت و طریقت، کہیں سے بھی آپ کو اس کی سندِ جواز ملتی ہے، کہ تاریخ اسلام کی اتنی اہم تاریخ کو آپ اس بے دردی کے ساتھ اپنی خواہش نفس کے پورا کرنے میں صرف کر دیں؟"۔ (ص:۵۱، ۵۲)

محاسبۂ نفس:

"آپ نے کبھی اندازہ کیا ہے کہ آپ کے وقت عزیز کا کتنا حصہ خدا کی یاد اور اس کی مخلوق کی خدمت میں صرف ہوتا ہے، اور کتنا اپنے نفس کی ناز برداریوں میں؟ آپ نے کبھی حساب لگایا ہے کہ آپ کی کمائی کا کتنا حصہ خدا کی راہ میں اس کے دوسرے بندوں کے کام آتا ہے اور کتنا اپنے نفس کی خاطرداریوں میں اٹھ جاتا ہے؟ آپ نے اپنے

دل کوٹٹول کر کبھی یہ دیکھا ہے کہ اس پر سب سے زیادہ ہیبت کس چیز کی طاری رہتی ہے؟ آیا خدا کی؟ خدا کے احکام کی؟ رسولؐ کے پیامات کی؟ اور یا پھر سرکار کی؟ برادری کی؟ دنیا والوں کی؟ آپ نے اپنے نفس کا جائزہ لے کر کبھی اس کا کھوج لگایا ہے کہ آپ کو سب سے زیادہ مزہ کس چیز میں آتا ہے؟ آیا قرآن سننے میں؟ نماز پڑھنے میں؟ اور خدمت خلق کرنے میں؟ یا پھر اچھے کھانے اور اچھے لباس میں؟ یار دوستوں کے جمگھٹے میں؟ اور اپنی تعریف سننے میں؟ کیا آپ کے خیال میں وقت کے ایک ایک لمحے کی، آمدنی کے ایک ایک پیسے کی، جسم کی ایک ایک حرکت کی، زندگی کی ایک ایک سانس کی بابت سوال نہ ہوگا؟ یا اس بازپرس سے بچ جانے کی کوئی صورت آپ نے سوچ لی ہے؟

قبل اس کے کہ یہ حساب داخل کرنا پڑے، ایک مرتبہ آپ خود اپنی جگہ پر دوست آشناؤں کے مجمع سے الگ، تنہائی میں بیٹھ کر اپنی ساری عمر پر ایک نظر کر جایئے اور ذرا سوچیے کہ عمر عزیز کا کتنا حصہ اب تک خدا کی مرضی کے موافق بسر ہو سکا ہے؟ اپنے انفرادی اور اجتماعی فرائض کا آپ کہاں تک اہتمام کر سکے ہیں؟ خالق ومخلوق کے حقوق کس حد تک ادا ہو سکے ہیں؟ نماز کی پابندی کس حد تک قائم رہی؟ روزہ، زکوٰۃ اور حج کے فرائض کہاں تک ادا ہوئے ہیں؟ اللہ کا خوف دل میں رہا ہے؟ رسولؐ کی محبت سے گوشۂ قلب منور ہے؟ ایمان کی لذت وحلاوت سے طبیعت آشنا ہے؟ مسلمانوں کے ساتھ ہم دردی وخلوص کا احساس رہا کیا ہے؟ والدین کی خدمت گزاری کی توفیق ملی ہے؟ میراث میں سے لڑکیوں، بہنوں اور پھوپھیوں کو ان کے شرعی حقوق دیے ہیں؟ غیروں کی غلامی سے نکل کر خدا کی غلامی میں آنے کی پوری کوشش کی ہے؟ بچوں کی تعلیم وتربیت میں ان کے حسن عمل وخیر وعاقبت کا خیال زیادہ رہا کیا ہے، یا ان کی آمدنی وملازمت کا؟ اپنے خاندان اور اپنے گھرانے میں صدہا رسمیں جو خلاف شریعت برپا دیکھیں، ان کے مٹانے میں اپنی والی پوری کوشش کر دیکھی؟ فضول خرچی وبدزبانی پر قابو رکھا؟

کیا یہ سوالات آپ کے نزدیک لغو، بے نتیجہ و ناقابل التفات ہیں؟ آپ کے ہاں چوروں نے کبھی نقب نہیں لگائی پھر بھی آپ اپنی چیزوں کی حفاظت کی کتنی فکر رکھتے ہیں! آپ کے کبھی سانپ نے نہیں کاٹا، پھر بھی آپ برسات کے موسم میں اپنی کس قدر احتیاط رکھتے ہیں! پھر کیا موت کے یقینی واقعے کی بابت فکر رکھنا چور اور سانپ کے بعید احتمالات سے بھی گئی گزری چیز ہے؟ کیا ''یہاں'' کے مقابلہ میں ''وہاں'' کے خیال کو پیش نظر رکھنا ایسی ہی بے عقلی و بے دانشی ہے؟ کیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے رہ بران برحق کی سمجھ (نعوذ باللہ) ہمارے سمجھ داروں سے بھی کم تر تھی؟ کیا امام حسینؓ جنہوں نے اپنے ''آج'' کو اپنے ''کل'' پر قربان کردیا، خواہ مخواہ اپنی جان ضائع کر بیٹھے''۔ (ص:۵۸،۵۹)

اسوۂ صحابہؓ پر عمل کرنے کی تلقین

''صحابہ کرامؓ اگرچہ آزادی کی بنا پر خلفاء سے مناظرہ کرتے تھے، مباحثہ کرتے تھے، ردو قدح کرتے تھے، اختلاف کرتے تھے، لیکن اختلاف کو قائم نہیں رکھتے تھے۔ ایک بار حضرت عثمانؓ نے منیٰ میں چار رکعت نماز پڑھی۔ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے اسے سنت رسولؐ و شیخینؓ کے خلاف پا کر اس پر شدید انکار کیا، لیکن اس کے بعد خود چار رکعت ادا کی، لوگوں نے کہا، یہ کیا؟ ابھی اس قدر انکار تھا، اور پھر خود ہی چار رکعت پڑھی! بولے ''اختلاف بری چیز ہے''۔ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ اگرچہ بے حد متبع سنت تھے، اور اس وجہ سے جب منیٰ میں تنہا نماز پڑھتے تھے تو قصر کرتے تھے، لیکن جب امام کے ساتھ نماز کا اتفاق ہوتا تو اختلاف کے خوف سے چار ہی رکعت ادا فرماتے تھے۔ صحابہ کرامؓ اختلاف و تشتت سے اس قدر ڈرتے تھے کہ جن احادیث سے مسلمانوں میں اختلاف پیدا ہوسکتا تھا ان کی روایت سے بھی احتراز فرماتے تھے''۔ (اسوۂ صحابہؓ مولانا عبدالسلام، جلد۲، ص:۴۷-۴۸)

یہ اگر جھوٹی کہانیاں نہیں، سچے واقعات ہیں تو اس طرز عمل کا اپنے طرز عمل سے

مقابلہ کر کے ذرا سوچیے، کہ دونوں میں کوئی بھی مناسبت ہے؟ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے بول کو دہراتے ہوئے اس لحاظ سے ڈرتے تھے کہ کہیں ان سے امت اسلامیہ میں کسی تفریق واختلاف کی بنیاد نہ پڑ جائے، آپ خود اپنی تحریر، تقریر، گفتگو کے کتنے حصوں کو اس خوف سے ضبط کر جاتے ہیں؟ وہ عبادت کی جن صورتوں کو صحیح نہیں سمجھتے تھے ان تک میں دوسرے مسلمانوں کی رفاقت ومعیت حاصل کرنے کو شریک ہو جاتے تھے، آپ جن صورتوں کو صحیح جانتے ہیں، ان میں دوسروں کی رفاقت ومعیت حاصل کرنے کی کہاں تک پروا کرتے ہیں؟ ان کو امت محمدیہ ملت اسلامیہ کی وحدت عزیز تھی، آپ کو اپنی ذات، اپنی بات، اپنی پارٹی، اپنا فرقہ عزیز ہے۔ جب یہ صورت حال ہے تو آخر آپ صحابۂ کرامؓ کے عہد زریں کی برکتوں اور رحمتوں، راحتوں اور مسرتوں کو اپنے تاریک دور میں کیوں تلاش فرما رہے ہیں؟

گلّے کا وجود جب ہی تک ہے جب تک سب بھیڑیں ایک ہی راستے پر چل رہی ہیں، خواہ وہ راستہ کتنا ہی تنگ وتاریک اور ناہموار ہو۔ لیکن ہر بھیڑ اپنی بصارت وبصیرت کے موافق، الگ الگ روشن کشادہ وہموار راستہ اپنے لیے چن لے، تو فرمایئے کہ گلّے کا وجود ایک لمحہ کے لیے بھی قائم رہ سکتا ہے؟ آپ کے رہبروں کی بعض راہیں غلط سہی (اور یقیناً ہوں گی، کہ آخر وہ بھی بشر ہی ہیں) لیکن خدارا سوچیے کہ حیات ملی کیوں کر قائم رہ سکتی ہے؟ آیا ایک دوسرے کے ساتھ رواداری برت کر ان کے ساتھ رہنے میں یا ان پر لعن وطعن کر کے ان سے خانہ جنگی مول لینے میں؟''۔ (ص:۱۳۱،۱۳۲)

وقت امانت خداوندی ہے:

''سن مسیحی کا ایک سال اور ختم ہو گیا۔ بچے، جوانی کی جانب اور جوان بڑھاپے کی جانب، ایک سال اور کھسک آئے۔ بچے، جوان، بوڑھے سب سے موت اور قبر ایک

سال اور قریب ہوگئی۔ اور زندے اور مردے، سب قیامت اور روز حساب سے بہ قدر ایک سال کے اور نزدیک ہوگئے۔ فرصت عمر جو عطا ہوئی تھی اس کی مقدار میں ایک سال اور گھٹ گیا۔ ایک سال کی نیکیوں کا موقع ہاتھ سے ضائع ہوگیا۔ ایک سال کی بداعمالیوں کی سیاہی نامۂ عمل میں اور بڑھ گئی۔ کتنے ایسے ہوں گے جو اپنی اپنی سال گرہ کا جشن منانے کی تیاری کر رہے ہوں گے، جو سال نو کے طلوع پر ایک دوسرے کو مبارک باد دے رہے ہوں گے، جو ''نوروز'' کی خوشیاں منا رہے ہوں گے! پر کتنے ایسے ہیں جنھیں اس وقت کی بیش بہا دولت کے ضائع ہو جانے پر تاسف ہو رہا ہوگا، جو یہ محسوس کر رہے ہوں گے کہ یہ دولت اب دوبارہ کسی طرح نہیں نصیب ہو سکتی اور جو اپنی کوتاہیوں اور غفلتوں کو یاد کر کر کے ان کی تلافی، آنسوؤں کے موتیوں سے کر رہے ہوں گے!

''وقت گزر گیا'' ''وقت چلا گیا'' اس قسم کے فقرے جو آپ رات دن بولتے رہتے ہیں، کبھی آپ نے ان کے معنی پر غور کیا؟ کبھی آپ نے یہ بھی سوچا ہے کہ وقت کے گزر جانے سے مفہوم کیا ہوتا ہے اور یہ وقت جو چلا جاتا ہے، سو آخر کہاں جاتا ہے؟ سرے سے ناپید تو ہو نہیں جاتا، اور نہ یہ آپ کبھی کہتے ہیں۔ آپ تو ہمیشہ صرف اسی قدر کہتے ہیں کہ وقت گیا۔ ہر جانے والا آخر کہیں نہ کہیں ہی جاتا ہے، پھر یہ وقت کہاں چلا جاتا ہے؟ ایک مسلمان کے لیے اس کا جواب کچھ بھی دشوار نہیں۔ اسے شروع ہی سے یہ بتا دیا گیا ہے، کہ ہر شے خدا ہی کی طرف واپس جاتی رہتی ہے۔ پس وقت بھی وہیں جاتا ہے، اور ہر سال، ہر مہینہ، ہر ہفتہ، ہر روز، ہر گھنٹہ، ہر لمحہ غرض وقت کا ہر حصہ وہیں چلا جاتا ہے اور اسی ذخیرہ غیب میں جمع ہوتا چلا جاتا ہے۔ گویا فطرت کا وہ عظیم الشان خزانہ یا توشہ خانہ جس میں ہر شے جمع ہو جاتی ہے، وہیں ہر گزرا ہوا وقت بھی بطور ایک امانت کے جمع ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اب جس شے کو مذہب کی بولی میں قیامت اور روز حشر کہا جاتا ہے اس کی حقیقت بھی یہی ہے کہ وہ گزرے ہوئے وقت کی واپسی اور بازگشت کا وقت ہوگا۔ ہر لمحہ اور ہر دقیقہ

جواسی دنیا میں گزر چکا ہے اور جو بطور امانت خزانہ غیب میں جمع ہوتا چلا جارہا ہے، اس وقت پھر از سرنو باہر لایا جائے گا۔ اور ہر ''ماضی'' کا نقش ایک بار پھر ''حال'' کے آئینے میں نمودار ہوجائے گا!

ظاہر ہے کہ ہم جو کچھ بھی کرتے ہیں، کسی نہ کسی وقت کے اندر کرتے ہیں، پس وقت کی مراجعت وبازگشت کے صاف معنی یہ ہیں کہ ہمارے سارے عمل اور کرتوت، ہماری نیکیاں اور بدیاں، ہمارے قول اور فعل، ہمارے حرکات اور سکنات، سب کچھ ہمارے سامنے از سرنو لا حاضر کیے جائیں گے اور یہی مراد ہے یوم بعث وروز حشر سے۔ اب ارشاد ہو، آپ اس وقت کا سامنا کرنے کو تیار ہیں؟ آج جن چالاکیوں سے آپ دوسروں کا مال اُڑا رہے ہیں، اپنی جن ہوشیاریوں اور دانائیوں پر آج آپ خوش ہورہے ہیں، زندہ دل ورنگین مزاج احباب مجلس کی صحبتوں میں آج آپ جو جو حرکتیں کررہے ہیں، رات کی اندھیریوں میں آج آپ کو جن سیہ کاریوں کی مہلت مل رہی ہے، دن کی روشنیوں میں آج آپ اپنی دولت وحکومت کے جو تماشے دیکھ رہے ہیں، گھر کی خلوت میں آپ اپنے ظلم وغضب ناکی کے جو نمونے پیش کررہے ہیں، باہر کی جلوت میں آج آپ اپنی جس ریاکاری کی نمائش فرمارہے ہیں، ان میں سے ایک ایک شے وقت کے رجسٹر میں درج ہورہی ہے، وقت کے کیمرے میں اس کی تصویر اترتی جارہی ہے۔ جس وقت یہ رجسٹر کھل کررہے گا، جس وقت یہ مرقع نظر کے سامنے آکر رہے گا، سوچیے اور سمجھیے کہ اس وقت آپ کے دل پر کیا گزرے گی؟ سنبھلیے کہ ابھی سنبھلنے کا موقع باقی ہے۔ جاگیے کہ بہت سوچکے، روئیے کہ بہت ہنس چکے، حاصل کیجیے کہ بہت ضائع کرچکے۔ پچھلا سال اگر بالکل غفلتوں اور نادانیوں کی نذر ہوچکا ہے تو اس سے سبق لیجیے اور دل میں پختہ عہد کیجیے کہ اگر زندگی ہے تو زندگی کا یہ سال بے کار نہ جانے پائے گا۔ رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْلَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ''. (ص: ۱۴۳، ۱۴۴)

اسلام کی تبلیغ واشاعت کے لیے کرار واخلاق کی ضرورت واہمیت:

''مولانائے رومؒ اپنی مثنوی میں ایک حکایت لکھتے ہیں کہ کسی شہر میں ایک نہایت بدآواز مؤذن رہتا تھا۔ اس کی آواز اس قدر بھیانک اور ہیبت ناک تھی کہ لوگ اسے سن کر ڈر ڈر جاتے تھے۔ آخر سارے بستی والوں نے مل جل کر اس کے لیے چندہ جمع کر دیا اور اس سے منت سماجت کی، کہ وہ کسی اور شہر کو مشرف فرمائیں۔ اتفاق سے ایک قافلہ مکہ معظمہ کو جانے والا ادھر سے گزرا، مؤذن صاحب اس کے ہم راہ ہو گئے۔ راستے میں ایک منزل ایسے مقام پر پیش آئی، جہاں ہر طرف کافر ہی آباد تھے۔ یہ مؤذن صاحب اپنی آواز پر خود عاشق تھے، فوراً اذان دینے کھڑے ہو گئے۔ ان کی اذان کے بعد بستی کا ایک کافر رئیس ان کی تلاش میں بہت سے تحفے تحائف لے کر آیا، اور ان کی خدمت میں پیش کیا۔ لوگوں نے پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ اس نے کہا کہ ''میری ایک ہی لڑکی ہے جسے میں جان سے عزیز رکھتا ہوں۔ وہ مدت سے اسلام کی جانب مائل ہو رہی تھی، سمجھانے، بجھانے، روکنے کی ہر تدبیر کر کے میں تھک چکا تھا اور وہ اپنی ہٹ سے باز نہیں آتی تھی۔ آج آپ کے مؤذن نے جس بھیانک اور دہشت انگیز آواز سے اذان دی، اسے سن کر وہ ڈر گئی اور اسے اختلاف ہونے لگا۔ یہ موقع پا کر میں نے اسے سمجھایا کہ یہی اس دین والوں کی پکار ہے، جس کی طرف تیرا دل مائل ہے۔ پہلے تو اس نے یقین نہیں کیا لیکن جب یقین ہو گیا تو اس وقت سے اس کا دل خود بخود اسلام کی جانب سے ہٹ گیا ہے اور اب وہ اپنے قدیم دین پر قائم ہے۔ آپ کے مؤذن صاحب کا میرے اوپر یہ ایسا زبردست احسان ہے جس کا معاوضہ میں ادا ہی نہیں کر سکتا۔

یہ کوئی ہنسنے ہنسانے والا لطیفہ نہیں۔ درد و عبرت کا سامان رکھنے والا موعظہ ہے۔ اپنی حالت پر غور کیجیے، اپنی زندگی کا محاسبہ کیجیے، اپنے طرز عمل کا جائزہ لیجیے کہ کہیں آپ تو وہ

بدآواز موذن نہیں؟ کہیں آپ ہی تو اپنی بدآوازیوں سے، اپنی ہی سامعہ خراش نہیں، دل خراش تقریروں اور گفتگوؤں سے لوگوں کے دلوں کو اسلام سے نہیں پھیر رہے ہیں؟ کہاں آپ ہی تو اپنی بھیانک صداؤں اور دہشت انگیز آوازوں سے دلوں میں نفرت و وحشت نہیں پیدا کررہے ہیں؟ کہیں آپ ہی تو اپنی بدکرداریوں و بدنمائیوں سے اسلام کو رسوا و بدنام نہیں کررہے ہیں؟ کہیں آپ ہی کی نظموں اور لطیفہ سنجیوں، ریز رولوشنوں اور ہنگامہ آرائیوں کو سن کر اور پڑھ پڑھ کر تو ایسا نہیں ہو رہا ہے کہ بڑھتے ہوئے قدم پھر واپس ہوتے جاتے ہیں، دل گرم ہو ہو کر پھر سرد پڑتے جاتے ہیں، کشش پیدا ہو ہو کر پھر ماند پڑتی جاتی ہے؟

آج آپ نے اپنی زندگی کا کون سا رخ، کون سا شعبہ، کون سا پہلو غیروں کے سامنے پیش کیا ہے، جس پر وہ اپنے دین کو چھوڑ کر آپ کے گروہ میں شامل ہونے کو بڑھیں؟ آج آخر وہ کس چیز میں آپ کو اپنے سے ممتاز پا سکتے ہیں؟ دیانت میں، امانت میں، سچائی میں، خلوص میں، پاک بازی میں، پارسائی میں، قناعت میں، پاک نظری میں، یک دلی میں، فیاضی میں، خدا ترسی میں، مزاج کی نرمی میں، برداشتِ مصائب میں، تمام اخلاقی فضائل میں، آخر کون سا جوہر آپ میں موجود رہ گیا ہے، جسے دیکھ کر وہ آپ کی طرف شوق و اشتیاق، رغبت و عقیدت کے ساتھ لپکیں؟ آپ کی ''بدآوازیاں'' بے گانوں کو اپنانے والی ہیں، یا اس کے برعکس اور اپنوں کو بھی بے گانہ بنانے والی؟ اگر اسلام (نعوذ باللہ) صرف اسی قدر رہ ہے، جو ہمارا اور آپ کا اسلام ہے، تو آخر اس اسلام کے کس پہلو پر کفر کو رشک آئے؟''۔ (ص:۱۷۹، ۱۸۰)

عبرت زائی کی ایک مثال:

''آپ کے خاندان میں، برادری میں، محلے میں کوئی بے کس ولاوارث، مفلس محتاج، بوڑھی بیوہ رہتی ہیں؟ اگر ہیں، تو کبھی آپ کو ان کے غربت کدے پر قدم رنجہ فرمائی

کا اتفاق ہوتا ہے؟ اگر اب تک نہ ہوا ہو تو اب کسی روز اپنی ''اہم مشغولیتوں'' سے اپنی ''دلچسپ'' صحبتوں سے فرصت نکال کر ذرا اس زندہ گورستان کی بھی سیر فرمالیجیے۔ یہاں گرمیوں کے موسم میں برف و شربت سے آپ کی خاطر داری نہیں کی جائے گی، سردی میں چائے کی پیالیاں آپ کے آگے نہیں پیش کی جائیں گی، پان اور حقے سے آپ کی پیشوائی نہیں ہوگی، عطر کی خوشبوئیں آپ کے استقبال کو آگے نہیں بڑھیں گی، دوستوں کے قہقہے و چہچہے آپ کو محظوظ نہیں کریں گے۔ ان کی اگر تلاش وطلب ہے تو شام کا وقت کسی سرسبز پارک میں، کسی نظر فریب سنیما میں، کسی جگمگاتے ہوئے ہوٹل میں، کسی ٹھنڈی سڑک پر گلگشت میں صرف فرمایئے۔

یہ آنکھوں سے اندھی اور کانوں سے بہری بیوہ، میلے کچیلے بدبودار کپڑے پہنے، جو پلنگ کے ایک جھلنگے پر آپ کے سامنے بیٹھی ہوئی ہے، سدا سے ایسی نہیں۔ یہ بچی بھی کبھی اپنے ماں باپ کی آنکھوں کا تارہ تھی۔ بڑی آرزوؤں اور ارمانوں کے بعد پیدا ہوئی تھی۔ اس نورِ نظر کی پیدائش کے وقت بھی مامتا کے مارے ہوئے ماں باپ نے دل کھول کر اپنے حوصلے نکالے تھے۔ خوب زچہ گیریاں گائی گئی تھیں، اس مکھڑے کی خوب بلائیں لی گئی تھیں اور اس دختر نیک اختر کے نصیبہ ور ہونے کی دعائیں اور پیش گوئی خدا جانے کتنی زبانوں سے نکلی تھیں! پیدائشی اندھی نہ تھی، بہری نہ تھی، حور و پری کا حسن و جمال نہ سہی، آدمی کے بچے کی شکل وصورت رکھتی تھی۔ گھر بھر کو اپنی موہنی باتوں سے موہ لیا تھا۔ بات چیت کئی گھرانوں سے آئی۔ جہاں کے لیے قسمت لائی تھی، وہاں منگنی اور بیاہ، حوصلوں اور ارمانوں کے ساتھ ہوا، ڈولا دھوم دھام سے اتارا گیا، نوجوانی کا غازہ اس کے چہرے پر بھی تھا۔ پہلو میں دل تھا اور دل میں ہر قسم کے شوق، ہر طرح کی امنگیں۔ شوہر کے دل پر حکومت کی۔ حسن تھا، اور نوجوانی، جو مانگا وہ پایا، جو کہا وہی ہوا۔ سامنے دنیا تھی اور اس کی بہاریں، زندگی تھی اور اس کی لذتیں۔ گرمیوں میں پھولوں کا زیور پہنا، برسات میں ہم جولیوں کے

ساتھ جھولے کے پینگ بڑھے، جاڑوں کی راتیں، عطر سے بسے ہوئے لحافوں کے اندر کاٹیں۔ پہنا اوراوڑھا، کھایا اور کھلایا، ہنسی اور ہنسایا، زیور بنا، کپڑے سلے، دیگیں چڑھیں، شادیانے بجے اور ''آج'' نے ''کل'' کا خیال تک نہ آنے دیا!

ایک دن وہ تھا، جب ان کے ہاں سے دوسروں کو خیرات ملتی تھی، آج یہ خود دوسروں کی نگاہوں کو تک رہی ہیں! ایک زمانہ وہ تھا، جب ان نئی دلہن کے عقل وشعور، ہنروسلیقے کے چرچے سسرال بھر میں تھے، آج اسی دکھیاری رانڈ کی بے وقوفی بھی ضرب المثل بنی ہوئی ہے! کل یہ نگاہیں خدا معلوم کتنے دلوں پر بجلیاں گرا رہی تھیں، آج پیشانی کے نیچے ان دو بے نور گڈھوں کو دیکھ کر کوئی اس کا یقین بھی نہیں کرسکتا! کل یہی سرخ وسفید رخسار گلاب کے تروتازہ پھول تھے، آج جھریاں پڑی ہوئی ان پچکی ہوئی ہڈیوں پر کسی کو اس کا گمان بھی نہیں ہوسکتا! کل انہی نئی دلہن اوران کی ہم جولیوں کی ہنسی، دل لگی، تیزی اور شوخی، گھرانے بھر کو ہنساتے ہنساتے لٹارہی تھی، آج اسی سوگوار بیوہ کے رونے پر کسی کو رونا بھی نہیں آتا! کل پاس پڑوس کی عورتوں کے جمگھٹے سے یہی گھر گلزار بنا ہوا تھا، آج یہ ویرانہ صرف چڑیوں کے گھونسلے بنانے کے قابل رہ گیا ہے! ع

شریک غفلت بہت ملیں گے، شریک عبرت کوئی نہ ہوگا!

اپنی خوش وضعی اورخوش لباسی، اپنی نوعمری اور جامہ زیبی، اپنی شوخی اور زندہ دلی پر بھروسہ رکھنے والوں اور اترانے والو! دوسروں کے حال سے عبرت حاصل کرو، اور خدا نہ کرے کہ تمہارا حال دوسروں کے لیے لائق عبرت بن جائے!''۔ (ص: ۱۹۳، ۱۹۴)

''سچی باتوں'' کا انتخاب پہلی مرتبہ کتابی شکل میں دکن پبلشرز حیدرآباد نے ۱۹۴۲ء میں شایع کیا تھا۔ کتاب کی افادیت واہمیت کے پیش نظر رب کریم کی توفیق سے صدق فاؤنڈیشن لکھنؤ کی جانب سے اس کتاب کی جلد اول شایع کی گئی ہے۔ اس جلد میں ۱۹۲۵ء سے ۱۹۲۷ء کی منتخب ''سچی باتیں'' شامل ہیں۔ موضوعات کی کم وبیش یکسانیت کے

سبب قارئین کی سہولت کے لیے ان مضامین پر نمبر ڈال دیے گئے ہیں۔ ان میں توحید کی دعوت، سیرت پاکؐ، صحابہؓ کے واقعات اور معاشرہ کی اصلاح جیسے مفید و کارآمد مضامین شامل ہیں۔ اس مجموعے کی ابتدا میں ۷ مضامین وہ ہیں جو مولاناؒ نے اپنی عمر سے متعلق 'سچ'، 'صدق'، اور 'صدق جدید' میں تحریر کیے تھے، ان کے علاوہ سچی باتوں کے ۹۱ نمبر شامل ہیں۔
خدائے رحمٰن ورحیم سے دعا ہے کہ ہمارے اس عمل کو قبول فرمائے۔ آمین

تمدن اسلام - چند جھلکیاں

اسلام ایک زندہ مذہب ہے۔ اس کا خدا زندہ ہے۔ اس نے اپنے ماننے والوں کے لیے زندہ رسول، زندہ شریعت، زندہ تمدن، زندہ تہذیب اور زندہ ثقافت نازل کی ہے۔ اسلام خدائے کائنات کا آخری اور پسندیدہ دین ہے۔ وہ جس طرح بنی نوع انسان کی دنیا اور آخرت کی حقیقی فوز وفلاح، تعمیر وترقی اور خوش حالی کا ضامن اور پاس بان ہے، اسی طرح وہ اعلیٰ انسانی فضائل اور بشری کمالات کا جامع، نقیب اور نگہ بان ہے۔

رب کریم نے تمام انسانوں کی رہ نمائی کے لیے اپنے برگزیدہ بندوں کو مبعوث کیا۔ بندگان رحمان کی وہ قدوسی جماعت جن آداب، صفات اور کمالات سے آراستہ تھی، اصلاً اسی مجموعے کا نام الٰہی تمدن، رحمانی تہذیب اور ربانی ثقافت ہے۔ اسی تمدن، اسی تہذیب اور اسی ثقافت میں نسل انسانی کی بقا، اس کا حقیقی فائدہ اور اس کی تعمیر وترقی کا راز مضمر ہے۔ تمدن، تہذیب اور ثقافت کے اسی معیار مطلوب کی دعوت رحمۃ للعالمین، خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سیرت پاک کے ذریعے دی۔ آپؐ کے بعد یہی دعوت آپؐ کے سچے خلفائے راشدینؓ اور چہیتے صحابہ کرامؓ نے دی۔

تمدن کے لغوی معنی ہیں شایستہ اور مہذب ہونا۔ شایستگی اخلاق اور تہذیب نفس کار نبوت کے فرائض میں ہیں۔ انبیائے کرام علیہم السلام کی سیرتیں اس بات کی گواہ ہیں کہ ان قابل صد احترام شخصیتوں نے انسانی نفوس کے تزکیے، تصفیے اور تجلیے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ پیمبران عظام علیہم السلام کے سلسلہ طلائے ناب کے آخری درتابندہؐ نے آدم

سازی اور مردم گری کی وہ مثال قائم کی جس کی کوئی نظیر انسانی تاریخ پیش نہیں کر سکتی۔

دنیائے معلوم کے کسی بھی خطے کے باشندے، عرب کے ان بادیہ نشینوں کے احسانات سے سر نہیں اٹھا سکتے جنہوں نے فرمودۂ نبویؐ "فلیبلغ الشاھدالغائب" کی انجام دہی کے لیے نہ صحراؤں کی پروا کی، نہ دریاؤں کی اور نہ "متمدن" بستیوں کی۔ ان کے فیض سے محروم رہے نہ آبی اور نہ خاکی۔

ان پاک بازوں کے پیش کردہ اسلامی تمدن کی بنیادیں خدا ترسی، تقویٰ، اخلاص، باطن کی طہارت، قلب ونظر کی پاکیزگی، امانت داری، ایمان داری، یاد آخرت، خلق خدا پر رحمت، بزرگوں کی بزرگ داشت، چھوٹوں پر شفقت، صدق گفتاری، صداقت شعاری، ایفائے عہد، حقوق کی ادائی، فرائض کی انجام دہی اور دیگر اعلیٰ انسانی صفات پر استوار ہوتی ہیں۔

یہ تمدن فتنہ وفساد، جنگ وجدال، ظلم وزیادتی، قتل وغارت گری، دہشت گردی وتشدد، شرک وبدعت، نفاق، جھوٹ، شراب خواری، سود خوری، بے حیائی، فحاشی، دھوکہ بازی، عیاری، مکاری، غیبت، چغلی، تہمت، بہتان طرازی، غصب وغبن اور دوسرے رذائل اور خرافات سے بالکل پاک وصاف ہے۔

اسلامی تمدن وتہذیب میں دن کا آغاز اللہ تعالیٰ کی کبریائی کے اعلان اور تلاوت واذکار کے زمزموں سے اور اختتام تسبیح وتہلیل اور مناجات کے کلموں پر ہوتا ہے۔ اس تمدن کے پروردہ افراد دن میں سرگرم کار اور رات میں زاہد شب زندہ دار ہوتے ہیں۔ یہ تمدن اپنی آفرینش کے وقت سے آج تک ہر ماحول، ہر زمانے اور ہر علاقے میں ہمہ وقت زندہ، توانا اور مضبوط ثابت ہوا ہے۔ یہ کسی بھی دور میں کہنہ، بوسیدہ اور از کار رفتہ نہیں ہوا۔

شپرہ چشم ہیں وہ افراد جنہیں اسلامی تمدن سجھائی نہیں دیتا! آج غیر اسلامی تمدن کی وقتی چمک دمک ذہنوں کو مرعوب کر رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مادیت کی چکاچوند

سے ہرایک کی آنکھیں خیرہ ہوئی جارہی ہیں۔ اخلاقی اقدار کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔ خوب وناخوب کا معیار بدل گیا ہے۔ بے دار مغز اور روشن دماغوں نے ناموافق حالات کے آگے گویا سپر ڈال دی ہے۔ طاغوتی طاقتیں، دجالی تہذیب وتمدن کو پوری دنیا پر نافذ کرنا چاہتی ہیں۔ خدا بے زار اور آخرت فراموش مغربی تہذیب وتمدن کے دل دادگان اسلامی تہذیب وتمدن کو رسوا اور دقیانوسی ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

فرزندان اسلام کا یہ فریضہ ہے کہ وہ تہذیب وتمدن اور ثقافت کے معیار مطلوب کی تلاش میں سرگرداں دنیائے انسانیت کو یہ بتائیں کہ اسلامی تمدن کیا ہے؟ اور اس کے مقابل جتنے بھی تمدن اور تہذیبیں کھڑی کی جارہی ہیں وہ سب تار عنکبوت کی طرح ہیں اور یہ سب انسانیت کے لیے نہایت نقصان دہ ہیں۔

'تمدن اسلام' کے عنوان پر مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے یہ دو بے نظیر اور بیش قیمت علمی مقالے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے طلبہ کی ''انجمن اسلامی تاریخ وتمدن'' کے زیراہتمام اسلامی ہفتہ منائے جانے کے ضمن میں علی الترتیب اگست ۱۹۳۸ء اور ۲۹ر اکتوبر ۱۹۴۱ء کو حامد ہال، رام پور اور اسٹریچی ہال، مسلم یونی ورسٹی میں پڑھے تھے۔

بعدازاں اس انجمن نے ''تمدن اسلام کا پیام بیسویں صدی کے نام'' اور ''تمدن اسلام کی کہانی اسی کی زبانی'' کے مقفیٰ اور پرکشش عنوانات کے ساتھ شایع کیے تھے۔ اس کے کئی برس بعد ادارہ ادبیات دلی نے حکیم عبدالقوی دریابادی سابق مدیر ہفتہ وار صدق جدید لکھنؤ کے دیباچے کے ساتھ ان مقالوں کو ''تمدن اسلام'' کے نام سے شایع کیا۔

صدق فاؤنڈیشن لکھنؤ کے کارکن اپنی سعادت وخوشی سمجھ کر ان مقالات کو شایع کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ آمین۔

خاص بات یہ ہے کہ اسلامی تمدن پر لکھے جانے والے یہ قیمتی مقالے ستر برس سے زائد مدت گزر جانے کے بعد آج بھی تازگی، شادابی اور شگفتگی سے پُر ہیں۔

ذیل میں ان علمی، ادبی اور تاریخی مقالوں کے چند اقتباسات درج ہیں:

''تمدنِ اسلام کے معنی یہ نہیں کہ کسی ملک یا زمانے کی مسلمان آبادی نے اکٹھے ہو کر جغرافی، تاریخی، نسلی حالات کے ماتحت اپنے لیے کچھ دستور وضع کر لیے اور ان کا نام تمدن اسلام رکھ لیا۔ تمدن اسلام نام ہے اسلام کے تمدن کا، مسلمانوں کے تمدن کا نہیں۔ میں مصنوع نہیں، مخلوق ہوں، بندوں کے ذہنی اختراع کا نتیجہ نہیں، خالق کے احکام کا آئینہ بردار ہوں۔ مسیحی تمدن، ہندو تمدن وغیرہ کے الفاظ سے دھوکا کھا کر میرے متعلق یہ نہ فرض کر لیجیے کہ جس طرح وہ نام ہیں دوسری قوموں کے ہزار ہا سالہ مجموعی تاریخی روایات کے، حکایات کے، خرافات کے، اسی طرح میں بھی پیداوار ہوں، عرب وعجم کے اختلاط کا، یادگار ہوں طغرل وسنجر کے اقتدار کا! تمدن اسلام صرف وہ تمدن، وہ طرزِ زندگی ہے، جو ثابت ہے قرآن پاک سے اور سنت رسول انامؐ سے اور یا پھر مستنبط ہوتا ہے انہی دونوں سے ائمہ مجتہدین واکابر فقہاء کے قواعد واصول سے۔ یہ تصریح اس لیے ضروری ہوئی کہ کہیں تعزیہ اور علم، براق وضریح، روشنی وآتش بازی، حلوہ وملیدہ، ڈھول اور طنبورہ، چادر اور گاگر کو بھی میرا جزو نہ سمجھ لیا جائے، حاشا! میں ان سے بَری، ایک بار نہیں، ہزار بار بَری!''۔ (ص:۱۶)

''میرے زمانہ عروج واقبال کی تاریخ پڑھ جایے، اس عہد میں بھی کوئی مشہور جواری ملے گا! قمار کی عزت کسی کے ساتھ اور کسی پردے میں نظر آئے گی؟ میرے دور میں بھی کہیں اس کی نظیر ملے گی کہ فلاں عظیم الشان راجہ اپنے بھائیوں سمیت اپنا راج پاٹ، بلکہ اپنی عزت وناموس تک جوئے میں ہار بیٹھے اور آخر جلاوطنی پر مجبور ہوئے؟ میرے عہد میں بھی راجہ نل بطور ہیرو کے نظر آئیں گے؟ میرے ہاں بھی دستور رہا ہے کہ نوروز، یوں منایا جائے کہ لکشمی دیوی کی پوجا کے ساتھ جوئے کو بھی جزوِ عبادت بنالیا جائے اور قانون تعزیرات ہند تک کو دو تین دن کے لیے جوئے کی آزادی دینی پڑے؟ میرے دور میں بھی کسی ماؤنٹ کارلو کی شہرت چمکی ہے؟ میرے ہاں بھی کہیں ایسا ہوا ہے کہ کسی علاقے کی آمدنی کا بڑا حصہ جوئے ہی کی رقم سے آتا ہو؟ اس وقت بھی کسی شہر سے متعلق یہ تصریح آپ کو ''انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا'' میں نظر پڑتی ہے کہ

وہاں کے جوئے کی آمدنی کا ٹھیکہ فلاں کمپنی نے لیا ہے اور وہ ہر سال حکومت کو ۹۰، ۹۰ ہزار، یا ایک ایک لاکھ پونڈ دیتی رہتی ہے! ۱۳، ۱۳ لاکھ روپیہ سالانہ جب کمپنی کے کمیشن کا ایک حصہ ہوا، تو اس بے انداز دولت کا جو جواریوں کی جیبوں میں اَدل بدل کرتی رہتی ہے کوئی اندازہ کر سکتا ہے؟
''انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس'' کا مقالہ نگار لکھتا ہے کہ قمار بازی کی بندش ہو کیوں کر، اس کی عمر تو تاریخ انسانیت کے دامن سے وابستہ ہے۔ بے شک یورپ کی تحقیق میں ایسا ہی ہوگا، کاش اس کلیے سے تمدن اسلام کو مستثنیٰ کر دیا ہوتا!''۔ (ص:۱۹)

''حاکم اور محکوم کے باہمی تعلق کے اندازے میں دنیا اب تک کیسی کیسی خوں ریز غلط فہمیوں کا شکار رہی ہے! اور آج تک انہی غلط فہمیوں پر اصرار ہے۔ کوئی روس کی سوویٹ کے بت کا پجاری ہے اور کسی کا عقیدہ ہے کہ فلاح قوم ونجات ملک، نازیت یا فسطائیت سے وابستہ ہے اور کسی نے اپنی لَو ڈیموکریسی (عمومیت) سے لگا رکھی ہے۔ اور پھر ان میں سے ہر ایک عقیدے کے ''پرچار'' (اشاعت) کے لیے دلائل استعمال ہو رہے ہیں، توپ اور مشین گن، بم اور گیس کے۔ میں نے اپنی طاقت کے وقت بتایا اور بتایا کیا صاف صاف راستہ دکھایا، کہ یہ ساری غلط فہمیاں شاخ ہیں ایک اساسی غلط فہمی، یعنی مقصد حکومت کی۔ گم راہی کی جڑ یہی ہے، انسان نے حاکم، اپنے کو سمجھ لیا اور قوی کم زور پر، زبردست زیردست پر حکمراں ہو بیٹھا۔ میں نے علی الاعلان کہا کہ حکومت تو صرف اللہ کی ہے۔ اِنِ الْحُکْمُ اِلاَّ لِلّٰہِ. بشر بشر پر حاکم کیسے ہو سکتا ہے؟ البتہ بشر کا کام خلافت الٰہی، نیابت الٰہی، قوانین الٰہی کا نفاذ ہے۔ قانون ساز وہ نہیں، قانون ساز تو کوئی اور ہے۔ بشر کا کام، الٰہی قاعدوں اور ربانی ضابطوں کو دنیا میں صرف چلانا، پھیلانا ہے۔ کانسٹی ٹیوشن (آئین ودستور) والی ساری دشواریاں اس ایک نکتے سے کافور ہو گئیں۔ اب میرے سامنے یہ سوال ہی نہ رہا کہ کانسٹی ٹیوشن کیا ہو؟ سوال صرف یہ رہ گیا کہ اس کے چلانے والے کون ہوں؟ وہ ہوں جو متدین ہوں، جو صاحب ضمیر ہوں، کیرکٹر والے ہوں، امین ہوں، متقی

ہوں، اپنے اعمال واقوال واحوال کے ذمہ دار وجواب دہ، مخلوق کے سامنے نہیں، خالق کے سامنے ہوں۔ اور صدیقؓ وفاروقؓ کی حکومتوں نے دکھلا دیا کہ بغیر انسانی دماغوں کے تیار کیے ہوئے کاغذی طومار کے، بغیر لکھوکھا روپے کی اسمبلی اور کونسل کی عمارتوں کے، بغیر کونسلوں میں لامتناہی سلسلہ سوال وجواب کے، بغیر منسٹروں، سکریٹریوں، پارلیمنٹری سکریٹریوں کی وساطت اور بغیر سکریٹریٹ کی انبوہ درانبوہ فوج کے، روئے زمین پر عدل کی حکومت کس طرح قائم ہوسکتی ہے''۔ (ص:۲۱، ۲۲)

''میں نے جس طرح طلاق کو عین فطرت بشری واحوال انسانی کے مطابق، چند قیود وشرائط کے ساتھ محدود کر کے روا رکھا ہے، اُسی طرح مرد کے لیے بھی چار شادیوں کی اجازت، اس کی ضرورتوں، مصلحتوں، سہولتوں کی رعایت، نیز ملک وقوم کے عرف عام کا اعتبار کر کے دی ہے اور علاوہ عدل کے، طلاق ہو یا تعدد ازدواج، بطور قاعدۂ کلیہ، حسن معاشرت کی قید ہر جگہ لازمی رکھی ہے۔ وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ. (سورہ نساء:۱۹) ایسی کسی صورت کی گنجایش میں نے نہیں رکھی کہ عورت پر خواہ مخواہ ظلم ہو۔ ہندیوں نے مدتوں ایک بیاہتا بیوی کے ہوتے دوسری بیوی کا نام لیتے کانوں پر ہاتھ دھرے۔ فرنگیوں نے ''پالیگمی'' کا تلفظ کر کر کے خوب خوب ٹھٹھے لگائے، لیکن حقایق وواقعات کی ٹھوس دنیا نہ تبرّی وتحاشی کے نعروں سے پگھل سکتی ہے، نہ تالیوں اور قہقہوں سے۔ اب The Case for Polygamy کے نام سے خاص لندن میں بیٹھ کر کتابیں لکھی جاتی ہیں اور طنز وتعریض کے نعروں میں بھی اب نہ وہ بلند آہنگی باقی رہ گئی ہے، نہ وہ جوش وخروش۔ صنفیات کے وہ نئے نئے پیچ دار مسائل جنھوں نے برنارڈ شا اور برٹرینڈ رسل جیسے فلسفیوں اور مفکروں سے لے کر ادنیٰ اخبار نویسوں تک کو غلطاں وپیچاں، حیراں وسرگرداں کر رکھا ہے۔ کبھی میرے دورِ عروج میں بھی پیدا ہوئے تھے؟ White Slave Traffic کی الجھنیں سلجھانے والی بیسیوں کمیشنوں اور کمیشنوں کے بعد بھی قائم رہ جانے والی الجھنیں، کبھی اس وقت بھی

نمودار ہوئی تھیں؟ برتھ کنٹرول اور کنٹراسپشن کی عالم گیر ہنگامہ خیزی، گو خود یورپ وامریکہ میں ذلت ونامرادی کا منھ دیکھ رہی ہے، لیکن مس رابرٹ سینگر اور مس میری اسٹوپس کے بے پناہ پروپیگنڈے کی سلامتی میں خود ہندوستان کے ایک ایک اسکول تک پہنچ چکی ہے۔ مگر جن ممالک میں میرا آج بھی تھوڑا بہت اثر باقی ہے، نجد وحجاز ومراقش وغیرہ، وہاں کوئی خواب بھی اس کا دیکھ سکتا ہے؟ پیشہ ور (پروفیشنل) اور شوقیہ (امیچور) پراسٹی ٹیوشن کے یہ اعداد (ملاحظہ ہو اسکاٹ کی ''ہسٹری آف پراسٹی ٹیوشن'') بن بیاہی ماؤں کی یہ افراط، ناجائز ولادتوں کا یہ انبار، آج بھی کہاں ہے؟ ماسکو اور نیویارک، لندن اور پیرس کے جگمگاتے ہوئے ہوٹلوں، پارکوں اور ایوانوں میں یا اُن ملکوں اور شہروں میں جہاں اب بھی میرے کچھ ٹوٹے پھوٹے آثار پائے چلے جارہے ہیں؟''۔ (ص: ۲۴، ۲۵)

''میرے پیام کا خلاصہ در خلاصہ چند لفظوں میں یہ ہے کہ دنیا کے لیے پیام امن اگر ہے تو میری ہی ذات ہے۔ خوب غور کر کے دیکھ لیجیے۔ جرائم کی تعداد روز افزوں کہاں ہے اور بمنزلہ صفر کہاں؟ چوری کے، ڈکیتی کے، نقب زنی کے، آتش زنی کے، زہر خورانی کے، جعلی دستاویزوں کے، حرام کاری کے، دروغ حلفی کے، قتل کے، ضرب شدید وخفیف کے، خودکشی کے واقعات وہاں زیادہ پیش آتے ہیں، جہاں میرے نام سے بھی عداوت ہے، یا جہاں میری تھوڑی بہت حکومت قائم ہے؟ جنون اور دماغی اور عصبی بیماریاں شدت سے کہاں پھیلی ہوئی ہیں؟ میری عمل داری میں، یا میرے دشمنوں کے قلمرو میں؟ اندھے پن کے، بہرے پن کے، آنکھوں اور کانوں کی، طرح طرح کی پے چیدہ بیماریوں کے لیے نئے نئے آلات کی، نئے نئے اسپتالوں کے کھلنے کی ضرورت کہاں پیش آرہی ہے؟ کالجوں والے، یونیورسٹی والے، سنیما والے، تھیٹر والے، ٹرام والے، مل اور فیکٹری والے، ورک شاپ اور مشین والے شہروں میں، یا وہاں، جہاں ابھی تک میری سادگی قائم ہے؟ معدہ، آنت، دانت اور آلات ہضم کی خرابیاں کہاں زیادہ پھیل رہی ہیں؟ وہاں، جہاں بڑے

بڑے شان دار ہوٹل موجود ہیں، جہاں پُر تکلف غذاؤں پر منھ ہر وقت چلتا رہتا ہے، جہاں برف اور طرح طرح کے مصنوعی پانیوں کی گرم بازاری رہتی ہے، اور جہاں سگریٹ اور سگار اور وہسکی کے دَور ہر وقت چلتے رہتے ہیں، یا میرے سادہ دستر خوان پر؟ عام صحتیں کہاں درست رہتی ہیں؟ وہاں، جہاں طہارت و غسل سے لوگ نا آشنا ہیں اور جہاں صبح آٹھ آٹھ اور نو نو بجے ہوا کرتی ہے؟ یا میرے ہاں، جہاں طہارت اور وضو فرض ہے اور غسل کی پوری ترتیبات موجود ہیں اور جہاں سونے کے لیے لازم کہ پچھلے پہر اگر نہ سہی تو کم از کم قبل فجر تو ضرور ہی اٹھ بیٹھے، اور دن رات میں کم از کم مسجد تک تو پانچ مرتبہ آمد و رفت رکھے۔ آتشک اور طرح طرح کی جان لینے والی گندی بیماریوں کا زور کہاں ہے؟ وہاں، جہاں پر پارک میں، ہر کلب میں، ہر موٹر پر، ہر ٹرین پر، ہر کشتی پر، ہر جہاز پر مرد و عورت کا آزادانہ اختلاط قائم ہے، جہاں زمانہ لباس کی عریانی یا نیم عریانی داخل فیشن ہے، جہاں نمایش جمال و زیبایش عیب نہیں، ہنر ہے اور جہاں آرٹ اور فائن آرٹ کے پردے میں ہر بے پردگی اور ہر بے حیائی دلیل کمال ہے، یا میرے حجروں اور زاویوں میں، جہاں نہ کوئی سنیما کے نام سے آشنا، نہ کوئی برہنہ رقاصی کا قدرداں، جہاں نہ کوئی عصمت فروشی کا بازار، نہ کوئی ہائڈ پارک اور جہاں کے بسنے والے پابند ہیں قانون حجاب کے اور پتلے ہیں شرم و غیرت کے؟ راحت قلب و سکون خاطر کہاں زیادہ نصیب ہے؟ وہاں، جہاں چوبیسوں گھنٹے تار اور ٹیلی فون اور گراموفون اور ریڈیو اور لاؤڈ اسپیکر گھنگھناتے رہتے ہیں اور جہاں اخبار فروش ہر لحہ اپنی روزی کے لیے ایک نیا ہیجان تلاش کرتے رہتے ہیں، یا وہاں، جہاں کے باشندے قناعت اور صبر و ضبطِ نفس کے فضائل کا سبق پڑھ چکے ہیں؟ غرض روح کی بالیدگی و تازگی کے سوال کو تو چھوڑیے، ٹھیٹھ مادّیات کی عینک سے مجھے اور میرے حریف کو دیکھیے اور پھر اپنی حالت کو سوچیے''۔ (ص: ۳۰، ۳۱)

دوسرے مقالے ''تمدن اسلام کی کہانی اسی کی زبانی'' کے چند اقتباسات:

''زمین اسی طرح چکر کاٹ رہی تھی۔ رات اور دن اپنے دورے اسی طرح پورے کر رہے تھے کہ سرزمین عرب کے مطلع سے طلوع ایک نئے آفتاب کا ہوا۔ آفتاب جاہ وجلال کے لحاظ سے، ماہتاب حسن و جمال کے لحاظ سے۔ اس نے مجھے آغوش شفقت میں لیا اور میں اس کے سایۂ عاطفت میں پلا اور بڑھا۔ اب تک گویا میرا لڑکپن تھا، اب جوان ہوا اور اس عہد میں میرا شباب اپنی پوری قوت اور پوری آب وتاب کے ساتھ چمکا۔ اس میں شک نہیں کہ شروع کے تیرہ سال میرے اوپر جو کچھ گزری وہ جور وتعدّی کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔ جاہلیت نے جی توڑ کر مقابلہ قدم قدم پر کیا، جنگ گھٹنے ٹیک ٹیک کر چپے چپے پر کی۔ لیکن ۶۱۱ء میں مکے سے مدینہ ہجرت محمدیؐ، تاریخ عالم کا وہ بے نظیر واقعہ ہے جس نے انسانیت کا رُخ ہی پلٹ دیا۔ دس سال کے اندر ہی اندر میں نے دنیا کو ایک نئے نظام سے روشناس اور مانوس کر دیا۔ محض لفظاً اور قولاً نہیں، عملاً اس کا نفاذ کر دیا، اسے چلا کے دکھا دیا۔ نظام نو (New Order) کا چرچا آج آپ ہر طرف سن رہے ہیں، حقیقۃً (New Order) یا نظامِ نو تو میرا نظام تھا، جمود کے خلاف ایک مستقل چیلنج (اعلانِ جنگ)۔ دنیا کے سارے نظامات کے مقابلے میں ایک مستمر نعرۂ انقلاب''۔ (ص: ۴۲، ۴۳)

''امارت وافلاس، دولت وفقر کے نفس امتیاز کو مٹا دینے کی غیر طبعی کوشش میں میں نے کبھی وقت ضایع نہیں کیا۔ مساوات مطلق، مالی ومعاشی اعتبار سے نافذ کرنے کی، خلاف فطرت کاوش میں کبھی قوت صرف نہیں کی۔ البتہ انتظام اس کا کر دیا اور احتیاطیں ایسی رکھ دیں کہ اس امتیاز سے پیدا ہونے والی تلخیاں زیادہ سے زیادہ گھٹ کر رہی ہیں--- سانپ کی جان نہیں لی لیکن اس کے ڈسنے والے دانت نکال لیے۔ امیروں کو حکم دیا کہ اپنا بھائی سمجھیں امیروں کو بھی اور غریبوں کو بھی۔ امیروں کو اس لیے کہ باہمی چشمک، رشک، حسد ورقابت کے امکانات نہ رہیں۔ غریبوں کو اس لیے کہ نخوت وخود بینی کے جراثیم فنا ہو کر رہیں اور خود غریبوں میں اپنی حقارت وپستی کا، یا آج کل کی اصطلاح میں

''احساس کمتری'' کا نشو ونما نہ ہونے پائے۔ غریبوں کی امداد، اعانت، دست گیری کو امیروں کے رحم وکرم پر چھوڑا نہیں گیا، ان کے اوپر واجب کر دیا گیا۔ اپنے فرض کو ادا کریں گے تو خود اجر وانعام پائیں گے۔ غریبوں پر احسان اس سے ذرا بھی نہ کریں گے، احسان خود اپنی ذات پر کریں گے۔ غفلت برتیں گے تو مجرم ہو کر پیش ہوں گے۔ اپنی بھلائی اگر مقصود ہے تو لازم رکھیں گے اپنے نفس پر محتاجوں کی اعانت، مظلوموں کی نصرت، داد خواہوں کی فریاد رسی ----- صحیح، اصلی، سچی سوشلزم اس سے بڑھ کر اور کہاں ملے گی؟''۔ (ص: ۴۴، ۴۵)

''شخصی اور خانگی زندگی کے اہم ترین واقعات شادی اور موت ہیں۔ دونوں کا ایک سرسری منظر ذرا میرے زیر اثر گھرانوں میں دیکھتے چلیے! مسلمان لڑکی ادھر سیانی ہوئی، اُدھر فکر ماں باپ کو شادی کی شروع ہوئی۔ نسبت کے پیام آنے لگے۔ فکر اس کی نہیں کہ زائچہ ملایا جائے، کنڈلی ملائی جائے، منحوس گھڑی، ساعت سے بچا جائے۔ گھڑی کے انتظار میں عمریں گزر جائیں، نجومی، جوتشی، رمّال کا دخل کسی موقع پر نہیں۔ نہ یہ بے فکری کہ جلدی کیا ہے، لڑکی جوان ہو کر اپنا شوہر خود ہی ڈھونڈ لے گی۔ عمر بھر کے شریک زندگی کا انتخاب، زندگی کا دقیق ترین، دشوار ترین، اہم ترین، نازک ترین انتخاب ہے۔ ضرورت اس میں جوش کی نہیں، ہوش کی، جذبات اور دیوانگی کی نہیں، عقل وفرزانگی کی ہے۔ اچھے اچھے تجربہ کاروں کی، پختہ دماغوں کی عقلیں چکر کھا جاتی ہیں۔ عقل وتجربے سے خالی اور جذبات سے بھری، نوجوان لڑکی یا نوجوان لڑکے کے سر اس کا بار تمام تر ڈال دینا اور خود دور سے محض تماشہ دیکھنا، اولاد کے ساتھ ہمدردی نہیں بے دردی ہے، دوستی نہیں دشمنی ہے۔ گویا ایک پندرہ سال کی لڑکی یا لڑکے سے توقع یہ ہے کہ اسے ضروریات وجذبات کا اندازہ ہے، ۲۵ برس کے بھی سن کا اور ۴۵ برس کے بھی سن کا اور ۵۵ برس کے بھی سن کا! زندگی کے جوا تار چڑھاؤ، فطرت بشری کی جو نیرنگیاں، نوجوانوں کے لیے ابھی پردۂ راز میں ہیں۔ بڑے بوڑھوں کے لیے آپ بیتی بن چکی ہیں۔ البتہ صلاح ومشورہ کی حد تک ان نوجوانوں کو بھی

شریک رکھنا ضروری ہے کہ بہر حال رائے تو کسی درجے میں وہ بھی رکھتے ہیں۔ غرض بڑوں نے یا فقہاء کی اصطلاح میں (اولیاء نے) اپنے طور پر خوب جانچ پڑتال کر کے، چھوٹوں کی رائے و مرضی دیکھ کر، بات ٹھہرائی، جہیز کا سامان مہیا کیا گیا حسب حیثیت۔ یہ نہیں کہ جہیز کے لیے قرضہ اتنا لیا جائے کہ آخر میں نوبت خودکشی کی آجائے۔ کورٹ شپ کا قدم کسی منزل میں درمیان میں آنے نہ پایا اور مسلمان عروس اور اس کا شوہر دونوں ان بے حیائیوں سے بچ گئے، جن سے آج اس روئے زمین پر بے شمار گھرانے جہنم کا نمونہ بن کر رہ گئے ہیں۔ خیر یہ مرحلے طے ہو لیے تو ایک تاریخ سعید نکاح کی قرار پائی۔ دلہن کے گھر پر دولہا والے اور خود دلہن والے جمع ہوئے، شوہر سے اس کی حسب حیثیت ایک رقم مہر کا اقرار کرایا گیا---- ایک زندہ ہستی اپنے کو دوسری زندہ ہستی کے سپرد کر رہی ہے، آخر اس کا کچھ تو نذرانہ چاہیے۔ اسی نذرانے کا نام مہر ہے۔ اب ضابطے و قانون کے مطابق اقرار پہلے لڑکی سے کرایا گیا اور پھر لڑکے سے، چپ چپاتے نہیں، علانیہ۔ لڑکی سے عورتوں کے مجمع میں، لڑکے سے مردوں کے جلسے میں اور قبل اس کے کہ شوہر اپنی زبان سے اتنی بڑی ذمہ داری کا اقرار کرے، اس کے سامنے خطبہ پڑھا گیا، میری سرکاری زبان عربی میں۔ اس خطبے میں نہ شاعری ہوتی ہے نہ خیال آرائی۔ اس میں بیان ہوتی ہیں نکاح کی فضیلتیں اور برکتیں، زوج و زوجہ کے باہمی حقوق کی اہمیت اور خوفِ خدا کی تاکید۔ اس کے بعد حسب حیثیت عزیزوں اور دوستوں کی دعوت---- بس لیجیے ہو گیا نکاح مسلمان مرد کا مسلمان عورت کے ساتھ۔ خدا کا واسطہ درمیان میں لا کر دو خدا پرستوں کی زندگیاں ایک کر دی گئیں اور بارک اللہ کی آوازیں ہر طرف سے آنے لگیں۔ شروع سے آخر تک نہ مشرکانہ اور وہم پرستانہ رسوم کی ٹیم ٹام، نہ باجے گاجے، ناچ رنگ، آتش بازی کی دھوم دھام۔ نہ غیروں کے ہاں کی طرح میرے ہاں یہ قید کہ نکاح وہی پڑھائے جو خاندان کا لگا بندھا ہوا پنڈت پروہت ہو یا باضابطہ پادری ہو۔ نہ میرے ہاں یہ پابندی کہ نکاح صرف

اٹھنے لگا، گرنے سے سنبھلا، باہر سے گھر میں قدم رکھا، گھر سے باہر کے لیے قدم نکالا، دستر خوان بچھایا، پانی کا گلاس منہ سے لگایا، جلسے میں تقریر شروع کی اور خدا جانے اسی قسم کے کتنے بے شمار موقعوں پر زبان نے کہا "بِسْمِ اللّٰہِ" ----! صبح سویرے آنکھ کھلی اور زبان نے پہلی دفعہ جو تلفظ کیا وہی "لا الٰہ الا اللّٰہ"! کسی حادثے کی خبر آئی، کوئی دنیا سے رخصت ہو گیا---کوئی قیمتی چیز غائب ہو گئی، دل کو صدمہ پہنچا---اور زبان نے ادا کیا "اِنّا لِلّٰہ". کسی کا دل بڑھانا ہوا، ہمت دلانی ہوئی اور آپ نے کہا "مَاشَاءَ اللّٰہُ" کسی کا شکریہ ادا کرنا ہوا اور آپ کی زبان پر آیا "جَزَاکَ اللّٰہ". کسی کو داد دینی ہوئی اور آپ بولے "سُبْحَانَ اللّٰہ". اپنی کسی غلطی کا احساس ہوا، کسی سے معذرت کرنی ہوئی اور آپ نے پکار کر کہا "اَسْتَغْفِرُ اللّٰہ" یا "لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ". شادی کی محفل میں اِدھر دولہا نے کہا "قبول کیا"۔ ادھر پاس سے نعرہ لگا "بَارَکَ اللّٰہ". اپنا یا کسی کا دل گرمانا ہوا تو زبان نے پکارا "اَللّٰہُ اَکْبَر"! دل میں جذبہ شدید پیدا ہوا حیرت کا عظمت کا یا نفرت کا اور آپ بول اٹھے "مَعَاذَ اللّٰہ" --- "اَلْعَظْمَةُ لِلّٰہ"--- "اَللّٰہ اَللّٰہ" یا "اِلَّا اللّٰہ" کبھی کوئی گندہ قول نقل کرنا ہوا، تو زبان نے پیش بندی کی کہ--- "نَعُوْذُ بِاللّٰہ"! کسی کو رخصت کرنا ہوا تو زبان پر آیا "خدا حافظ" --- "فِی اَمَانِ اللّٰہِ" کسی سے ملے، کسی سے رخصت ہوئے، کسی کو خط لکھنے بیٹھے تو زبان یا قلم پر آیا "اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰہ". کسی سے مصافحہ کیا تو زبان نے کہا "یَغْفِرُ اللّٰہُ لَنَا وَلَکُمْ". کسی موقع پر صفائی پیش کرنی ہوئی، کسی الزام سے تبری کرنی ہوئی اور آپ پکارے "حَاشَا لِلّٰہ" کوئی وعدہ کرنا ہوا، کوئی ارادہ کرنا ہوا اور زبان سے بے ساختہ نکلا---"اِنْ شَاءَ اللّٰہ" ---میت کو قبر میں اتارا تو کہا---- "بِسْمِ اللّٰہِ وَبِاللّٰہِ وَعَلٰی مِلَّةِ رَسُوْلِ اللّٰہ". کسی کو اپنی بات پر زور کے ساتھ یقین دلانا ہوا تو کہا "وَاللّٰہُ ثُمَّ بِاللّٰہ"!!

میرے اور میرے والوں کے یہ عام معمولات کسی سے چھپے ہوئے ہیں؟ بڑے،

چھوٹے، دوست، دشمن، سب پُرعیاں ہیں۔ خدا کا نام، اللہ کا ذکر، میری روح کی غذا ہے۔ میری زندگی کا جزو ہے''۔ (ص:۵۱،۵۲)

''میرے آقا و سردار صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ سنتے سب کی تھے، بولنے اور کہنے کا موقع بڑے اور چھوٹے سب کو دیتے تھے۔ عمل، سب کچھ اور سب کی سننے کے بعد اس پر کرتے جو آپؐ کی رائے میں مناسب ہوتا۔ یہ تھا صحیح احساس اپنی ذمہ داری کا اور یہ تھی سچی جمہوریت یا شوریت۔ یہی حال آپؐ کے بعد آپؐ کے سچے جانشینوں کا۔ آزادی ہر شخص کو بولنے کی، بلکہ ٹوکنے کی ہر وقت۔ میں اس طرز کی جمہوریت سے ناواقف، کہ رائے صرف اسمبلی اور کونسل کے ممبر دے سکیں اور ممبر آبادی کے تناسب سے محدود ہوں فلاں تعداد میں۔ عمر کے حساب سے، امتحان کی ڈگری کے لحاظ سے، آمدنی کی میزان کے معیار سے۔ اور اس محدود و مخصوص طبقے کے باہر قوم کا معزز سے معزز شخص بھی لاکھ چاہے مگر زبان نہ کھول سکے، مقدس حلقے میں قدم نہ رکھنے پائے! میں آزادی رائے کے اس مفہوم سے بھی محروم کہ رائے پیش صرف اس وقت کی جاسکے جب پارلیمنٹ کا سیشن، کونسل کا اجلاس ہو رہا ہو اور سال کے باقی سارے وقت زبانوں پر مہریں لگی رہیں! میرے ہاں قید نہ بوڑھے کی، نہ جوان کی، نہ امیر کی، نہ غریب کی، نہ پڑھے لکھے کی، نہ ان پڑھ کی، نہ مرد کی، نہ عورت کی، جو کلمہ گو چاہے اور جب چاہے دنیا کے سب سے بڑے ڈکٹیٹر (خلیفہ) کو ٹوک دے! میرے کانسٹی ٹیوشن میں لاکھوں، کروڑوں کی دولت لٹانے کی ضرورت نہ کسی پارلیمنٹ ہاؤس پر، نہ کسی کونسل چیمبر پر، نہ اس کے عظیم الشان اسٹاف پر، نہ اس کے گراں بہا فرنیچر پر، بس مسجد اور صحن مسجد مع اپنی بوریوں کے، چٹائیوں کے، مصلوں کے شخصی و اجتماعی ہر ضرورت کے لیے کافی۔ اس کے در ہر وقت کھلے ہوئے --- ضرورت نہ اردلیوں کی، نہ سنتریوں کی، نہ جمع داروں کی، نہ پہرہ داروں کی فوج کی، نہ کسی ایک دربان تک کی!''۔ (ص:۵۷،۵۸)

''یہ جو کچھ عرض ہوا کوئی فرضی افسانہ نہیں، کوئی تخیلی مضمون آفرینی نہیں، ٹھوس واقعات اور سنجیدہ ثابت شدہ حقائق ہیں۔ اپنے عروج شباب کے زمانے میں، حکومت میں نے لاکھوں میل مربع پر کی۔ میرے قلم رو میں ایک آدھ صوبہ نہیں، پورے پورے ملک داخل رہے ہیں، پوری پوری شہنشاہیاں۔ تاریخ کے شاہد عادل سے پوچھ دیکھیے! میرے دور دورے میں ریکارڈ جرائم کا، گنہگاریوں کا، سیہ کاریوں کا کیا تھا؟ اور اب کیا ہے؟ ڈاکے، چوری کے، نقب زنی کے، زہر خورانی کے اعداد اس وقت کیا تھے اور اب کیا ہیں؟ سود خوری اس وقت بھی گھروں کو اجاڑ رہی تھی؟ پورے پورے خاندانوں کو صفایا کر رہی تھی؟ ملکوں ملکوں آگ لگا رہی تھی؟ عصمت فروشی کی دکانیں اس وقت بھی باضابطہ حکومتوں کی سرپرستی میں کھلی ہوئی تھیں؟ بے حیائیاں اس زمانے میں بھی قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھی گئی تھیں؟ نشہ بازی کی سرکاری سرپرستی، فخر و اعلان کے ساتھ، اس وقت بھی محکمہ آب کاری کے نام سے، محکمہ افیون کے نام سے ہوتی تھی؟ قماربازیاں، شراب خواریاں، جعل سازیاں اس وقت بھی آج کی طرح اپنے گندے اور گھناؤنے چہروں پر صد ہا نقاب، خوش نما، خوش رنگ ڈالے ہوئے ابلی پڑتی تھیں؟ امراض خبیثہ کے لیے لاکھوں روپے کے صرفے سے اسپتال پر اسپتال کھلنے کی ضرورت جب تھی یا اب پڑ رہی ہے؟ آنکھ کی، کان کی، دل کی، دماغ کی، معدے کی، دانت کی، آنت کی بیماریوں کا شمار اس وقت کیا تھا، اور اب کیا ہے؟ شراب کی، افیون کی، کوکین کی، ہیروئن کی، غرض ہر نشیلی چیز کی تجارت اور کاروبار زوروں پر اب ہے کہ اس وقت تھا۔۔۔۔؟

میرا شباب عرصہ ہوا رخصت ہو چکا، میری قوت، مدت ہوئی ضعف میں تبدیل ہو چکی۔ طرح طرح کے امراض، عوارض کا خود شکار ہوں۔ ایرانی تمدن، ہندی تمدن، فرنگی تمدن کے اختلاط نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ہے، بگاڑ ڈالنے میں میری صورت کے، میری سیرت کے، میری شخصیت کے۔ آئینہ دیکھوں تو خود اپنی شکل نہ پہچان سکوں، اس پر بھی اپنے تمام حریفوں پر بھاری ہوں۔ کیا اعتقادی اور خیالی معیار سے اور کیا عمل و تجربے کے

اعتبار سے۔ اور میرے فرزندو اور عزیزو! یہ تمام تر تمہارے اختیار میں ہے کہ ہمت کر کے مجھے جلا لو۔ اسلامی ہفتہ بجائے سال میں ایک بار منانے کے، سال کے ہر ہفتے مناؤ۔ ہفتے کے ہر دن، ہر گھنٹے، ہر لمحے مناؤ۔ یہ رچ جائے تمہارے جسم کے ریشے ریشے میں۔ بس جائے تمہاری روح کے گوشے گوشے میں۔ کام لو خودداری سے، غیرت سے، حمیت سے، صلابت سے، تو مجھ میں پھر آسکتی ہے وہی طاقت، وہی قوت، وہی حدت، وہی شدت، وہی رعنائی، وہی زیبائی اور دنیا کی آنکھوں کے سامنے دوبارہ منظر پھر سکتا ہے----علی مرتضیٰؓ کے فضل وکمال کا، عمر فاروقؓ کی شوکت واقبال کا، محمدیؐ جاہ وجلال کا، احمدیؐ حسن و جمال کا!"۔ (ص: ٦٠ تا ٦٢)

سیاحت ماجدی - ایک مطالعہ

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی طبعی عزلت گزینی، خلوت پسندی، انضباط اوقات اور اپنے معمولات کی انجام دہی میں ضرب المثل بن جانے کی حد تک انہماک کے پیش نظر یہ خیال ہوتا ہے کہ انہوں نے سفر نہ کیے ہوں گے، لیکن ایسا نہیں ہے۔ انہوں نے متعدد سفر کیے۔ وہ ۱۹۲۹ء میں حج بیت اللہ کے لیے رہ نورد حجاز ہوئے۔ اس کے بعد ۱۹۵۵ء اور ۱۹۵۸ء میں انہوں نے پاکستان کا دو مرتبہ سفر کیا۔ اسی طرح اندرون ملک انہوں نے متعدد شہروں کی سیاحت کی۔ مولاناؒ نے اپنے اسفار کا ذکر اپنی خودنوشت سوانح عمری ''آپ بیتی'' کے باب نمبر ۱۴ میں کیا ہے۔ مولانائے دریابادیؒ کے یہ تمام سفرنامے اپنی تخلیق شان کے سبب بہترین سیاحت نامے ہیں۔

سفر نامہ لکھنے کے لیے وسعت مطالعہ، دقت مشاہدہ، بالغ نظری، صداقت نگاری، صدق گفتاری، اور متوازن و معتدل طرز نگارش بے حد ضروری ہے۔ خامہ ماجدی ان اصولوں سے بخوبی واقف ہے۔

مولاناؒ کو ماضی کی یاد آفرینی میں کمال حاصل تھا۔ یہ بات اپنی مؤثر ترین شکل میں ماجدی سفرناموں میں پوری طرح جلوہ گر ہے۔ وہ سفر کے دوران میں جن جن علاقوں سے گزرے ہیں وہاں اپنے مطالعے، ذہن اور شعور سے پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ انہوں نے ان مقامات کے شان دار ماضی کے اوراق بھی پلٹے ہیں اور اپنے قارئین کے لیے عبرت و موعظت کا سامان بھی فراہم کیا ہے۔ یہ عبرت آموزی مولانائے دریابادیؒ کے اسلحہ خانے

کا موثر ہتھیار بھی ہے اور ہمہ ہان ملت کو بے دار اور ہوشیار کرنے کا کارگر حربہ بھی ہے۔

اپنی تخلیقی شان، تاثر آفرینی، عبرت زائی، محاکمہ آرائی، ادبی لطافتوں خصوصاً سلاست بیانی اور شگفتہ نگاری کے باعث یہ کتاب اردو کے سیاحتی ادب میں ایک امتیازی شان کی حامل ہے۔

سیاحت ماجدی سے لطف اندوز ہونے کے لیے کچھ اقتباسات ذیل میں ملاحظہ کیجیے:

زیارت پاکستان کی تمنا!

''زیارت پاکستان کی تمنا کس مسلمان کے دل میں نہیں؟

سرِ گیسوئے تو در ہیچ سرے نیست کہ نیست

ایک تو مسلم ملک پھر پڑوسی اور پڑوسی بھی کیسا، اپنے ہی گوشت پوست کا پتلا، اپنے ہی دل وجگر کا ٹکڑا، اپنے کتنے بھائی بند، عزیز دوست، مخلصین اس سرزمین پر آباد اور پھر قائم اسلامیت کے کن کن دعووں اور کیسے کیسے وعدوں کے ساتھ ہوا تھا! یہ سب چیزیں ملا کر اشتیاق دید کو حد کمال تک پہنچائے ہوئے۔

از غم عشق تو پُر خوں جگرے نیست کہ نیست

ساتھ ہی مانع بھی چند در چند موجود۔ سب سے بڑا مانع فرصت کی کمی۔ آخری فیصلہ بڑے سوچ بچار کے بعد یہی ہوا کہ اسے بھی ایک ضروری کام سمجھ، ڈھائی ہفتہ کی رخصت دوسرے کاموں سے لی جائے اور جس طرح بھی ممکن ہو اس دیرینہ شوق کو اس بار پورا ہی کرلیا جائے!''۔ (ملاحظہ ہو: ص ۹، ۱۰)

قیام پاکستان! کیا کھویا کیا پایا:

''گاڑی چلی اور دماغ کے تصور خانے میں پاکستان کے اگلے پچھلے نقشے پھرنے لگے۔ ترجمان حقیقت اقبالؔ نے کس شوق اور چاؤ کے ساتھ ''اسلامی'' مملکت کی تحریک

دلوں میں قائم کرائی تھی۔ ہزارہا مخلص جاں بازوں نے کس دردمندی سے اس آواز پر لبیک کہی تھی۔ کیا کیا آرزوئیں تھیں اور کیسے کیسے منصوبے! اور اب اس شیریں وخوش گوار خواب کی تعبیر کیا نکل رہی ہے! امت نے اس کے پیچھے کیا کچھ کھویا، اس کے نام پر کیا کیا لٹایا، اور اب اسے حاصل کر کے کیا کیا پایا! نفع ونقصان کی میزان کیا رہی! سودا مہنگا پڑا یا سستا! --- شام ہوئی، رات کا اندھیرا چھایا، خیالات کی یہ رو جاری تھی۔ کچھ سوتے، کچھ جاگتے کہ پچھلی رات میں گاڑی یوپی کے حدود طے کر کے سرحد پنجاب میں داخل ہوگئی اور پھر صبح ہونے لگی''۔ (ملاحظہ ہو: ص ۱۶، ۱۷)

لاہور:

''دم کے دم میں لاہور شہر کے دیباچے شروع ہوگئے۔ دور دور کی عام عمارتیں، کارخانے اور مسجدیں، ریلوے ورکشاپ اور ریل والوں کے کوارٹر، مغل پورہ میں انجنوں اور ڈبوں کی ریل پیل۔ خاص لاہور جنکشن کا لق ودق یارڈ۔ پہلی بار ریل کے ڈبوں پر اردو حروف میں ''پاکستان ریلوے'' کا نظارہ! ---- اور پھر خیال کی نظروں کے سامنے لاہور کی تاریخی اہمیت، قدیم اسلامیت، ملی مرکزیت، ہر قدیم وجدید ملی تحریک میں اس کا پیش پیش ہونا، تحریک علی گڑھ ہو یا تحریک خلافت، سب میں بڑی حد تک اس کی امامت۔ یہاں کی شہرۂ آفاق صحافت، اردو زبان کی خدمات میں اس کی سبقت، یہاں کے اہل علم واہل قلم، پیسہ اخبار مرحوم، زمیندار، اقبال وظفر علی خاں، خواجہ کمال الدین ومحمد علی، عبداللہ یوسف علی اور نومسلم شیخ اسد ویس، شاہی مسجد ومزار شیخ علی ہجویریؒ، مہر وسالک اور خدا معلوم کتنے اور قدیم نقش حافظے کی لوح پر ابھر آئے۔ یہ بھی یاد پڑ گیا کہ ایک مرتبہ اور (۱۹۴۱ء یا ۱۹۴۲ء) اس شہر میں آنا ہوا تھا۔ پرنسپل برکت علی صاحب کے ہاں دعوت کی میز پر مولانا مودودی، مولانا داؤد غزنوی اور خان بہادر محمد حسین مرحوم (پریس برانچ والے) وغیرہم کا اجتماع تھا۔ جنگ یورپ (دوم) زور شور سے جاری تھی اور مولانا صاحبان اسی زور وقوت

کے ساتھ برطانیہ کی شکست اور جرمنی کی فتح کے دعوے کر رہے تھے--- آہ! انسان کی غلط اندیشیاں اور بشری ظن وتخمین کی گم راہیاں!''۔ (ملاحظہ ہو: ص ۲۱)

مقبرہ جہاں گیر، جائے عبرت:

''مقبرۂ جہاں گیر کا ذکر ابھی پانچ سطریں اوپر آیا ہے۔ تاثر کے لیے یہ مرقع عبرت بھی کچھ کم نہ تھا۔ آج یہاں فاتحہ پڑھنے گئے متنفس آتے ہیں۔ سیر وتماشے کے لیے جتنا مجمع بھی ہو جاتا ہو لیکن چشم تصور کے سامنے ذرا وہ وقت لایے جب آج سے چار صدی قبل اس شہنشاہ ہند کا انتقال ہوا ہوگا، ''ظل سبحانی'' کے اٹھ جانے کی خبر سے رعایا کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی، کیسا تلاطم مچ گیا ہوگا، کس غضب کی ہل چل شہر بھر میں پڑ گئی ہوگی! وہ دن کیسے کٹا ہوگا، نماز جنازہ کس نے پڑھائی ہوگی، جس جگہ آج مقبرہ ہے اس وقت یہاں کون رہ رہا ہوگا، کس طرح عمارت مقبرہ اور باغ کے لیے یہ زمین حاصل کی گئی ہوگی، جن لوگوں کے دلوں میں بادشاہ پرستی بطور ایک دینی عقیدے کے رچی ہوئی تھی ان سے بادشاہ کے لیے قبر کیوں کر کھدی ہوگی، بادشاہ کے لاشے کو قبر میں کیوں کر اتارا گیا ہوگا، اس روز کس غضب کا سناٹا محسوس ہوا ہوگا، سوگ کیسا زبردست منایا گیا ہوگا اور آج ان چیزوں میں کسی کی کچھ اہمیت باقی ہے؟--- دماغ میں اسی قسم کے بیسیوں سوالات چکر کھاتے رہے اور ہر لمحہ دنیا کی بے ثباتی اور اس کے جاہ وحشم کی بے حقیقتی کا درس ملتا رہا''۔ (ملاحظہ ہو: ص ۲۷)

تکلیف دہ پہلو:

''لاہور سے مل جل کر ایک بڑا افسوس ناک اور تکلیف دہ پہلو پاکستان کا نظر کے سامنے آ گیا تھا۔ کوئی پارٹی کسی دوسری پارٹی کی طرف سے صاف نہیں۔ اور عوام وخواص سب مل کر کہنا چاہیے کہ حکومت کی طرف سے غیر مطمئن۔ ہندوستان میں رہ کر یہ معلوم ہوتا تھا کہ حکومت کی طرف سے بے اطمینانی شاید یہیں کا حصہ ہے۔ لاہور پہنچ کر یہ اندازہ ہوا

کہ یہاں یہ وبا وہاں سے کچھ شدید تر ہی ہے۔ اب حکومت ''اپنی'' ہے۔ چاہیے تھا کہ اسے ہر ہر فرد ''اپنی'' سمجھتا۔ واقعۂ صورت حال اس کے برعکس، بہ استثنائے قلیل شاید کوئی بھی ''اپنی'' نہیں سمجھتا، نکتہ چینی کا انداز ہ بالکل ''غیروں'' کا سا، اور لہجے کی تلخی اس احساس مغائرت کا قدرتی نتیجہ! اچھے اچھے پڑھے لکھوں کو کہتے ہوئے پایا کہ ''یہاں آیا ہی کون۔ مسلمانوں کا دل و دماغ تو ہندوستان ہی میں رہ گیا۔ آخور کی بھرتی ہمارے نصیب میں آئی۔ مولوی ہوں یا لیڈر، سب تھرڈ کلاس ہمارے حصے میں پڑے۔ ابتری اور افراتفری اس کا لازمی نتیجہ ہونا ہی تھا'' --- شکایت کا یہ جز تمام تر بے جا اور خلاف واقعہ تھا۔ طبقۂ علماء میں مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا محمد شفیع دیو بندی اور مولانا ظفر احمد عثمانی آخر یہیں منتقل ہوئے۔ سیاسی لیڈروں میں لیاقت علی خاں، چودھری خلیق الزماں، شعیب قریشی، عبدالرحمٰن صدیقی، خواجہ ناظم الدین سب نے اسی ملک کا انتخاب کیا۔ علی گڑھ یونی ورسٹی کے چوٹی کے لوگ، ڈاکٹر سید ظفر الحسن اور اساتذۂ فن یہیں آ گئے۔ ڈاکٹروں، بیرسٹروں، ایڈوکیٹوں، انجینئروں، تاجروں کے چیدہ چیدہ افراد اسی سرزمین میں آکر بس گئے۔ وسیم صاحب، فیاض صاحب، لاری صاحب کس کس کے نام گنائے جائیں۔ بابائے اردو عبدالحق ہندوستانی سے پاکستانی ہو گئے۔ سیماب اکبرآبادی اور خواجہ محمد شفیع دہلوی، شوکت تھانوی، سید ہاشمی فرید آبادی، رازق الخیری اور ملا واحدی نے اپنا وطن اجاڑ کر اسی سرزمین کو آباد کیا۔ میر لائق علی حیدر آبادی شاہ صنعت و حرفت، ملک غلام محمد اور خواجہ زاہد حسین جیسے ماہرین فنانس اور ڈاکٹر سلیم الزماں سا کیمکل ایکسپرٹ سب کھنچ کر یہیں آ رہے اور کوئی منتخب ناموں کی فہرست مکمل کرنا چاہے تو میزان بیسیوں کی نہیں پچاسوں کی پہنچے گی۔ ان سب کے بابرکت وجود کو ٹھکرانا، نہ قدرشناسی کا اچھا نمونہ ہے نہ شکر گزاری کا۔ اور ان میں سے بعض اگر بہت جلد اللہ کو پیارے ہو گئے تو اس میں بندے کا کیا قصور ---؟ اصل یہ ہے کہ امیدیں ہی قیام پاکستان سے بہت زیادہ قائم کر لی گئی تھیں

اور یہ فرض کرلیا گیا تھا کہ اس کے وجود میں آتے ہی مشکلات چشم زدن میں دور ہو جائیں گی اور بغیر انتہائی جدوجہد، ایثار وقربانی کے ہر دشواری خود بخود حل ہوتی چلی جائے گی! افسوس ناک اندرونی آویزش اور باہمی چپقلش میں قصور یقیناً مرکزی حکومت اور صوبہ دار حکومتوں کا بھی ہے۔ لیکن عام پبلک اور اس کا کوئی بھی طبقہ اپنے حصے کی ذمہ داری سے بچ نہیں سکتا۔ اپنے حصہ رسدی کے مطابق قصوروار سارے ہی فریق ہیں۔ کاش مسلسل دوسروں پر نکتہ چینی اور دوسروں ہی کی عیب جوئی کے بجائے خود تنقیدی اور احتساب نفس کے ہم خوگر ہوتے!''۔ (بلاحظہ ہو: ص ۴۰-۴۲)

مخلصوں کے جھرمٹ میں:

''اسٹیشن آ گیا۔ اور یہ کراچی کا پہلا یعنی کنٹونمنٹ اسٹیشن ہے۔ گاڑی رک ہی رہی تھی کہ مجمع پر نظر پڑ گئی اور ہجوم سے اندازہ ہو گیا کہ یہیں اترنا ہے۔ اپنے عزیزوں اور قدیم مخلص شناساؤں ہی کی تعداد ماشاء اللہ اس شہر میں کیا کم تھی کہ اخباری اطلاع کی بنا پر نئے نئے مخلصوں اور کرم فرماؤں کا اضافہ، فلاں بھائی اور فلاں بھتیجے، یہ ملاوا۔ ری، وہ رازق الخیری، یہ محمد عشیر چیف نیوز ایڈیٹر ''ڈان'' وہ سعید الحق چیف نیوز ایڈیٹر کراچی ریڈیو، یہ ضیاء الدین احمد برنی اور وہ بشیر احمد صدیقی، یہ ابوعاصم وہ سید سلمان اور سب سے نمایاں انگریزی پندرہ روزہ الاسلام والے خواجہ عبدالوحید لاہوری ثم کراچوی، اس مجمع میں ملے جلے نئے نئے چہرے، یہ فلاں پارٹی کے سکریٹری اور وہ فلاں انجمن کے نمائندے ہیں اور اکثر سے تعارف خواجہ عبدالوحید کرا رہے ہیں۔ انہی ''صدق'' نوازوں میں سے ایک صاحب ایسے بھی ملے جنھوں نے مصافحے والے ہاتھ سے ''صدق'' کے پتے کی چٹ بھی تھما دی۔ گھر پہنچ کر جب اس چٹ کو دیکھنے کی مہلت ملی تو دیکھا کہ اس کے اندر ایک معقول رقم کا نوٹ بھی صدق کی امداد کے لیے رکھا ہوا ہے! اور ذرا آگے بڑھے تو کیا دیکھا کہ بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق بہ نفس نفیس چلے آ رہے ہیں۔ اس سن وسال میں یہ جواں ہمتی اور اپنے ایک خرد کی عزت افزائی،

ان کا کرم ہی کرم ہے۔ مصافحے اور معانقے کا شوق ہے کہ ابلا پڑتا ہے، نو وارد مسافر کی جان غضب میں کہ ادھر اسباب کو سنبھالے یا ادھر ان استقبالیوں کا دل نہ تھوڑا ہونے دے! حکیم الامت حضرت شاہ اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی ہدایتوں کی قدر ایسے ہی موقعوں پر ہوتی ہے۔ تاکید ہے کہ نو وارد مسافر پر اک بارگی ہجوم نہ کرو، اسے اطمینان سے اتر لینے دو، سامان اتروا لینے دو--- دل ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ کہاں جانا ہوگا اور اتنے عزیزوں، مخلصوں میں سے کس کے ہاں ٹھہرنا ہوگا کہ یک بیک گورنر جنرل بہادر کے اے ڈی سی کی سفید براق وردی نمودار ہوئی۔ اور لیفٹیننٹ امام کی خوش گوار آمد نے اس تذبذب سے نجات دلادی۔ مہمان کی منزل وہی ٹھہری جو معزز مہمان کا قصر عالی تھا۔ دوسرکاری موٹر ہوا سے باتیں کرتے ہوئے روانہ ہوئے اور منٹوں کے اندر اس انوکھے مسافر کی پوری پارٹی گورنر جنرل ہاؤس میں داخل تھی!---غالب کا مشہور مصرعہ

کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

یوں بھی تو پڑھا جاسکتا ہے ع

کبھی ہم اپنے کو اور ان کے گھر کو دیکھتے ہیں!"

(ملاحظہ ہو: ص ۴۵، ۴۶)

مرقد سلیمانی پر حاضری:

"مرحومین میں سب سے مقدم حاضری مرقد سلیمانی پر تھی۔ پہلے ان مرحوم کے گھر گیا۔ اس مقام کو حسرت کی آنکھوں سے دیکھا جہاں اس مؤرخ اسلام اور فاضل جلیل نے ناسوتی زندگی کے آخری لمحے گزارے تھے، جہاں بیمار پڑے تھے، جہاں جان کا تحفہ جان آفریں کو واپس کیا تھا۔ صاحب زادہ میاں سلمان سلمہٗ کا شمار تو خیر ابھی بچوں ہی میں ہے البتہ سید صاحب کے بھتیجے اور بڑے داماد ابو عاصم ایڈوکیٹ سے مل کر جی خوش ہوگیا۔ ماشاء اللہ خوب پڑھے لکھے نکلے۔ اردو انگریزی دونوں میں برق۔ قدرت لکھنے پر بھی

اور بولنے پر بھی اور پھر جتنے پڑھے ہوئے اتنے ہی کڑھے ہوئے بھی۔ مہذب، شائستہ، نستعلیق، مشرقی اور اسلامی رنگ کے ادب شناس۔ ان کی بیوی (دختر نیک اختر حضرت سلیمان ندوی مرحوم) میری گودوں کی کھلائی ہوئی ہے۔ بچپن میں بڑی پیاری تھی ---- گھر کے بعد مزار پر حاضری ہوئی۔ گھر سے چند ہی فرلانگ پر ہے کچی تربت (ان سطور کی تحریر کے وقت اطلاع ملی کہ قبر پختہ بن گئی ہے) کا دل پر بڑا ہی اثر ہوا، ہٹنے کو جی نہ چاہا۔ دھوپ کا وقت نہ ہوتا اور ساتھیوں کے سبب سے عجلت نہ ہوتی تو جی میں تھا کہ لحد کے کنارے بیٹھ جایے اور زبانی بے زبانی میں کچھ اپنی سنایے اور کچھ ادھر سے سنیے۔ نورانیت اس سیرت نگار کے مرقد پر نہ ہوتی تو اور کہاں ہوتی! ایک معمولی کچی تربت، بغیر کسی قسم کی بھی آرائش و تکلف کے عبدیت کی پوری مظہر، بیسیوں پختہ و شان دار و پُر تکلف مزارات پر بھاری۔ غالب نے ایک دوسری لیکن اسی مقام و مرتبے سے ملتی ہوئی کیفیت کی عکاسی کیا خوب کی ہے ؎

اک خونچکاں کفن میں ہزاروں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

سید مرحوم آج زندہ ہوتے تو ملاقات کا کیا رنگ ہوتا! کتنے سوال و جواب ہوتے، کیسے کیسے عقدے حل ہوتے، کیا کیا لطیفے سننے میں آتے، عرض و معروض، گلے شکوے، راز و نیاز، سب ہی کچھ رہتے اور شاید کچھ نوک جھونک بھی چلی جاتی! اب یہ سب کیا جنت ہی کے لیے اٹھ رہا؟ بشرطیکہ وہاں اس بڑے کے ساتھ اس چھوٹے کو بھی جگہ مل گئی! ---مرحوم کا ارادہ آخرت تک ہندوستان چھوڑنے کا نہ تھا۔ صرف عارضی پرمٹ پر چند روز کے لیے پاکستان آئے تھے۔ واقعات و حوادث تکوینی کس کے بس کے ہیں، پے در پے ایسے پیش آتے چلے گئے کہ بات روز بروز بگڑتی چلی گئی اور مرحوم کو گویا اضطراراً ہندوستانی سے پاکستانی بن جانا پڑا''۔ (ملاحظہ ہو: ص ۵۱، ۵۲)

جمود اور تعطل پر اظہار تاسف:

"دینی اور اصلاحی خدمت کے لیے مصیبت یہ ہے کہ صرف چند ٹھپے مخصوص سمجھ لیے گئے ہیں اور یہ بات دلوں میں بیٹھ گئی ہے کہ ان محدود ٹھپوں سے باہر کوئی کام انجام ہی نہیں دیا جاسکتا ہے۔ غلط فہمی اور تقلید جامد کے اس طلسم کو ندوے نے ایک حد تک توڑا تھا لیکن خود ندوے ہی کی کام یابی محدود رہی اور دلوں سے اب تک یہ وہم پوری طرح دور نہ ہوسکا کہ "دین داری" نام محض ایک مخصوص وضع ولباس اور ظاہر کی چند پابندیوں کا ہے۔ حالاں کہ دنیا صحیح یا غلط، بہرحال اب جس منزل پر پہنچ چکی ہے اس کے لیے اب وہ پرانے حربے بڑی حد تک کند اور بے کار ہو چکے ہیں اور اب حقائق سے آنکھیں بند کر کے انھیں متبرک ومقدس سمجھ کر تکیہ کیے رہنا ایسا ہی ہے جیسے ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم والے میدان میں استعمال صرف تیر وتبر، تلوار اور نیزے کو جائز سمجھا جائے اور دلیل یہ پیش ہوتی رہے کہ ہمارے "اسلاف" صالحین نے فتح مندیاں صرف انھی آلات سے حاصل کی تھیں اور ملکوں اور اقلیموں کی تسخیر میں کام انھی اسلحوں سے لیا تھا!"۔ (ملاحظہ ہو: ص ۵۸)

ندوۃ العلماء کا کام:

"بڑا دکھ یہ دیکھ کر ہوا کہ قدیم وجدید گروہوں میں بے گانگی اچھی خاصی پیدا ہوگئی ہے۔ گویا دین داروں اور روشن خیالوں کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل ہے اور جب باہمی بدگمانیاں جڑ پکڑ چکی ہیں تو یہ نتیجہ بھی بالکل قدرتی ہے کہ ایک فریق کی سیدھی سی بات بھی دوسرے کو تیر اور نشتر ہو کر لگتی ہے۔ اور علماء اور تعلیم یافتہ طبقے کے درمیان بے اعتباری کا یہ زور ہے کہ یہ اگر دو اور دو کو چار کہیں تو وہ اِن کی ضد میں آ کر بدیہی حقیقت کو بھی جھٹلا دیں! اور اقبال کی یہ شاعری کچھ حقیقت سی بن گئی ہے ؎

واعظ دلیل لائے جو مے کے جواز میں
اقبال کو یہ ضد ہے کہ پینا بھی چھوڑ دے

زخم کے اندمال اور چوٹ کے التیام کا کام ندوے ہی کی قسم کی کوئی جماعت انجام دے سکتی ہے جو روح اور مغز کے لحاظ سے قدیم ہو اور شکل وقالب کے لحاظ سے جدید۔ صراحی اور گلاس نئے ہوں اور ان کا مشروب وہی جانا پہچانا ہوا پرانا---- جب تک کوئی ندوۂ جدید میدان عمل میں آئے اس قسم کے ادارے اس کی جانشینی خاصی حد تک کر سکتے ہیں"۔ (ملاحظہ ہو: ص ۵۹)

مشاہدات کراچی:

"کراچی ماشاء اللہ شہر ہے بہت اچھا۔ خوش نما، کشادہ، آباد، پُر رونق، پاکستان جیسی کم عمر مملکت کے شایان شان البتہ وسیع، عالی شان و سر بفلک عمارتوں کے ساتھ ساتھ تنگ وتاریک، غلیظ گلیاں اور گری پڑی جھونپڑیاں بھی نظر میں کانٹے کی طرح چبھتی ہیں۔ لیکن جو صورت حالات شہر کی تشکیل میں پیش آتی چلی گئی اس لحاظ سے ایسا ہونا شاید کچھ ناگزیر ہی تھا--- مسجدیں لاہور کی طرح یہاں بھی آباد نکلیں۔ عصر و مغرب کی نمازیں عموماً مسجدوں ہی میں پڑھیں۔ ہر مسجد میں نمازی بڑی تعداد میں ملے۔ عورتوں کی بے حیائی کی خبریں جس شدومد سے سننے میں آئی تھیں وہ بھی اچھی خاصی مبالغہ آمیز نکلیں۔ ہوسکتا ہے کہ شہر کے کسی حصے میں بے حیائی عام ہو لیکن عموماً یہ کیفیت اس وقت تک بحمد اللہ ہرگز نہیں رہی۔ محض بے پردگی، وہ ہے۔ لیکن اتنی عام وہ بھی نہیں جو دور بیٹھے سنائی دے رہی تھی اور جتنی بھی ہے اس اظہار حقیقت کو گوارا کیا جائے کہ اس میں ایک حد تک دخل بعض علمائے کرام اور مخصوص جماعتوں کی شدت پسندی کو ہے۔ اگر ادھر سے اتنا اور ہمہ جہتی تشدد نہ برتا جاتا تو ادھر سے بھی اتنی ضد نہ پیدا ہوتی۔ عورت کی بے مہار آزادی کا اندازہ یہاں کے اخبارات کے مراسلاتی کالموں سے ہوتا ہے۔ اخبار انگریزی ہی کے نہیں بعض اردو اخبارات سے بھی۔

ایک بڑی بات یہ کہ لاہور کی طرح یہاں بھی عمارتوں، باغوں، سڑکوں وغیرہ کے نام اب تک ہندوؤں، مسیحیوں، مجوسیوں کے نام کے ساتھ ہیں۔ گاندھی گارڈن، ڈاکٹر

گیدوِل روڈ، وکٹوریہ روڈ، اس کی مثالیں یاد رہ گئیں"۔ (ملاحظہ ہو: ص ۹۱، ۹۲)

وطن واپسی:

"رخصتی کا منظر عموماً مؤثر ہوتا ہے، آج بھی تھا۔ کراچی اور لاہور دونوں شہر یہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ پردیس کے ہیں، اپنے ہی معلوم ہوتے رہے۔ یہ رشتہ تو کم وبیش ہر مسلم ملک کے ساتھ ہے پھر پاکستان تو جغرافی حیثیت سے بھی اپنا ہی ہے، علاحدگی جو کچھ بھی ہوئی ہے وہ سیاسی حیثیت سے ہے۔ مخلصوں، عزیزوں، دوستوں کی وہ کثرت کہ اپنا وطن یہی معلوم ہو رہا تھا۔ ٹرین حرکت میں آئی تو محسوس ہونے کے بجائے کہ روانگی وطن کو ہو رہی ہے ایسا محسوس ہوا کہ روانگی وطن سے ہو رہی ہے۔ وطن کے حقوق اپنی جگہ مسلم لیکن یہ جذبہ ہرگز منافیٔ وطنیت نہیں۔

گاڑی دوپہر کے بعد چلی اور اسی گاڑی سے عبدالرؤف عباسی صاحب ایڈیٹر روزنامہ "حق" لکھنؤ وسابق منیجر "صدق" بھی کراچی سے لکھنؤ واپس ہو رہے ہیں۔ کئی مہینے سے آئے ہوئے تھے---- گاڑی چلی اور دل اس سوچ میں پڑ گیا کہ دیکھیے اب پھر کب یہاں آنا ہوتا ہے اور سرے سے دوبارہ آنا مقدر ہے بھی یا نہیں۔ اسی مرتبہ آ جانے کی توقع کس کو تھی اور ظاہری اسباب تھے ہی کیا؟ یہ محض ایک غیبی القاء تھا کہ جس سے بے شان وگمان گورنر جنرل بہادر کے قلب میں ایک ادنیٰ اور قدیم نیاز مند کو دعوت دینے کا داعیہ پیدا ہوا اور اس گوشہ نشین نے بھی تامل وتذبذب کے بعد اسے منظور کر لیا اور آنے جانے کی صورت پیدا ہوگئی۔ بے شک جو قادر مطلق ایک بار پر قادر تھا وہ دوسری بار پر بھی اسی آسانی سے قادر ہے لیکن بہرحال جہاں تک اسباب ظاہر کا تعلق ہے وہ جتنے ضعیف تھے اب ان سے بھی ضعیف تر ہو گئے ہیں۔

بات کی بات میں جلو اسٹیشن آ گیا۔ وہی جہاں پاکستان کی طرف سے زبردست

چیکنگ ہوتی ہے اور عام مسافر اس کے نام سے ہول کھاتے ہیں۔ اپنا تجربہ ایک بالکل خصوصی استثنائی طور پر یہاں پہلی بار بھی خوش گوار رہا تھا اور اب کی تو اس سے بھی کہیں بڑھ کر خوش گوار رہا۔ پہلے کسٹم کے ایک افسر ملے وہ بھی مہربان تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ اختر حسین زیدی آ گئے اور وہ تو یکسر لطف و کرم ہی نکلے۔ دوسروں کو دیکھ رہا تھا کہ بے چاروں کو رتی رتی سامان کے ساتھ اتر کر جانا پڑ رہا تھا اور ہر طرح تکلیف ہی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اپنے کو سرے سے نہ خود اترنا پڑا نہ کوئی سامان اتارنا پڑا۔ قلی ولی جو لپک کر آئے مایوس واپس گئے۔ الٹی ہم لوگوں کی خاطریں بھی چائے پانی سے ہوتی رہیں۔ میرے سکریٹری ہی جا کر ضابطے کی شرطیں پوری کرا آئے اور پھر جب ٹرین چلنے لگی تو انہی زیدی صاحب نے گارڈ سے کہہ دیا کہ دیکھیے مولانا کو کوئی زحمت نہ اٹاری میں ہونے پائے اور نہ امرتسر میں۔ والنّٰزعٰت غرقاً کے ساتھ ساتھ والنّٰشطٰت نشطاً کا نظارہ ناسوت سے رخصتی اور برزخ میں داخلے کے وقت تو ہوتا ہی ہے اس کا ہلکا سا نمونہ کبھی کبھی جیتے جاگتے اسی حواسوں کی دنیا میں بھی دیکھنے میں آ جاتا ہے''۔ (ملاحظہ ہو: ص۹۶، ۹۷)

حاصل سفر:

''مطالبۂ قیام پاکستان کا ماحصل کل یہی تھا نہ کہ ایک خطۂ زمین پر مسلمانوں کو اپنی آئیڈیالوجی، اپنے دینی اصول کے مطابق و ماتحت حکومت قائم کرنے کا پورا موقع حاصل ہو۔ مان لیجیے کہ یہ مطالبہ سو فی صدی صحیح تھا اس سے یہ لازم کہاں سے آتا ہے کہ زندگی یا کم سے کم سیاسی زندگی کے چھوٹے بڑے ہر شعبے میں اشتراک کی نفی ہو گئی؟ شریعت کے اوامر و نواہی، فرائض و واجبات اور ممنوعات و محرمات کا تعلق تو سیاسی زندگی کے بھی چند ہی شعبوں سے ہے اور چند نہ سہی اکثر سہی، باقی شعبے جو مباحات کے دائرے میں ہیں اور جن کا تعلق بلا قید مذہب و ملت عام انسانی فلاح و بہبود سے ہے، وہ تو بہرحال پھر بھی کھلے رہ جاتے

ہیں اور للہ کوئی بتائے کہ ان میں اشتراک، تعاون واتحاد سے کون سا امر مانع ہے؟---چور کو یقیناً اپنے ہاں اسلامی سزا دیجیے، شراب کی بندش اپنے ہاں یقیناً یکسر کیجیے، فواحش پر سخت سے سخت قدغن ضرور لگایے، سود خوری کا نام ونشان تک مٹا دیجیے، ترکے کی تقسیم تمام تر شریعت کے تحت میں لایے، اخلاقی، معاشرتی، معاشی، تعلیمی فضا سرتا سر اسلامی قالب میں ڈھالیے لیکن ریل، ڈاک، تار، سڑکوں کی تعمیر، راستے کی صفائی، حیوانات کی نگہ داشت، بیماریوں کے علاج، شفاخانوں کے قیام، جغرافی معلومات، ریاضیات وطبعیات کی تحقیقات وغیرہا۔بیسیوں غیر اختلافی/ انتظامی شعبوں میں کوئی تفریق واختلاف کو کیوں راہ دیجیے؟ اور کیوں نہ اہم مشترک مسائل میں دونوں ہم سائے ملک ایک زیادہ سے زیادہ مشترک پروگرام تیار رکھیں۔ ان مسائل میں آخر اختلاف ونزاع کی بنیاد کہاں سے قائم ہوتی ہے۔تاوقتے کہ عقل سلیم کو ضد کا غلام نہ بنا دیا جایے۔سب سے بڑھ کر کڑی آزمائش ہندی مسلمانوں کے لیے۔وہ ہندوستان میں رہ کر ایک طرف اپنی وطنیت کو کیسے بھلا دیں۔ اپنے جغرافی، سیاسی، قانونی وطن کے حقوق کی طرف سے کیسے غداری بے وفائی اختیار کریں؟ دوسری طرف پاکستان ان کی دینی برادری والوں اور عزیزوں کا وطن ہے، اس سرزمین کے تہذیبی، معاشرتی برادرانہ روابط کو وہ کیا کریں، خونی رشتوں کی طرف سے کیسے آنکھ بند کرلیں؟ مجنوں غریب کی جان کے لیے تو صحبت لیلیٰ وفرقت لیلیٰ دونوں ''عذاب الٰہی کا حکم رکھتے ہیں''۔(ملاحظہ ہو:ص ۱۰۲،۱۰۳)

سفر اور سفر آخرت:

''ہندوستان سے پاکستان جانے اور لاہور وکراچی کا سفر اختیار کرنے کا موقع پہلی بار اس اپریل ۱۹۵۵ء میں پیش آیا۔لکھنؤ سے امرتسر تک چین ہی چین رہا۔اٹاری سرحد ہند کا آخری اسٹیشن ہے۔ایک چھوٹا سا اسٹیشن یہاں ٹرین کے بڑے چھوٹے سارے

مسافروں کو مع چھوٹے سے چھوٹے سامان کے اترنا پڑا اور گاڑی ایک دم سے خالی کرنا پڑی۔ جانچ ہر مسافر کے پاسپورٹ کی ہوئی اور جائزہ (Checking) ہر ایک کے سامان کا لیا گیا کہ کہیں کوئی ناجائز چیز تو ساتھ نہیں جاری ہے اور ایک لمبی مدت خاصے اضطراب میں گزری ---- اللہ اکبر! منظر انسانوں کے سفر آخرت سے کتنا مشابہ تھا۔ سفر حیات کی آخری منزل میں بھی تو فکر کی چیز اور کام آنے والی چیز تو یہی ایمان کا پروانۂ راہ داری ہوگا! جس نے اس کو سلامت رکھا وہ کس طرح بے کھٹکے عالم ناسوت کو عبور کر کے دار آخرت میں پہنچ جائے گا اور جس نے اپنے اعمال کو کفر ونفاق کی غل وغش سے پاک وصاف رکھا اسے یہ بوجھ کوئی بوجھ ہی نہ معلوم ہوگا اور وہ کس طرح ہلکا پھلکا رضوان الٰہی کی مملکت میں داخل ہو جائے گا۔

گاڑی تیزی سے بڑھتی اڑتی اور درمیان کے ایک آدھ اسٹیشن چھوڑتی چلی گئی، یہاں تک پاکستان کا جانچ والا (Checking) اسٹیشن جلوآ گیا اور یہ پتہ بھی نہ چلنے پایا کہ ٹھیک کس وقت مسافر ایک مملکت سے دوسری میں منتقل ہو آیا۔ اس ملک کے آئین وقوانین جداگانہ، احکام جداگانہ، دین وملت جداگانہ لیکن مسافر کو خبر بھی نہیں ہونے پاتی کہ وہ آناً فاناً کس طرح ایک ملک سے دوسرے میں منتقل ہو آیا ہے!--- ناسوتی زندگی سے آخرتی زندگی میں انتقال کو جن لوگوں نے لازمی طور پر سخت تکلیف دہ سمجھ رکھا ہے وہ اس نظیر کو نظر میں رکھیں۔ اللہ کا فضل وکرم اگر شامل ہے اور انسان ایمان کے کیل کانٹے سے درست ہے تو یہ کسی طرح محسوس بھی نہ ہونے پائے گا کہ روح کی یہ ناسوتی منزل ختم کس وقت ہوئی اور روح اس عالم کیف وکم سے نکل کر عالم مجردات میں داخل کس گھڑی ہوگئی"۔ (ملاحظہ ہو: ص ۱۰۸، ۱۰۹)

چار دن بمبئی میں:

"بمبئی کو باب الکعبہ کہا گیا ہے، حاجیوں کی آمد ورفت کا یہ سلسلہ سال کے چھ مہینوں میں تو ضرور جاری رہتا ہے۔ تاجر عموماً اہل خیر ومہمان نواز ہیں، نمازی بھی کثرت

سے ہیں جیسا کہ مسجدوں کی سرسری سیاحت سے بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ محرم اور ربیع الاول میں اپنی خوش عقیدگی کا مظاہرہ بھی خوب کر لیتے ہیں۔ باہر سے واعظوں اور خطیبوں کو بلا کر انھیں خوب نذرانے دے دے کر اور مذہبی رنگ کے جلوس نکال نکال کر اور ان میں نعرے لگا لگا کر ---- لیکن صحیح دین داری، خدا ترسی اور احساس عبدیت کا قحط سب کہیں ہے یہاں بھی ہے۔ بلکہ یہ دیکھ کر بڑی ہی عبرت ہوئی جہاں ہزار ہا ہزار مکان عالی شان، کئی کئی منزلہ موجود ہیں انہی کے عین پائیں میں ہزار ہا بندگان خدا ایسے بھی ہیں جنہیں سونے کے لیے ایک گوشہ اور ایک چار پائی تک نصیب نہیں۔ عمر کی ساری راتیں سڑکوں ہی پر گزارتے رہتے ہیں اور بے چاروں کو مکان کے نام سے کوئی تنگ و تاریک کوٹھری تک نصیب نہیں --- خیر یہ تو بمبئی غریب کا قصور نہیں، امارت کے پہلو بہ پہلو شدید افلاس تو شاید ترقی وتمدن کا خاصہ ہے"۔ (ملاحظہ ہو: ص ۱۱۵)

"بمبئی میں میری اصل دل چسپی کی چیزیں یہاں کے کتب خانے تھے، پبلک لائبریریاں بھی، مثلاً ایشیاٹک سوسائٹی کی لائبریری یا پھر انگریزی اور عربی کے بڑے بڑے کتب فروش، اس لحاظ سے یہ سفر تمام تر ناکام ہی رہا۔ ایشیاٹک سوسائٹی کے لیے نہ کوئی رہبر ملا اور نہ وقت ہی نکل سکا۔ طبیعت کے عام یاس وانقباض کو بھی اس میں دخل ہے اور کتب فروشوں تک بھی رسائی نہ ہو پائی۔ بڑا اشتیاق ایک زمانے میں شرف الدین الکتبی مرحوم کی دکان کا تھا۔ دکان جو شاید موجود بھی نہیں، الکتبی مرحوم بھی اب زندہ نہیں اور عبدالصمد نے بمبئی سے باہر بھیمڑی میں کوئی پریس بڑے پیمانے پر کھولا ہے۔ لیڈن (ہالینڈ) تک کے مطبوعات کا انتظام یہی کرتے ہیں اور تیسرے لڑکے حاجی خلیل ندوی جامعی سننے میں آیا کہ ہندوستان سے باہر حجاز میں ہیں۔ اور انگریزی کے جو بڑے نامی گرامی کتب فروش ایک زمانہ میں تھے تھیکر وغیرہ کے آج بس نام ہی رہ گئے۔ غرض کتابوں کی طرف سے تو یہ سفر سراسر گھاٹے ہی میں رہا --- انگریزی کی ایک ریفرنس کی کتاب

Every Man Encyclopedia جو چوڑی سائز کی ۱۲ جلدوں میں شایع ہوئی تھی، اس کا نیا ایڈیشن بہت بڑے سائز پر World Knowledge کے نام سے شایع ہونا شروع ہوا ہے اس کی کچھ جلدیں البتہ لے لیں''۔ (ملاحظہ ہو: ص ۱۱۹-۱۲۰)

''بہار کی بہار:''

''فاضل گرامی مولانا مناظر احسن گیلانی کے وطن کو دیکھنے اور وہیں جا کر ان سے ملنے کی تمنا سال ہا سال سے تھی۔ نوبت خدا خدا کر کے اب کی ۴ر جولائی (۱۹۵۲ء) کو آئی اور ساڑھے تین دن کا وقت کسی طرح اس آمد و رفت کے لیے نکل سکا۔ گیلانی ایک چھوٹا سا موضع ضلع پٹنہ میں ہے۔ شہر سے کوئی ۶۰ میل دور ضلع مونگیر کی سرحد پر ریلوے لائن سے بہت دور۔ رفیق سفر مولانا عبدالباری ندوی (صاحب جامع المجددین تھے) گویا ع

مومن چلا ہے کعبہ کو اک پارسا کے ساتھ

نیز عزیزی محمد ہاشم قدوائی ایم اے (لیکچرر مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ) سلمہ، --- اِذْ أَرْسَلْنَا اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ.... فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ.

مختصر سے قافلے کی پہلی منزل خاص پٹنہ تھی۔ مولوی سید ریاست علی ندوی (پرنسپل مدرسہ شمس الہدیٰ) سے عزیزانہ تعلقات آج سے نہیں ان کے لڑکپن سے قائم ہیں۔ انھوں نے مہمان نوازی میں وہ تکلف برتا جو صریح اسراف کی حد میں آجاتا ہے۔ ان کی معیت میں تین گھنٹے کے اندر اردو لائبریری، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ یونی ورسٹی لائبریری، مدرسہ شمس الہدیٰ لائبریری، ان سب کتب خانوں کی سرسری سیر خوب رہی۔ اردو لائبریری میں افسوس ہے کہ ''ترقی پسندی'' کے عناصر نمایاں نظر آئے۔ خدا بخش لائبریری کے نوادر کا کیا کہنا، آنکھیں کھل جاتی ہیں اور اس کے لائبریرین صاحب تو خود ایک زندہ لائبریری نکلے --- میزبان ثانی حکیم عبدالاحد صاحب پرنسپل طبیہ کالج تھے۔

انہوں نے بھی جس اخلاص والتفات کامل سے میزبانی کی اس نے اول، دوم کی تفریق باقی ہی نہ رہنے دی''۔ (ملاحظہ ہو: ص ۱۲۴)

ڈھائی دن بہار میں:

''جون ۱۹۵۶ء میں جس دن سے کہ اپنے محبوب ترین فاضل دوست و بزرگ علامہ مناظر احسن گیلانی کی وفات ہوئی گیلانی کا شمار اپنے لیے گویا مقامات مقدسہ میں ہو گیا اور اس کی زیارت کی تمنا دل میں ایک تڑپ بن کر رہی۔ ادھر اپنے ایک دوسرے محترم ترین فاضل دوست و بزرگ علامہ سید سلیمان ندوی کے وطن دیسنہ میں حاضری کی آرزو بھی کچھ کم نہ تھی۔ گیلانی اور دیسنہ میں فاصلہ کل چار ہی پانچ میل کا ہے اور عزیزان دیسنہ کی طرف سے طلب اور اس پر اصرار کا سلسلہ بھی ایک مدت سے جاری تھا، پھر اس جوار میں قدیم بدھسٹ شہر نالندہ کی سیاحت کی خواہش بھی ل میں عرصے سے چٹکیاں لے رہی تھی۔ یہ سارے اسباب، محرکات ودواعی جمع تھے کہ اپنے قدیم کرم فرما ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کے تقرر کی خبر صوبے کی گورنری پر سنائی دی۔ ان سے مراسلت شروع ہوئی تو ان بے چارے نے غایت کرم وعنایت سے اپنے پاس ٹھہرنے کی دعوت دے دی اور دعوت نامے کی نثر میں شاعری کا چٹخارہ پیدا کرتے ہوئے الفاظ کچھ اس طرح کے لکھ بھیجے کہ راج بھون کی عزت اس میں ہے کہ اس میں درویشوں کا قیام ہو۔ دل اپنا بھی یہی چاہ رہا تھا کہ اس درویش صفت انسان کو چل کر قصر شاہی میں رہتے سہتے دیکھیے ورنہ اپنا حوصلہ بھلا گورنمنٹ ہاؤس میں ٹھہرنے کا کہاں سے ہوسکتا تھا۔ تھوڑے سے تامل وتذبذب کے بعد دعوت کو قبول کرلیا اور منظوری مسرت وشکرگزاری کے ساتھ لکھ بھیجی مگر اس قسم کے قیود وشرائط کے ساتھ۔

(۱) اپنی سرکاری ومنصبی مصروفیتوں میں فرق ذرہ بھر نہ لایا جائے۔

(۲) مہمان نوازی کے کسی جزو میں غلو راہ نہ پائے جس سے کوئی بھی بات آپ سے سرزد ہو جو آپ کے موجودہ جاہ ومرتبے سے فروتر ہو''۔ (ملاحظہ ہو: ص ۱۲۸)

مشاہیر بہار:

''ساڑھے سات کا وقت تھا، گاڑی روانہ ہوئی۔ پسنجر ہر اسٹیشن پر رکتی ٹھہرتی ہوئی۔ کچھ ہی دیر بعد صوبہ بہار کا علاقے شروع ہوگیا اور صوبے کے دور اسلامی کی تاریخ نظر کے سامنے پھر گئی۔ وہ شیر شاہ کا اقبال، وہ منیر، راجگیر، بہار شریف، پھلواری شریف کے صوفیہ کے مجاہدے اور ریاضتیں۔ وہ پٹنہ، آرہ، مونگیر، دانا پور اور چھوٹے چھوٹے قصبوں کے اہل علم و فضل کی بزم، وہ یہاں کے شاعروں، ادیبوں سے فلسفیوں تک کی خدمات علم وادب۔ وہ علی محمد شاد اور امداد علی، علی امام اور حسن امام، خدا بخش خاں اور میاں ریاض الحسن خاں، شرف الدین و مظہر الحق، ابوالمحاسن سجاد اور عبدالرؤف داناپوری، مسعود عالم ندوی اور سید عبدالعزیز، مولانا محمد علی مونگیری اور شوق نیموی، آفتاب شریعت شیخ بدرالدین اور مہر طریقت قاری شاہ سلیمان پھلواروی، عبدالغنی وارثی اور شمس العلماء محب الحق، مولوی شفیع داؤدی اور سید تقی الدین۔ خدا معلوم ماضی بعید و ماضی قریب کے چھوٹے بڑے کتنے مشاہیر کی یاد تازہ ہوگئی۔ اور ذہن ان کی شخصیتوں کا استحضار کرتا رہا!''۔ (ملاحظہ ہو: ص ۱۳۱)

نالندہ کی سیر:

وقت ابھی تین کا نہیں ہوا تھا کہ موٹر نالندہ کے لیے روانہ ہوگئی۔ پٹنہ شہر کی آبادی گویا صرف لمبان میں ہے اور اصل اور بڑی سڑک شہر بھر میں کہنا چاہیے ایک ہی ہے۔ گاڑی اسی راستے سے گزری اور شہر کے ہر قسم کے منظر نظر سے گزرتے گئے، تا آں کہ نوبت دیہات کی آگئی۔ ابھی یہ گاؤں ملا ابھی وہ اور درمیان میں بہار شریف کے اندر سے بھی گزر ہوا۔ پانچ بج رہے تھے کہ صبا رفتار گاڑی نے نالندہ پہنچا دیا۔ میوزیم بند ہونے کا وقت ہو چکا تھا پھر بھی مہتمم (کیوریٹر) صاحب نے جو لکھنؤ کے ایک شریف کائستھ ہیں، گورنمنٹ ہاؤس کی گاڑی کا احترام کر کے میوزیم کی خاصی تفصیلی سیر کرادی، خود ساتھ ساتھ

رہے اور ایک ایک چیز بتاتے دکھاتے سمجھاتے گئے۔ یہ فلاں عہد کے مٹی کے برتن ہیں، یہ گھڑے ہیں، صراحیاں ہیں، بدھنے ہیں، مشوریں ہیں، یہ اس زمانے کے چمچے ہیں، چاقو ہیں، سکے ہیں، علمی سندوں پر لگنے والی مہریں ہیں، یہ فلاں خط کے کتبے ہیں، یہ فلاں دور کے چاول جو جلی ہوئی حالت میں پائے گئے ہیں اور اب تک محفوظ ہیں اور گوتم بدھ کی مورتیوں کا تو کوئی شمار ہی نہیں چھوٹی بڑی ہر سائز کی اور ہر نمونے کی --- ایک موحد کا جی ایسے منظروں میں کیا لگ سکتا ہے، پھر بھی انسان سبق لینا چاہے تو اپنے ہر مشاہدے سے لے سکتا ہے اور قُلْ سِيْرُوْا فِی الْاَرْضِ اور اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِی الْاَرْضِ کے حکم کی تعمیل ہر چپہ ارض کی سیاحت سے ہوسکتی ہے۔ اصل زمین نالندہ کی تعمیرات شکستہ کا معائنہ چند منٹ کا کام تھا اور دل کی نگاہوں نے بہت کچھ پڑھ لیا''۔ (ملاحظہ ہو: ص ۱۳۴، ۱۳۵)

دیسنہ کی زیارت:

''پٹنہ ۵؍اگست ۱۹۵۷ء۔ سید سلیمان ندوی کے دیس دیسنہ کے دیکھنے کی آرزو آج سے نہیں دل میں سال ہا سال سے تھی۔ آہ کسے معلوم تھا کہ سید صاحب کی زندگی میں کبھی یہ تمنا پوری نہ ہو سکے گی! ۱۹۵۲ء کا ذکر ہے کہ گیلانی کے راستے میں پکی سڑک سے جب کسی نے بتایا تھا کہ وہ دیکھیے سامنے دو میل کے فاصلہ پر دیسنہ ہے تو بے اختیار ادھر کشش محسوس ہوئی تھی اور جی بے ساختہ یہ چاہ رہا تھا کہ سواری کو روک، قصداً اس گاؤں کا کر چلیے اور سید صاحب کی زندگی کے ہر دور کی تصویر نظر کے سامنے خود بخود پھرنے لگی تھی، یوں بچپن میں ان گلیوں میں کھیلتے پھرتے ہوں گے، یوں ذرا بڑے ہو کر اس گاؤں سے باہر نکلے ہوں گے، پٹنہ اور پھر لکھنؤ کا سفر یوں کیا ہوگا، نوجوانی، جوانی، ادھیڑ سن میں شہرت حاصل کر کے یوں اپنے وطن کا رخ کرتے ہوں گے، وقس علیٰ ہٰذا۔ اور یہ ساری داستان خط میں سید صاحب کو لکھ بھی بھیجی تھی۔ سید صاحب خط پڑھ کر متاثر ہوئے اور جواب میں کچھ

اس طرح کا فقرہ بھی لکھا کہ آپ نے میرے لیے وہ سب کچھ سوچ لیا جو میں خود بھی شاید نہ سوچ سکتا---اور دیسنہ تو وہ مردم خیز بستی ہے جس نے سید صاحب کے علاوہ بھی بہت سے قابل ذکر اور قابل فخر ہستیوں کو جنم دیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ آفتاب کے سامنے چاند اور ستارے قابل التفات ہی نہ رہ جائیں اور زندہ ہستیوں سے قطع نظر یہاں کا کتب خانہ الاصلاح تو خود اس قابل ہے کہ اس کا قصد کر کے یہاں کا سفر اختیار کیا جائے''۔ (ملاحظہ ہو: ص ۱۳۶، ۱۳۷)

کتب خانہ الاصلاح:

''.....سامنے کتب خانہ الاصلاح کی عمارت تھی! ''عمارت'' اگر ایک مختصر سے ہال اور ساتھ کے بغیر کمروں پر عمارت کا اطلاق ہو سکے! آج کل اعلیٰ نہیں اوسط درجے کے کتب خانہ کے لیے ضرورت کتنے ساز و سامان کی، دفتری، کیٹلاگر، لائبریرین وغیرہ خاصے بڑے اسٹاف کی اور کتنے وسیع رقبے کی، فن وار کتابوں کے رکھنے اور مرتب کرنے کے لیے ہوتی ہے۔ یہاں ان سارے انتظامات کی جگہ بس اللہ کا نام، سب کا قائم مقام، بانیوں اور کارکنوں کا محض اخلاص۔ کتابوں کا مطالعہ چاہے کچھ ہی دیر کے لیے ہو، سکون یکسوئی چاہتا ہے۔ یہاں گاؤں کا گاؤں گویا میزبان! اس ہجوم میں پڑھنے پڑھانے کی نوبت کیا آتی اور پھر عجلت و رواروی لیکن بہر حال جتنا دیکھنا بھی بن پڑا ذخیرہ توقع سے بھی بہتر نکلا۔ پرانے اردو اخبارات اور رسالوں کی جلدوں کے لیے تو اس کا امتیاز تو مشہور ہی تھا۔ کتابیں نہ صرف تعداد بلکہ نوعیت و کیفیت کے لحاظ سے بھی اچھی خاصی ملیں متعدد مخطوطے اور قلمی نوادر بھی۔ بستی آخر اہل علم کا وطن ہی ہے، کیا اس کا اتنا اثر بھی نہ ظاہر ہوتا۔ کاش کوئی صورت اب کتب خانے اور اس کے متعلقات کے لیے نکل آتی اور اگر ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کی گورنری اور شاہ محمد عزیز منعمی کی وزارت کے زمانے میں بھی نہ نکلی تو پھر کب نکلے گی؟''۔ (ملاحظہ ہو: ص ۱۳۸)

''مرقد گیلانی پر حاضری:

''قبرستان'' جی ہاں! نہ کوئی گنبد، نہ کوئی مقبرہ نہ کوئی حجرہ، نہ کوئی چبوترہ، نہ اونچی پکی قبروں کی قطار، نہ کوئی در و دیوار، ایک بڑے طویل و عریض باغ میں خاندان والوں کی دو ایک کچی تربتیں بس یہ کل کائنات اس گورستان کی! سڑک سے چند منٹ کے فاصلے پر کھلے ہوئے آسمان کے نیچے مولانا کا مزار پُر انوار --- یعنی مٹی کا ایک ڈھیر، جس کے نیچے جسد خاکی اس مردمومن کا دائمی آرام میں ہے جو وقت کا زبردست فاضل، معقول و منقول کا جامع، شریعت وطریقت دونوں کا رازداں، ایک بہترین خطیب، ایک بہترین اہلِ قلم، بے دار دل، روشن دماغ، مورخ، محقق، شاعر، عارف سب ہی کچھ تھا اور ابھی کل تک جیتا جاگتا اور دوسروں کے دلوں کو زندہ رکھے ہوئے تھا! --- دن گزرتے کیا دیر لگتی ہے ابھی پانچ سال ادھر کی بات ہے یہی برسات کا موسم تھا کہ جولائی ۱۹۵۲ء میں مولانا اسی باغ میں اپنے اس نیازمند کو سیر کرانے لائے تھے۔ اس کے دریافت کرنے پر اپنے والد مرحوم کی قبر بتائی۔ آج اسی کے مزار پر ایک گرفتار قید عنصری کی حاضری تھی، بارش مسلسل جاری تھی۔ اس پر ہٹنے کا جی نہیں چاہتا تھا، جو کشش، جو جاذبیت، جو محویت زندگی میں تھی اس کا ظہور اس وقت بھی ہو رہا تھا۔ زیرلب نیم مضطر حالت میں جو دعائیں التجائیں مخاطبے ہوئے وہ اب سب کہاں یاد، اتنا یاد ہے کہ آنسوؤں کے تار کے ساتھ کچھ اس قسم کی صدائیں زیرلب وزبان ٹکراتی رہیں:

''دلوں کے دیکھنے والے اور سینوں کے اندر کی خبر رکھنے والے! اپنے دین کے اس دیوانے کو اپنی بہترین نعمتوں اور بخششوں سے سرفراز فرما۔ اس نے اُٹھتے بیٹھتے اپنے کو تیرے دین اور تیرے پیمبرؐ کی عزت و ناموس کے لیے وقف کر رکھا، تو اسے وہ صلہ دے جو اس کے خیال میں نہ آیا ہو۔ بال بال اسے اپنی رحمتوں اور سرفرازیوں سے نواز دے! اور اس نیک اور پاک روح کے طفیل میں، ہم لوگوں کا بھی بیڑا پار کر دے جو جو اس سے محبت کا دم بھرتے

تھے۔ بداں را بہ نیکاں بہ بخشد کریم، بڑے بڑے عارفوں کا مقولہ ہے کرم میں کون تیرا مقابلہ کرسکتا ہے اور تو اپنے عارفوں کی بات سچ ہی کر دکھاتا ہے"۔ (ملاحظہ ہو: ص ۱۴۰، ۱۴۱)

"دو دن بھوپال میں:

فروری کا اخیر ہفتہ تھا کہ بھوپال سے مولانا محمد عمران خاں ندوی کے ایک عزیز خاص یہ پیام لے کر بھوپال سے دریاباد آئے کہ تاج المساجد کا شمالی دالان جو اخیر دسمبر ۱۹۷۱ء سے زیر تعمیر تھا اور جس کا سنگ بنیاد شیخ محمد یوسف نائب سفیر سعودی عرب اس وقت رکھ گئے تھے، اب تکمیل کو پہنچ چکا ہے۔ ۳/اور ۴/مارچ کو اس کے افتتاح کے لیے موجودہ سفیر سعودی عرب یوسف الس یٹین بھوپال میں موجود ہوں گے، دو دن کے لیے آجاؤ، اپنا پیغام لکھ کر لاؤ یہاں سنا دینا اور پھر تار بھی ایک نہیں دو دو اس مفہوم کے وارد ہو گئے۔

تاج المساجد کی وسعت و عظمت کا لوگوں کو اندازہ نہیں، ہندوستان موجودہ کی سب سے بڑی اور عالی شان مسجد ہے، یہاں تک کہ دہلی کی جامع مسجد اور حیدرآباد کی مکہ مسجد سے بھی بڑی۔

دالان ایک یا دو ہی نہیں، چار چار جن میں بارہ صفیں بآسانی آسکیں اور صحن تقریباً سوا تین سو فٹ کی لمبائی اور چوڑائی کا (نصف صحن ابھی ناتمام ہے) اور پھر درس گاہ بھی اس کے علاوہ، غرض یہ مسجد نام ہی کی نہیں واقعی ہندی مسجدوں کی سرتاج۔ داعی جلسہ خان صاحب کی شخصیت معمولی نہیں خصوصی بلکہ کہہ لیجیے کہ غیر معمولی، فرمائش کی تعمیل سے انکار نہ بن پڑا۔ سفر کا تصور ہی تکلیف دہ و وحشت انگیز ہوتا ہے، جسمانی و مادی حیثیتوں سے بار تو پڑتا ہی ہے معنوی و فکری زحمتیں اس سے بھی بڑھ چڑھ کر، لکھنے پڑھنے کا ہرج تمام تر، ڈاک کا انبار واپسی پر نپٹانا مستزاد۔ دعوت و داعی دونوں کی اہمیت نے عذرات ساقط کر دیے"۔ (ملاحظہ ہو: ص ۱۴۵، ۱۴۶)

"دکن! یعنی کیا؟
دکن سے مراد سمت جنوب مملکت دکن یا ریاست حیدرآباد ہوتی تھی۔ کان اس کے سننے کے، آنکھیں اس کے پڑھنے کی، دل اس کے سمجھنے کا عادی۔ جی نہیں مانتا کہ اس پرانی، محبوب دل پسند اصطلاح کو یک لخت چھوڑ دیجیے اور کسی نئی سیاسی، کسی نئی جغرافیائی اصطلاح کو زیب عنوان بنانے لگیے!

ایک تمنا جو پوری ہوئی:
زیارت حیدرآباد کی تمنا ایک آدھ سال سے نہیں برسوں سے چلی آرہی تھی اور ہمیشہ کوئی نہ کوئی مانع قوی عزم میں حائل ہوتا گیا۔ آخری بار آمد ایک خانگی تقریب سے اکتوبر ۱۹۳۸ء میں ہوئی تھی۔ پورے ۲۵ سال بعد اکتوبر ۱۹۶۳ء میں خواب کو پورے ہونے کا موقع ملا۔ درمیان میں ایک بار حاضری فروری ۱۹۵۸ء میں دن کے چند گھنٹوں کے لیے ہوئی تھی، لیکن اسے حاضری کہنا ہی صحیح نہیں وہ تو مدارس لکھنؤ کی واپسی تھی براہ حیدرآباد، اس لیے اس ذکر ہی کو سرے سے القط کیجیے۔ یہاں پہلی بار آنا بہ صد شوق و اشتیاق ستمبر ۱۹۱۷ء میں ہوا تھا۔ سررشتہ تالیف و ترجمہ کے رکن کی حیثیت سے اور گویا گیارہ مہینے جم کر رہنا بھی ہوا تھا۔ عثمانیہ یونیورسٹی ابھی باقاعدہ وجود میں نہیں آئی تھی۔ اس کی داغ بیل پڑ چکی تھی اور بطور تمہید یہ نیا ادارہ سر اکبر حیدری، سر راس مسعود اور بابائے اردو عبدالحق کی سرپرستی میں قائم ہو چکا تھا۔ اس کے بعد بھی بارہا آنا ہوا اور ایک آدھ قیام بھی دنوں کا نہیں ہفتوں کا رہا۔ ۲۵ سال کا وقفہ کوئی معمولی ہوا ہے، جوان بوڑھے ہو گئے اور جو ۴۶ سال کا ادھیڑ تھا وہ ۷۰، ۷۱ سال کی عمر کو پہنچ چکا!"۔ (ملاحظہ ہو: ص ۱۵۰)

"مخلصین:
زیارت قبور کے سلسلے میں دوسرا نمبر ایک عزیز، مخلص دوست سید احمد محی الدین

بی.اے. (علیگ) کا تھا۔ حیدرآباد میں اردو صحافت میرے زمانے تک (یعنی ۱۹۱۷ء اور ۱۹۱۸ء میں) بالکل پرانے قسم کی تھی۔ دہلی، لاہور، لکھنؤ وغیرہ کی صحافت کا پرتو بھی وہاں نہیں پڑا تھا۔ محی الدین حیدرآبادی جب علی گڑھ سے گریجویٹ ہوکر آئے تو انہوں نے ہمت اور اپج سے کام لے کر ایک بالکل نئی راہ اپنے ملک وملت کے لیے مملکت آصفی کی سرکاری زبان اردو میں کھول دی۔ ''رہبر دکن'' پوری شان سے نکلا کہ چند ہی روز میں اس نے ملک بھر میں دھوم مچادی۔ شمالی اور جنوبی ہندوستان اور دکن کے فرق کو اس نے توڑا اور اپنی اسلامیت، انفرادیت اور صحافی ذمہ داری کا نقش دلوں پر بٹھادیا۔ بہادر یار جنگ مرحوم کی طرح ان کا بھی ابھی سن ہی کیا تھا کہ دفعۃً اللہ کو پیارے ہوگئے۔ پتہ لگا کر (اور اس پتہ لگانے میں کوئی مدد ان کے وارثوں سے نہ مل سکی) ان کے قبرستان تک پہنچا اور حسرت وتاثر کے ساتھ ان کی تربت پر بھی فاتحہ پڑھا۔ آج زندہ ہوتے تو میری آمد سے کس درجہ خوش ہوتے اور کس کس طرح میری خاطر مدارات میں لگ جاتے۔ ''صدق'' اور مدیر ''صدق'' کی جو بے پناہ محبت اہل حیدرآباد کے دلوں میں ہے کون بتا سکتا ہے کہ اس میں کتنا بڑا ہاتھ مرحوم احمد محی الدین کی مخلصانہ کوشش کو ہے۔ ان کے کتبۂ مزار کے ساتھ ان کے بعض عزیزوں مثلاً ان کے بھائی عارف الدین مرحوم انجینیر کے کتبوں پر بھی نظر پڑ گئی اور دل سے دعائے خیر ان کے حق میں بھی نکلی''۔ (ملاحظہ ہو: ص ۱۵۷، ۱۵۸)

''حیدرآباد کی تہذیبی شرافت:

اُردو صحافت محض اُردو زبان کی صحافت نہیں، اردو کلچر کی مظہر و ترجمان ہے، اُردو محض ایک زبان کا نام نہیں، اُردو کلچر یا تہذیب خود ایک مستقل چیز ہے۔ اُردو تہذیب کا آئینہ ہے اور اس آئینے کی ساری جلا صرف ایک لفظ شرافت کے اندر مضمر ہے۔

حیدرآبادی تہذیب، لکھنوی تہذیب، اسی جوہر شرافت کی یادگار تھی۔ وہ جب مٹتی

ہے تو ہر شریف کو اس کے مٹنے کا رنج ہوتا ہے۔

ٹھیٹھ مذہبی عقائد کا تعلق عالم غیب سے ہوتا ہے، لیکن یہ تہذیبی شرافت ایسی چیز ہے جو اسی دنیا میں بندوں کا دل بندوں سے جوڑے رہتی ہے۔ اور جب اس تہذیب کا جنازہ اٹھتا ہے تو ماتم داروں میں سب سے آگے شرافت ہی ہوتی ہے۔

پرانا حیدرآباد مٹا، فنا ہوا۔ نظام جاگیرداری گیا۔ نئے نظام حکومت و آئین سیاست نے جگہ لے لی۔ اکثریت نے آزادی محسوس کی لیکن آخر کوئی بات اس مرحوم اُردو کلچر میں تھی کہ جب پولیس ایکشن کے بعد ایک نامور ہندو ایڈوکیٹ نے ازراہ ہمدردی ایک اونچے مسلمان عہدے دار سے کہا ''زمانہ اگر میر محبوب علی خاں کا ہوتا تو ہم خود آپ لوگوں کے ساتھ ہوکر پولیس ایکشن کا مقابلہ کرتے''۔ تو اس مسلمان عہدے دار نے کتنا بلیغ و جامع یہ جواب دیا کہ--- ''خیر ہم تو مر چکے، خوشی اس کی ہے کہ ہم پر آنسو بہانے والے آپ بھی ہیں!''۔ (ملاحظہ ہو: ص ۱۶۶، ۱۶۷)

دینی سرگرمیاں:

جماعت تبلیغ کا مرکز، مولد تو ہمارا شہر دہلی ہی ہے لیکن یہ دیکھ کر دل باغ باغ ہوجاتا ہے کہ اس کی شاخیں اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ کی مصداق ہندوستان، پاکستان کے ہر شہر میں کیا معنی، افریقہ، یورپ اور امریکہ تک میں پھیل گئی ہیں۔ حیدرآباد میں اس کے خدمتی جلوے خوب خوب دیکھنے میں آئے۔ اور حیرت ہی ہوتی رہی کہ اس کی باگ کیسے کیسے لوگ سنبھالے ہوئے ہیں۔ ایک ڈاکٹر ادھیڑ سن و سال کے ڈاکٹر وحید الزماں صاحب دیکھنے میں آئے۔ ایلوپیتھی کے ایم بی بی ایس، اپنے فن میں ممتاز، ایک زمانے میں شاہی طبیب بھی رہ چکے ہیں۔ اپنی بزرگی کے لحاظ سے قابل زیارت، اسی تحریک تبلیغ کے لیڈر! صورۃً ہمارے لکھنؤ کے مشہور ڈاکٹر عبدالعلی مرحوم ناظم ندوہ سے مشابہ اور سیرت

بھی انہی کے ہم رنگ! انہی کے ہم راہ ایک صاحب دراز ریش فوجی وردی میں ملبوس اور دکھائی دیے۔ اپنا وقت اسی تبلیغ کے لیے وقف کیے ہوئے۔ یقین نہیں آتا تھا، لیکن یقین کرنا پڑا کہ ہندوستانی کیا معنی، مشرقی بھی نہیں خاص اسکاٹ لینڈ کے باشندے ہیں نو مسلم، یہاں نظام دکن کی ذاتی رجمنٹوں کے کرنل ہیں۔ اسی جماعت والوں کے اثر سے ولایت میں اسلام قبول کیا اور اب ماشاءاللہ خود جماعت میں شریک ہو کر دوسروں کو اسلام کی طرف لا رہے ہیں۔ ایک اور ممتاز رکن اور سرگرم کارکن سکندر آباد کے سیٹھ حسین سے بھی ملاقاتیں رہیں۔ چند ہی روز پیشتر تک سنا ہے کہ صاحب بہادر تھے، اور اب صورت شکل تک مولویانہ۔ اور نام کتنوں کے لکھے جائیں۔ یہ لوگ تو وہ ہیں کہ نام وری و شہرت سے کوسوں دور بھاگنے والے ہیں۔

جماعت تبلیغی کے ساتھ دوسرا نام جماعت اسلامی کا یاد پڑ جانا بالکل قدرتی ہے۔ یہ جماعت بھی ہندوستان میں اپنے رنگ میں بڑا مفید کام کر رہی ہے۔ کام کی نوعیت اس سے بالکل مختلف، لیکن دین وملت کے حق میں افادیت کے لحاظ سے کم درجے پر نہیں۔ یہاں اس کے بھی کارکنوں سے ملاقات رہی اور معلوم کر کے اطمینان ہوا کہ یہ بھی کام میں سرگرم عمل ہیں۔ اسلام کے سپاہیوں کو تو داخلی اور خارجی دونوں محاذوں پر اپنی زندگی کا ثبوت دینا ہے۔ قلب میں جلا پیدا کر کے اندر کی روحانیت و نورانیت کو بے دار کرنا، کام جماعت تبلیغی کا ہے۔ دماغ کو مغربی اور غیر اسلامی فتنہ وفسوں کے حملے سے محفوظ کر دینا اور تاریخ وجغرافیہ، معاشیات، فلسفہ، نفسیات، طبعیات وغیرہ پڑھ چکنے کے بعد بھی شہادت توحید ورسالت پر قدم جمائے رکھنا، یہ دائرہ عمل جماعت اسلامی ہند کا ہے، جس پر شاہد عادل اس کی لکھائی ہوئی درسی کتابیں ہیں''۔ (ملاحظہ ہو: ص ۱۶۹، ۱۷۰)

''دائرۃ المعارف عثمانیہ:

دوسرے دینی اداروں سے قطع نظر ایک دینی علمی ادارہ ایسا ہے جس کے لحاظ

حیدر آباد اب تک سارے ہندوستان میں منفرد تھا اور اب تک ہے، اور ہندوستان کیا معنی،
اس کی نظیر اس بڑے پیمانے پر عالم اسلامی میں بھی کم تر ہی نظر آئے گی۔ اس کا موجودہ نام
دائرۃ المعارف العثمانیہ ہے۔ اس کی بنیاد تو انیسویں صدی کے آخر ہی میں پڑ چکی تھی، غالباً
عماد الملک سید حسین بلگرامی کی تحریک پر۔ باقی پھر مولانا شبلی اور دوسرے علماء کی کوششوں
نے اسے چار چاند لگا دیے اور اس کی شہرت مصر، عراق، شام وغیرہ سے گزار کر برطانیہ،
ہالینڈ، فرانس، جرمنی وغیرہ تک پہنچادی۔ اس کا اصل کام مسلمانوں کے قدیم ذخیرے سے
نادر کتابوں کا نکال کر انھیں چھاپنا تھا، چناں چہ حدیث، رجال، سیرت، فقہ، کلام، لغت
پر بیسوں بلکہ پچاسوں نادر کتابیں اس نے تصحیح وتہذیب کے پورے لوازم کے ساتھ چھاپ
کر شایع کردیں۔ چناں چہ سنن بیہقی، تاریخ الکبیر (بخاری) کنز العمال، المستدرک،
الاستیعاب، مشکل الحدیث، مشکل الآثار، جمہرۃ اللغۃ، تہذیب التہذیب، تذکرۃ الحفاظ
وغیرہ اپنی مطبوعہ شکل میں سب اسی ادارے کا فیض ہے۔ ابتداءً یہ ادارہ اصلاً دینی تھی
اور ضمناً علمی، رفتہ رفتہ یہ ترتیب کچھ اُلٹ سی گئی۔ اب یہ دینی سے زیادہ ایک علمی ادارہ ہے
اور اب اس میں فلسفہ، فلکیات وغیرہ کی کتابیں کچھ زیادہ ہی چھپنے لگی ہیں۔ یہاں تک کہ
شاید کوئی کتاب جوتش یا نجوم کی بھی، سنسکرت سے عربی میں ترجمہ ہوکر اب چھپ رہی
ہے''۔ (ملاحظہ ہو: ص ۱۷۱)

''کتب خانۂ سالار جنگ:

کتاب کے کیڑے کی اصل دل چسپی کی جگہ کتاب گھر ہی ہوتے ہیں اور یہی شوق
شہر کے ایک دوسرے مشہور کتب خانے سالار جنگ لائبریری لے گیا---نوادر کے اعتبار
سے یہ کتب خانہ مشہور ہے۔ کئی بار پہلے کا دیکھا ہوا تھا---واقع اب بھی اسی جگہ ہے یعنی
سالار جنگ کی ڈیوڑھی میں، لیکن عمارت بالکل نئی اور دومنزلی، بڑی حد تک اپ

ٹوڈیٹ، لائبریری کے کارکن اچھے ملے۔ بڑی خوش اخلاقی سے ایک ایک چیز دکھاتے بتاتے رہے اور یہیں ملاقات تفصیلی (علاوہ دوسرے موقعوں کے) مولوی نصیر الدین ہاشمی سے رہی۔ پڑھے لکھوں اور تحقیقی کام کرنے والوں میں کون ان سے ناواقف ہوگا! اپنی ذات سے خود ایک زندہ کتب خانہ ہیں۔ کتنی کتابوں اور کتاب سازوں کے نام پتے، خصوصیات کے حافظ اور کتب خانوں کی ترتیب، فہرست سازی وغیرہ کے ماہر، ڈیوڑھی پہنچ کر خود سالار جنگ ثالث نواب یوسف علی خاں مرحوم کی یاد تازہ ہوجانا امر طبعی تھا۔ ان کا شاہانہ سجاوٹ کا ڈرائنگ روم، قد آدم تصویریں، قد آدم آئینے، کھانے کی میز، رئیسانہ تکلفات سے بھرپور، ان کی دل چسپ گفتگو، ان کے وسیع مطالعۂ مغربیات کی آئینہ دار اور ان کی اس پردیسی کے ساتھ خصوصی شفقت، ایک ایک چیز سینما کے پردوں کی طرح حافظے کے سامنے آتی جاتی رہی اور دل کو دنیا کی ناپائے داری اور اس سے عبرت کا سبق دیتی گئی"۔ (ملاحظہ ہو: ص ۱۷۵)

مشائخ حیدر آباد:

"یہاں ایک بڑا طبقہ مشائخ کے لقب سے موسوم ہے۔ سلوک اگر صحیح معنی میں ہو، جو ابوبکرؓ و علیؓ کا تھا، تو ظاہر ہے کہ اس کا کہنا ہی کیا! وہ تو ہر مسلمان کا عین ایمان اور بلند ترین نصب العین ہے، لیکن اس لفظ سلوک و تصوف کے پردے میں جو ایک بڑا ملغوبہ اوہام و رسوم کا تیار ہوگیا ہے، اب اس پر کیا کہا جائے اور یہ اس کے کہنے کا محل کچھ ہے بھی نہیں۔ خوشی اس کی ہے کہ ملاقات اس طبقۂ مشائخ کے ایک ایسے فرد سے رہی جس کا وجود اپنے طبقے کے لیے باعث فخر ہے۔ مولوی شاہ قطب الدین الحسینی شہر کی مرجع عام درگاہ شاہ خاموش کے صاحب سجادہ ہیں، صاحب علم ہیں۔ دینیات میں علامہ گیلانیؒ کے شاگرد رہے ہیں اور سارے لوازم سجادگی کے باوجود عثمانیہ یونی ورسٹی کے ایم اے ہیں، حال آں کہ وضع قطع ایسی بنا رکھی ہے کہ انگریزی کے حروف شناس ہونے کا بھی گمان نہیں گزرتا۔ انگریزی زبان پر اتنے قادر کہ بے تکلف اس میں لکھ لکھا بھی لیتے ہیں۔ چناں چہ کچھ ہی روز

ہوئے کہ اسلامی تعدد ازواج کی حمایت میں ایک رسالہ انگریزی میں شایع کر چکے ہیں اور ''صدق'' میں اس کا ذکر خیر بھی آچکا ہے۔ سلسلہ چشتیہ نظامیہ ہے۔ اگر ان کے سے پڑھے لکھے اور خدمت دین کا ولولہ رکھنے والے ان کے طبقے میں اور پیدا ہونے لگیں تو کہنا چاہیے کہ امت کے ایک خاصے بڑے حصے کا بیڑا پار ہو جائے''۔ (ملاحظہ ہو: ص ۱۸۸)

''رخصت کی گھڑی:

خیر جب شام کا وقت آیا تو کچھ لوگ تو گھر ہی مل ملا کر رخصت ہو گئے اور کچھ لوگوں نے عین اس وقت رخصتی مصافحہ کر لیا، جب ابھی اسٹیشن کی برساتی ہی میں داخل ہوا تھا، پھر بھی گاڑی کے چھوٹتے وقت پلیٹ فارم پر مجمع مخلصوں اور محبوں کا اچھا خاصا ہو گیا۔ کالجوں کے، یونی ورسٹی کے جلیل القدر استاد، ایڈوکیٹ، اخبار نویس، بوڑھے جوان سب ہی اس قافلے میں شامل۔ فرطِ اخلاص، اکثر کی چشم نم سے نمودار، بعض رومال سے آنکھیں پونچھ رہے تھے اور ایک عزیز تو درجے کے اندر آ کر مجھ سے لپٹ کر زار و قطار رو دیے!

جدائی اور رخصت کا منظر بھی کتنا موثر ہوتا ہے۔ غم انگیز مگر لذیذ، تلخ مگر کتنی مٹھاس لیے ہوئے! گاڑھی چلی تو عالم ناسوت سے آخری رخصت کا منظر سامنے آ گیا۔ اور کسی فارسی گو شاعر کے یہ دو شعر بھی لوح حافظہ پر چمک اُٹھے:

یاد داری کہ وقت زادن تو
ہمہ خنداں بدند تو گریاں
آں چناں زی کہ وقت مُردنِ تو
ہمہ گریاں بدند و تو خنداں

(اے بندے! کچھ یاد ہے کہ جب تو پیدا ہوا تو سب کے چہروں پر خوشی کی ہنسی تھی اور ایک تو رو رہا تھا۔ اب زندگی یوں گزار اور دنیا میں یوں بسر کر کے جب دنیا سے اٹھنے کا وقت آئے تو سب رو رہے ہوں اور ایک تو خوش ہے، مگن ہے کہ واپسی اپنے اصلی

وطن کو اور حاضری اپنے مولانا کے دربار میں ہو رہی ہے!)

اے سب کے سننے والے! اس تباہ کار کے حق میں یہ مضمون شاعری نہیں، واقعہ اور حقیقت بن کر رہے۔ سب کی آنکھوں میں آنسو ہوں اور کانوں میں اپنے، بشارت یہ آ رہی ہو کہ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ. اب دیر کیا ہے، اے بندے میرے مغفور بندوں میں شامل ہو اور میری مرضیات کی جنت میں داخل ہو جا! آرزو اس غلط شہرت کی ہرگز نہیں کہ ایک عالم وفاضل اٹھ گیا، ایک عابد وزاہد اپنی جگہ خالی کر گیا۔ دُعا صرف اتنی ہے کہ زمین والے زبان پر یہ لائیں کہ ہمارا ایک مخلص مشیر چلا گیا اور عرش والا یہ گواہی دے کہ ہاں یہ ہمارے دین کی تھوڑی بہت غیرت رکھنے والا ہمارے حضور میں حاضر ہو گیا"۔ (ملاحظہ ہو: ص ۱۹۳، ۱۹۴)

سیر دہلی:

"دہلی میں دیکھنے کی چیزیں دس، بیس، پچاس نہیں بلا مبالغہ سیکڑوں میں ہیں اور مجھ سے کتابی کیڑے کے لیے سب سے بڑی رغبت وکشش کی چیز یہاں کی لائبریری یا کتب خانے، خود بھی تعداد میں خدا جانے کتنے، خیر سب کیا معنی دو چار تک بھی پہنچ اس قلیل مدت قیام میں ممکن نہ تھی۔ جی نے ٹھانی کہ کم سے کم ایک کو تو دیکھ ہی لیا جائے اور قرعہ ایک سرکاری کتب خانے National Archives (قومی محافظ خانہ) پر پڑا۔ یہ محافظ خانہ کاغذات ودستاویزات قدیم، قائم تو مدت دراز سے انگریزوں کے زمانے ہی سے ہے، وزیر تعلیمات ہند مولانا ابوالکلام کی توجہ نے چار چاند لگا دیے۔ اس کی سرسری سیر کا اشتیاق بہ درجہ کمال تھا، سرکاری محکمہ اور پھر اپنے نہایت بیش قیمت قدیم سرکاری سیاسی وخفیہ کاغذات کی بنا پر نہایت درجہ حفاظت وراز داری کا مرکز، پاس وغیرہ کے جھمیلے ہمت شکن، لیکن وہی "اسم اعظم" میزبان محترم کا ایک بار پھر کارگر ہوا --- اور رسم وضابطے کی خانہ پری کے بعد بالآخر رسائی ہو گئی --- دیکھا تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اوپر نیچے تہ بہ تہ منزلوں میں کتابوں، مجلدات ودفاتر کا ایک پورا جنگل۔ ہر منزل کے ہر کمرے میں فرش

سے لے کر بلند چھت تک ہر الماری اور اس کے ہر خانے میں کتابوں کے انبار اور کتابیں بھی کثرت سے ضخیم وطویل وعریض۔ غرض ذخیرہ میرے اندازے سے کہیں زیادہ وسیع وشان دارلق ودق اور قلمی فرمانوں، شاہی مہروں، دستخطوں وغیرہ کا کوئی شمار نہیں! ساری کتابیں اگر ایک سیدھے خط میں پھیلائی جائیں تو دو چار فرلانگ نہیں وہیں کے ایک ذمہ دار شخص نے بیان کیا کہ ۲۰ میل کا فاصلہ درکار ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس عظیم الشان تعداد کا سرسری جائزہ بھی دوڈھائی گھنٹے کے اندر آسان نہ تھا بس گویا ایک خواب سا دیکھ لیا اور اتنی بھی دیکھ بھال، تاک جھانک محض مہتمم محافظ خانہ یا ڈائریکٹر آرکایوز جناب کے.ڈی. بھارگوہی کی عنایت سے ممکن ہوئی جو خلق مجسم ثابت ہوئے اور پورے وقت برابر ساتھ رہے۔ یہ دوسرے علوم اور زبانوں کے علاوہ فارسی کے بھی ماہر ہیں اور ان غیر مسلموں میں سے نظر آئے جن کی ذات سے ملک میں اب تک سیکولرزم کا بھرم قائم ہے۔ شعبہ فارسی کے انچارج ترمذی صاحب سے بھی ملاقات ہوئی اپنے کام میں خاصے مستعد وسرگرم دکھائی دیئے"۔ (ملاحظہ ہو: ص ۱۹۸، ۱۹۹)

مشاہدات کلکتہ:

"کلکتے کی شہرت کان میں بچپن سے پڑی ہوئی تھی۔ سب سے پہلے شاید یوں کہ "حبل المتین" جو ملک بھر میں اس وقت فارسی کا شاید تنہا ہفتہ وار تھا اور ایک خاص اثر ووقعت بھی رکھتا تھا، وہ یہیں کلکتہ سے کسی شیرازی آقا کی ادارت میں نکلتا تھا۔ پھر جب اور سن آیا تو یہیں کے قدیم انگریزی مطبعوں کی ٹائپ میں چھپی ہوئی کتابیں اپنے بزرگوں کے کتب خانوں میں، تفسیر، حدیث، لغت، سیرت وغیرہ پر دیکھیں، کشاف حصہ اوّل، اتقان فی علوم القرآن، شرح سفر السعادۃ، جذب القلوب الی دیار المحبوب، برہان قاطع، طحطاوی (شرح درمختار) اور خدا جانے اور کون کون سی کتابیں یہیں کی چھپی ہوئی دیکھنا

یاد ہیں۔ اسی سن میں یہ بھی سنا کہ ''اودھ پنچ'' کے ایک ممتاز نامہ نگار نواب سید محمد خاص کلکتے ہی کے ہیں۔ مدرسہ عالیہ کے مشہور پرنسپل سر ڈینسن راس اور غالب کے رنگ میں کہنے والے رضا علی وحشتؔ اور ایشیاٹک سوسائٹی کے لائبریرین ڈاکٹر عبداللہ المامون سہروردی اور وقت کے ممتاز ادیب شمس العلماء محمد یوسف رنجور کی علمی و تحقیقی، شعری، ادبی شہرتوں کی گونج بھی اسی زمانے میں لکھنؤ اور اس کے اطراف میں سنائی دی۔ جب اور سن آیا تو ''اسٹیٹسمین''، انگلش میں ''امپائر''، بنگالی میں ''پتریکا'' کا شور و شغب کانوں تک پہنچنے لگا اور کالج کے زمانے میں محمد علی جوہر کے ''کامریڈ'' اور ابوالکلام کے ''الہلال'' نے قبضہ دل و دماغ پر جمالیا تھا۔ پھر ایک زمانہ وہ بھی آیا جب یہاں کے مسلمانوں نے ایک انگریزی اخبار کی بدتمیزی سے مشتعل ہو کر ناموس رسولؐ کی خاطر اپنے کو کٹنے مرنے کے لیے بے تکلف پیش کر دیا۔ یہ وقت وہ تھا (۱۹۱۸ء میں) کہ ابوالکلام اور محمد علی دونوں نظر بند یا قید تھے اور محمد علی نے وہیں بیٹھے بیٹھے اس طرح کہ شعر کہہ ڈالے تھے ؎

اللہ نے بڑھائی ہے کیا شانِ کلکتہ — روحِ رسولؐ آج ہے مہمانِ کلکتہ
یثرب کی خاک پاک کے ہر ذرہ کے لیے — سو جان سے فدا ہیں غلامانِ کلکتہ
ہر سو ہیں لاشہ ہائے شہیدانِ سرخ پوش — ہے آج کل بہار پہ ایمانِ کلکتہ

اور خیر، یہ سب تو داستان پاستان ہے، ابھی کل کی بات معلوم ہوتی ہے کہ تقسیم ملک سے ذرا پہلے تک یہ شہر ایک مخلص مسلمان عبدالرحمٰن صدیقی کا معلوم ہو رہا تھا!''۔ (ملاحظہ ہو: ص ۲۲۳، ۲۲۴)

کلکتے میں دینی بے داری:

''مسلمان کی بڑی پہچان اس کی نماز ہے، اور کہیں کی اسلامی آبادی کی جانچ پڑتال کرنا ہو تو بس یہ دیکھیے کہ وہاں کی مسجدیں کس حد تک آباد اور کس حد تک ویران

ہیں--- کلکتے کی ایک نہیں مختلف محلوں کی کئی مسجدوں میں نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا، اورانہی میں ایک مسجد اہل حدیث کی تھی، ماشاء اللہ ساری ہی مسجدیں آباد اور پُر رونق پائیں اور جامع مسجد یعنی مسجد ناخدا کا تو کہنا ہی کیا!---- مسجد کا ترجمہ خانہ خدا ہے۔ یہ خانہ خدا بھی خوب ہے جو منسوب ایک ناخدا کی جانب ہے!---- یہاں نماز پڑھ کر جیسے آنکھیں روشن ہو گئیں۔ وہ اس کا طول وعرض، وہ اس کی رونق وآراستگی، وہ اس کی خوش تعمیری اور پھر اس کی نمازیوں سے معموری! اس میں داخل ہوتے ہی دل کی کلیاں کھل جاتی ہیں۔ بے نمازی اگر یہاں قدم رکھ لے تو عجب نہیں کہ نمازی ہی بن کر نکلے۔ یہاں کے امام صاحب جو غالباً شامی الاصل یا مدنی الاصل ہیں بجائے خود قابل زیارت ہیں۔ خوش آواز، خوش الحان ہونے کے ساتھ چہرے پر نورانی داڑھی مستزاد!

مولانا الیاسؒ کی تبلیغی جماعت کے ناخدا اب لکھنؤ کے مولانا منظور نعمانی اور مولانا ابوالحسن علی ندوی سلّمہما اللہ ہیں ان کا یہاں خاصا اثر دیکھا اور شاید یہ اسی کی برکت ہے جو یہاں اتنی اسلامی بے داری قائم۔ تحریک کے روح رواں یہاں کے ایک تاجر سیٹھ غلام رسول بہاری نظر آئے۔ اسلامیت کے پتلے، نور ایمان کے سانچے میں ڈھلے ہوئے، دوڑ دوڑ کر دوسروں کی خدمت کرنے والے، پیشانی پر سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِم مِنْ أَثَرِ السُّجُودِ کا ٹھپا لگا ہوا۔ بعض چہرے ایسے ہوتے ہیں جنھیں دیکھ کر دل خود اندر سے پکار اٹھتا ہے کہ بے شک یہ جنتی ہیں۔ ایسے ہی گنے چنے خوش نصیبوں میں ایک چلتے پھرتے جنتی یہ نظر آئے--- اور ایک مسلمان کے اخلاص کی داد کے لیے شاید انتہائی اور آخری الفاظ یہی ہو سکتے ہیں''۔

مشاہدات وتاثرات:

''کلکتے کی لکھوکھا کی خلقت میں ہر ملت ومذہب اور ملک وقوم کا آدمی آباد ہے۔ ایک دریابادی مخلص ڈیمزن لین میں رہتے ہیں۔ ایک دن ان کے ہاں جاتے ہوئے

گزر چینیوں کی آبادی سے ہوا۔ رہنے والے سب کے سب چینی، چینی لڑکے کھیلتے ہوئے، چینی عورتیں گزرتی ہوئیں، چینیوں کے ہوٹل، چینیوں کے مسلک و مذاق کے سارے ساز و سامان۔ واپسی میں نماز عصر اسی چینی محلے میں ایک چھوٹی سی مسجد میں پڑھی۔ اس سے متصل دیکھا کہ ایک یہودی معبد کا سائن بورڈ لگا ہوا، بس دیوار بیچ، ادھر مسلمانوں کی مسجد، ادھر یہودی کی ہیکل۔ کتابوں میں ذکر پڑھ لینا اور چیز ہے اور خود مشاہدہ کرنا اور۔ کسی ہیکل یہود کو آج تک دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ پہلی بار اسے دیکھا مگر یہ بہت ردی حالت میں تھی۔ دو بوڑھی غریب سی عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں، بچھی ہوئی لکڑی کی بنچیں الماری وغیرہ سب شکستہ اور بہت بوسیدہ۔ دیکھ کر کچھ جی خوش نہ ہوا اور معلومات بہت ہی کم حاصل ہو سکیں۔ سوالات جتنے کیے گئے ان کے جواب میں تقریریں تو بڑی لمبی سننے میں آتی تھیں لیکن ۹۰ فی صدی غیر متعلق، کبھی آپس کے جھگڑے، قضیے، کبھی مقامی اکابر یہود کی شکوہ و شکایت، ہاں الماریوں میں رکھے ہوئے کچھ تبرکات کی زیارت البتہ ہوگئی اور وہاں گفتگو عموماً اردو ہی میں ہوتی رہی اور یہ دیکھ کر دل کی کلیاں مسرت سے کھلتی رہیں کہ لکھنؤ اور دہلی کی رہنے والی نہیں، کلکتے کی عورتیں اور وہ بھی مسلمان نہیں، یہودنیں اردو ایسی صاف، رواں اور بے تکلف بول رہی ہیں کہ جیسے وہ ان کی مادری زبان ہے! --- خیر دیر کے بعد کام کی بات صرف اتنی مل سکی کہ یہاں نہیں بلکہ ایک دوسرے محلہ میں عزرا اسٹریٹ پر ان کے بڑے معبد ہیں۔ عین اس وقت یعنی ۶ بجے شام کو نماز ہو رہی ہوگی۔ سر ڈیوڈ عزرا، ابھی حال ہی میں یہود کے ایک ممتاز لیڈر کلکتے میں گزرے ہیں، یہ سڑک انہی کے نام پر ہے۔ عجب نہیں کہ اردگرد اور بھی یہود آباد ہوں۔ شوق نے چند منٹ میں یہاں پہنچا دیا۔ یہ معبد واقعی عالی شان تھا۔ یہود جیسی ممتاز قوم کے شایان شان، اونچی کرسی اور اس پر کلیسا نما ایک بلند عظیم عمارت۔ نماز جاری تھی، ہال بہت بڑا تھا، اچھے قسم کے فرنیچر سے مزین لیکن نماز اس عبادت کو صرف اس معنی میں کہا جا سکتا ہے کہ خطیب قبلہ (بیت المقدس) کی طرف رخ اور حاضرین کی طرف

پشت کیے ہوئے توریت عبرانی سے عبارتیں سنا رہا اور حاضرین کبھی آمین اور کبھی کچھ اور مناسب حال فقرے کبھی بیٹھے بیٹھے اور کبھی کھڑے ہو کر کہتے جاتے تھے، باقی اور کوئی بات مسلمانوں سے ملتی جلتی اس آدھ گھنٹے کے اندر دیکھنے میں نہ آئی، اور سجدہ تو خیر کیا ہوتا، رکوع یا مقتدیوں کی صف بندی یا نمازیوں کی تمام تر قبلہ رخی کوئی شے مسلمانوں کی نماز کی سی نظر نہ آئی اور اس سے زیادہ ٹھہرنے کا وقت نہ تھا---- یہود کی تاریخ جو کچھ بھی شہادت دیتی ہو، اور آج بھی اس قوم کی عملی حالت جو کچھ بھی ہو، تاہم یہ حقیقت بھی اپنی جگہ اٹل ہے کہ دنیا میں آج توحید و نبوت کے نام لیوا اگر روئے زمین پر کوئی قوم مسلمانوں کے بعد ہے تو وہ یہی قوم یہود ہے، ورنہ شرک نے تو ہر ہر مذہب کے اندر اپنے قدم جمائے ہیں اور عقیدہ وحی و نبوت سے دنیا کے بیشتر مذاہب اس وقت بے گانہ ہو چکے ہیں، خود قرآن مجید ایک طرف یہود پر سخت سے سخت گرفتیں کرتا ہے، ان کی تاریخ سے نافرمانی، سرکشی، شوخ چشمی کی ان گنت مثالیں پیش کرتا ہے، لیکن دوسری طرف قرآن ہی کو اگر ذرا غور سے پڑھیے اور الفاظ کے ساتھ ساتھ بین السطور کو بھی ذہن میں رکھیے تو جا بجا اسی قوم پر انعامات الٰہی اور خصوصی سرفرازیوں کی بارش کا ذکر بھی ملے گا، اور اسی قوم سے تخاطب میں بار بار اِنِّیُ فَضَّلۡتُکُمۡ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ کی تکرار بھی موجود ہوگی۔ لب و لہجہ کہیں بھی ایسا نہیں جیسا کہ توحید دشمن و توحید بےزار مشرکوں کے مقابلے میں ہے۔ بلکہ صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک شفیق باپ اپنے نالائق بیٹے کو خطاب کر رہا ہے کہ "اے بدبخت میں نے تو تیرے ساتھ یہ یہ احسانات کیے، لطف و کرم خصوصی سے تجھے سرفراز رکھا، تیرے تمام ہم جولیوں میں تیری عزت بڑھائی اور تو نے اس سب کے معاوضے میں اس درجے ناشکری دکھائی، شروع سے اب تک برابر نافرمانی ہی کرتا چلا آ رہا ہے"---مسلمان کو ان ابراہیم زادوں، اسحاق زادوں، اسرائیل زادوں کے کیش و ملت سے لگاؤ ہونا ایک حد تک بالکل قدرتی ہے"۔ (ملاحظہ ہو: ص ۲۳۵-۲۳۷)

''گیارہ سفر-سیاحت ماجدی'' کے نام سے کتابی شکل میں مرتب کر کے یہ مجموعہ مولانا دریابادیؒ کے برادرزادے اور خویش حکیم عبدالقوی دریابادیؒ نے ۱۹۸۰ء میں مولانا کے نادیدہ معتقد محترمی حاجی منظور علی صاحب لکھنوی کے اشاعتی ادارے ''ادارہ انشائے ماجدی'' کلکتہ سے شایع کروایا تھا۔ ایک تو مولانائے دریابادیؒ کے قلم صدق رقم کی جلوہ گری اس پر مستزاد کتابت وطباعت کا اعلیٰ معیار، کتاب خوب مقبول ہوئی۔ جلد ہی اس کا ایڈیشن ختم ہوگیا۔ مدت سے یہ کتاب نایاب تھی۔ ۲۰۰۱ء میں مولانا مرحوم کے ایک نادیدہ معتقد جناب محمد راشد شیخ صاحب، ادارہ علم وفن کراچی (پاکستان) کے روح رواں نے کتاب کو ازسرنو ترتیب دے کر اور صدق جدید لکھنؤ میں شایع شدہ مولاناؒ کے تحریر کردہ تین غیر مدون سفرناموں کا اضافہ اور سفر پاکستان المعروف بہ ''ڈھائی ہفتہ پاکستان میں یا مبارک سفر'' یک جا کر کے شایع کیا۔

کتاب کی مقبولیت اور افادیت کے پیش نظر صدق فاؤنڈیشن لکھنؤ نے ۲۰۰۶ء میں اس نسخے کا عکس لے کر شایع کیا ہے۔ رب کریم قبول فرمائے۔ آمین

مرشد کی تلاش-تعارف

مولانا دریابادیؒ کے سوانح سے واقفیت رکھنے والوں سے یہ امر مخفی نہ ہوگا کہ الحاد وتشکیک کے ایک عبوری دور کے بعد اسلام کی طرف مولاناؒ کی مراجعت میں تصوف کی کتابیں کتنی مددگار ثابت ہوئیں۔ مثنوی مولانا روم، منطق الطیر، نفحات الانس، مکتوبات مجدد سرہندی جیسی تصوف کی قیمتی اور اہم کتابوں نے ان کے قلب وذہن پر اسلام کی عظمت وحقانیت کا راسخ نقش بٹھانے میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔ اس کا اعتراف مولاناؒ نے اپنی تحریروں میں جا بجا کیا ہے۔

تصوف کے سلسلے میں عام طور پر دو نقطہ ہائے نظر پائے جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ تصوف کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ دوسرے یہ کہ تصوف عین اسلام اور اس کا جوہر وعطر ہے۔ مولانا دریابادیؒ اسی دوسرے نقطہ نظر کے نہ صرف قائل تھے بلکہ اس کے مبلغ بھی تھے۔ ان کے نزدیک تصوف اسلام کا مخالف وحریف نہیں بلکہ اس کے ماتحت اور اس کی کامل ترین اور پاکیزہ ترین صورت کا نام ہے۔

کیا غضب ہے کہ آج وہ تصوف جو ایمان کو طاقت، اخلاق کو جلا، زندگی کو نئی روشنی بخشتا ہے اسی کے نام پر ہر قسم کی بدعات وخرافات کو فروغ دیا جا رہا ہے! کیا عجب ہے کہ آج تصوف اپنے آخری مرکز ہندوستان میں اجنبی ہو گیا ہے! حالاں کہ مادیت ونفسانیت کی ماری انسانیت کے درد وکرب کا مداوا اسلامی تصوف ہی ہے۔ آج انسانیت کے جسم میں تیزی سے سرایت کرتے ہوئے مہلک زہر کے لیے اسلامی تصوف بہترین تریاق ثابت ہو سکتا ہے۔

''مرشد کی تلاش'' کے عنوان سے مولانا دریابادیؒ کا ایک مضمون کتابی شکل میں شایع کیا گیا ہے جو انہوں نے ''پیری مریدی'' کے بارے میں ایک استفسار کے جواب میں تحریر کیا تھا۔ اس میں ان کے خامہ صدق نگار نے اسلامی تصوف کا ست کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ یہ مضمون مولانا کے ہفتہ وار ''سچ'' لکھنؤ میں ۱۶ر مارچ ۱۹۲۸ء کے شمارے میں شایع ہوا تھا۔ اس کے بعد مولاناؒ نے تصوف پر اپنی مفید اور لائق مطالعہ کتاب ''تصوف اسلام'' میں اس کو شامل کر کے شایع کیا تھا، مضمون کی افادیت واہمیت کے پیش نظر صدق فاؤنڈیشن لکھنؤ نے اسے کتابچے کی شکل میں شایع کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔

اس کتابچے سے کچھ اقتباسات ذیل میں درج ہیں:

''تفسیر، اصول تفسیر، فقہ، اصول فقہ وکلام کے آج جو ماشاء اللہ دفتر کے دفتر موجود ہیں، عہد رسالت میں یہ کہاں تھے اور سب کو جانے دیجیے، براہ راست سنت رسولؐ ہی کو لیجیے، آج حدیث کے متن ہی کا کتنا بڑا ذخیرہ موجود ہے، پھر ان کی شرحیں ہیں، ان کی تسہیل کے لیے مستقل لغت ہیں۔ دفتر روایات وآثار کی کتنی مختلف قسمیں اور طبقات ہیں، سب کے الگ الگ مرتبے اور درجے ہیں۔ رجال کا ایک مستقل فن ہے، احادیث کے جانچنے اور پرکھنے کے لیے روایت اور درایت کے قانون وضابطے ہیں۔ مصطلحات فن کی تعداد سیکڑوں کی ہے۔ فن حدیث میں مہارت پیدا کرنے کے لیے برسوں کی محنت ومطالعے اور مدتوں تک استادوں اور کاملین فن کی ہدایت اور صحبت لازمی ہے، ظاہر ہے کہ عہد رسالتؐ میں یہ کچھ بھی نہ تھا۔ سرور عالمؐ کی سادہ اور معمولی روزمرّہ کی گفتگو حدیث تھی اور آپ کا بڑا چھوٹا ہر عمل سنت---- تو کیا اب کوئی اس بنا پر حضرات محدثین کی ساری کوششوں اور کاوشوں کو ''بدعت'' کہہ دینے کی جرأت کرے گا؟

اسی طرح حضرات فقہاء کی ساری موشگافیاں، قیاس واجماع کی بحثیں، استقراء واستنباط، تقلید واجتہاد کے مسائل، عبارۃ النص اور اشارۃ النص، دلالت النص اور اقتضاء النص کی قسم کی سیکڑوں اصطلاحیں دور نبویؐ میں کہاں تھیں اور کہاں سے ہو سکتی تھیں؟ تو کیا

کوئی بخاریؒ، مسلمؒ، ترمذیؒ، وابوداؤدؒ کی طرح ابوحنیفہؒ وشافعیؒ، مالکؒ واحمدؒ، نخعیؒ واوزاعیؒ، شیبانیؒ وطحاویؒ کی بھی جاں فشانیوں کو ضائع قرار دینے اور "بدعت" کے حکم میں لانے کی جرأت کر کے، شریعت ہی کے بہت بڑے حصے سے انکار کر گزرے گا؟----اور تو اور خود قرآن مجید اسی مکتوبی شکل میں اعراب وعلامات وقف سے مزین، پاروں، سورتوں، رکوعوں اور آیتوں کے ساتھ مدون، عہد رسالتؐ میں کہیں یک جا موجود تھا؟"۔ (ص: ۷، ۸)

"حدیث وسنت کے جن نوشتوں کو آج ہم سرچشمۂ تقدیس سمجھ رہے ہیں تو کیا تقدس ان کے حروف ونقوش، کاغذ کی سفیدی اور روشنائی کی سیاہی میں کچھ رکھا ہوا ہے؟ ان کے تقدس کی بنا بس اسی قدر تو ہے کہ ان کے اندر دنیا کی زندہ ترین شخصیتؐ کی روح کسی حد تک زندہ ہے۔ یہ روح کیسی عجیب بات ہوگئی کہ بے جان کاغذ کے بے جان ورقوں میں تو منتقل ہو جائے اور انسان، جسے اللہ نے روئے زمین پر اپنا خلیفہ مقرر کیا ہے، اس کے زندہ قالب وقلب میں منتقل نہ ہو سکے؟ یہ روح الماریوں کے سفینوں میں تو محفوظ رہ جائے اور راست بازوں اور پاک سرشتوں کے سینوں کو مشتعل ومنور نہ کر دے؟ تِلْكَ اِذاً قِسْمَةٌ ضِيْزَىٰ! شریعت ظاہر کا طالب علم کہتا ہے کہ ہم کو فلاں اقوال اور فلاں اعمال کی تعلیم فلاں فلاں کتابوں کے ذریعے سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل ہوئی ہے۔ طریق باطن کا سالک سناتا ہے کہ ہم کو فلاں احوال اور فلاں مقامات کی تحصیل، فلاں اور فلاں شخصیتوں کے واسطے سے رسول اکرمؐ سے ہوئی ہے۔ اب فرمایئے کہ دونوں راویوں کے درمیان اصلی اور اساسی فرق کیا ہوا؟" (ص: ۹)

"کہا گیا ہے کہ علمائے حق کے ہوتے ہوئے پیروں اور مشائخ کی ضرورت کیا ہے؟ لیکن عرض یہ ہے کہ یہ "علماء حق" اور "مرشدین" و "شیوخ" کی درمیانی تفریق تو ہماری آپ کی قائم کی ہوئی، حقیقۃً اور اصلاً ہے کب؟ قرآن تو صالحین، صادقین، متقین، مومنین، موقنین، خاشعین، محسنین، ذاکرین، مخبتین، قانتین، عابدین، صابرین، شاکرین،

مخلصین کی جماعت پیدا کرنا چاہتا ہے، اور وہ ہستیاں علم وعمل کی، حال وقال کی، قلب وقالب کی، ظاہر وباطن کی، فقہ ودرویشی کی جامع ہوتی تھیں۔ اس میں ہماری خود ساختہ تفریق ''علم'' و ''مشیخت'' کی گنجایش ہی کہاں ہے؟ یہ تفریق تو دوسری بہت سی تفریقوں کی طرح دور انحطاط نے پیدا کر رکھی ہے اور وہی اس کا ذمہ دار ہے۔------- ''تذکرۃ الاولیاء'' یا اس سے ملتے جلتے ناموں کی جتنی بھی پرانی کتابیں ملتی ہیں، انہیں اٹھا کر دیکھ لیجیے، سری سقطیؒ اور جنید بغدادیؒ، معروف کرخیؒ، اور بایزید بسطامیؒ، ذوالنون مصریؒ، اور فضیل بن عیاضؒ سے قبل نام ابوحنیفہؒ وشافعیؒ، مالکؒ واحمدؒ کے اور ان سے بھی قبل نام خلفائے راشدینؓ کے نظر آئیں گے۔

طریق کی اہم حقیقت شیخ یا مرشد کی صحبت ہے۔ لفظ ''صحابی'' ہی زہد وطاعت، تقویٰ وعبادت، علم وفضل غرض کسی اور وصف کو نہیں، ''صحبت'' ہی کی اہمیت کو واضح کر رہا ہے۔ اور مرشد بھی وہی ہوتا ہے جس کا نفس خود ہی تزکیہ حاصل کیے نہیں ہوتا، بلکہ اپنی صحبت ورفاقت سے دوسروں پر بھی اثر تزکیہ ڈال سکتا ہے اور جو اپنے کمالات کو دوسروں تک متعدی کر سکتا ہے۔ شیخ وہ مصلح ہوتا ہے جو یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ اپنی ہم نشینی سے دوسروں کی فطری صلاحیت کو ابھار سکے، پس مرید ہونے یا بیعت میں داخل ہونے کے معنی اس سے زائد اور کچھ نہیں، کہ جس کے صالح وصادق ہونے پر بھروسہ ہو اور جس کی شان طاعت وتقویٰ سے اپنا ضمیر ووجدان مطمئن ہو، اس کے اتباع کا قصد واہتمام کیا جائے اور اطاعت ونیاز مندی کے ساتھ اس کی خدمت میں حاضری دی جائے۔ بیعت اور مریدی اس معنی میں بدعت ہونا کیا معنی، عین حکم الٰہی وَکُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ کی تعمیل ہے۔ پوری آیت ملاحظہ ہو۔

(۱) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (۲) اتَّقُوا اللّٰهَ (۳) وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ.

(سورہ توبہ :۱۱۹)

گویا محض ایمان کافی نہیں، ایمان والوں ہی سے تو خطاب ہے، ایمان تو وہ لا ہی

چکے ہیں، اب ان سے کچھ اور مطالبہ بھی ہے، چناں چہ ارشاد ہوتا ہے کہ "اے ایمان والو! اللہ سے تقویٰ اختیار کرو" اداۓ حقوق، اجتناب معصیت وغیرہ سب اس حکم تقویٰ کے تحت میں آ گئے، لیکن اتنا ہی کافی نہیں، مزید حکم ملتا ہے کہ "صادقون کی معیت اختیار کرو، راست بازوں کی صحبت و رفاقت میں رہو۔"

اور یہی عین مریدی ہے۔

مشکل یہ ہے کہ ادھر نام تصوف کا لیا گیا اور ادھر ذہن کے سامنے آج کل کے مشائخ اور شاہ صاحبوں اور سجادہ نشین پیرزادوں کی اور ان کی محفلوں کی تصویریں سامنے آ جاتی ہیں۔ غالی عقیدت مند چاروں طرف سے حلقے میں لیے ہوئے ہیں، درمیان میں شاہ صاحب گیروے کپڑوں یا صندلی لباس میں تشریف فرما ہیں، کوئی کام ہے نہ کاج، نہ دینی تذکرے، نہ پند اور موعظے، نہ نماز نہ قرآن، نہ اداۓ حقوق عباد اور جائز کسب معاش کی کوئی فکر و اہتمام، پان پر پان چباۓ جا رہے ہیں، چاۓ کا دور چل رہا ہے، اور یا پھر اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ قوالی کی محفل گرم ہے، ستار اور ہارمونیم کے لوازم کے ساتھ گانا، امردوں کا بلکہ نامحرموں کا سنا جا رہا ہے، فاسقوں کا مجمع ہے، عرس کی تاریخیں آ گئی ہیں، قبروں پر چادریں چڑھ رہی ہیں، منتیں مانی اور مرادیں مانگی جا رہی ہیں، مٹھائیوں کے دونے اور حلوے، توشے کے خوان پیش ہو رہے ہیں، نذر و نیاز، چڑھاوے کے نام سے روپے پیسے کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں، گفتگو میں سارے منہیات شرعی کا ارتکاب بے تکلف ہو رہا ہے، نہ غیبت سے بچنے کی فکر، نہ دل آزاری سے محتاط رہنے کا اہتمام۔ تو غرض یہ کہ سائل کے پیش نظر عموماً اس طرح کے منظر ہوتے ہیں اور پھر شبہات و سوالات پیش کیے جاتے ہیں، نفس تصوف و سلوک و بیعت سے متعلق! ---------گویا چوراہے کے اشتہاری دوا فروش یا محلّہ کے اناڑی، "نیم حکیم خطرۂ جان" پر قیاس حکیم اجمل خاں اور حکیم محمود خاں دہلوی کے مطب کا کیا جا رہا ہے! ---------جو چیزیں سلوک و طریقت نے الگ ہی

نہیں بلکہ ان کی عین ضد ہوں انہیں دیکھ کر نفس طریق کی طرف سے مشکوک یا بدگمان ہو جانا، یہ تو سائل کا ظلم خود اپنی بصیرت پر ہوا''۔ (ص:۱۲ تا ۱۴)

''تمام صحابہؓ ہر حیثیت سے مساوی نہ تھے، اپنا اپنا ظرف تھا۔ خالدؓ جاں باز میدان جہاد کے یکہ تاز ہوئے۔ ابو ہریرہؓ روایات حدیث کی اشاعت میں لگے رہے۔ ابن عباسؓ کی قسمت میں ترجمان القرآن بننے کی سعادت آئی۔ ابن عمرؓ نے ترویج سنت کی خوش نصیبی پائی۔ ابو بکر صدیقؓ نے زمام خلافت کو سنبھالا۔ غرض ہر ایک کا مذاق طبیعت جداگانہ تھا اور استعداد وصلاحیت الگ الگ۔ اکثریت کی توجہ قدرۃً امور خارجی پر زیادہ رہی، رسولؐ نے نماز میں ہاتھ سینے پر باندھے یا ناف پر؟ آمین سورۂ فاتحہ کے ختم پر آواز سے کہی یا آہستہ؟ اس قسم کے مسائل کا مطالعہ بڑی تفصیل ووسعت سے ہوتا رہا، لیکن ایک دوسری جماعت کی نظر قال سے زیادہ حال پر، ظاہر سے زیادہ باطن پر رہی۔ انہوں نے محض غزوۂ بدر اور فتح مکہ کا جاہ وجلال ہی نہیں دیکھا، بلکہ غار حرا کی خلوت آرائیوں کا بھی مزہ چکھا، انہوں نے محض حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ ہی کا پیام نہیں سنا، بلکہ سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ کی حقیقت کو بھی پہچانا۔ ان کی نگاہیں یہیں تک محدود نہیں رہیں کہ نماز میں رکعتیں کتنی اور کس قاعدے سے پڑھی گئیں، بلکہ یہاں تک بھی پہنچیں کہ نماز کس ذوق شوق سے پڑھی گئی، خضوع وخشوع کی کیا کیفیتیں طاری رہیں اور زبان کے ساتھ دل کن کن منزلوں سے گزرتا رہا۔ اس نعمت کے حصہ دار کم وبیش تو سب ہی صحابیؓ تھے، لیکن جو خصوصیت کے ساتھ اس دولت سے مالامال رہے اور آج بھی ہر شجرہ طریقت کے سر سلسلہ ہیں---- ---حضرت ابو بکرؓ وحضرت علی مرتضیٰؓ، حضرت ابو عبیدہؓ، حضرت سلمانؓ وغیر ہم۔ بلکہ بعض قدیم کتب سلسلہ میں تو صراحت کے ساتھ نام حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے بھی درج ملتے ہیں''۔ (ص:۱۴، ۱۵)

''اکبر الہ آبادیؒ جس پائے کے شاعر ہوئے ہیں، اسی درجے کے حکیم وعارف

بھی تھے۔ ایک طویل نظم انہی مقامات شریعت ومنازل طریقت کی شرح وتوضیح میں انہوں نے کہی ہے۔ دوچار شعر ملاحظہ ہوں :

شریعت در محفل مصطفےؐ   طریقت عروج دلِ مصطفےؐ
عبادت سے عزت شریعت میں ہے   محبت کی لذت طریقت میں ہے
شریعت میں ہے صورت فتح بدر   طریقت میں ہے معنیٔ شق صدر
نبوت کے اندر ہی ہیں دونوں رنگ   عبث ہے یہ ملا وصوفی کی جنگ

انہی کی ایک دوسری نظم کے دوشعر

ملا پکارتے ہیں منطق کی جنگ اچھی   صوفی کا ہے ترانہ حق کی ترنگ اچھی
ملا یہ کہہ رہے ہیں قرآن ہی سے پڑھیے   صوفی یہ کہہ رہے ہیں معنیٰ سمجھ کے پڑھیے

اور ایک اور مصرعہ

شریعت ہے تم پر طریقت ہے تم میں

آخر یہ ارشاد بھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا ایک باخبر سائل کے جواب میں ہے کہ :

قال ما الاحسان قال ان تعبد اللّٰہ کانك تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراك۔ (بخاری کتاب الایمان)

یعنی : احسان اس کا نام ہے کہ اللہ کی عبادت اس طرح کی جائے جیسے تو اسے دیکھ رہا ہے اور اگر تو اسے نہیں دیکھ سکتا تو وہ تو تجھے دیکھ رہا ہے"۔ (ص:۱۶)

"رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے اصل مقصد بھی تو کلام مجید میں تلاوت آیات الٰہی کے بعد ایک نہیں دو بتائے گئے ہیں۔

رَسُوْلاً مِّنْهُمْ يَتْلُوْ عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ. (سورہ جمعہ:۲)

ایک، تزکیہ نفس وتقوائے قلوب۔ دوسرے، تعلیم وتشریح کتاب وحکمت۔

کتاب وحکمت کی تعلیم وتشریح کا سامان (اللہ محدثین وفقہاء کی تربتوں کو ٹھنڈا رکھے) ان کی جاں فشانیوں سے ہو گیا، لیکن حکم تزکیۂ نفوس کی تعمیل کی عملی صورت آخر کیا ہو؟ یا خدانخواستہ کچھ یہ صورت ہے کہ امت نے اس حکم کو قابل تعمیل ہی نہ سمجھا؟ نہیں اور سو بار نہیں۔ ''مرشد کی تلاش''، یعنی ایک زندہ ومکمل نائب رسول سے تعلق اتباع، اس سوال کا جواب ہے۔ مرشد کے لفظ سے ذہن ہرگز چادر اور گاگر، مزار اور صندل، ستار اور طنبورے کی طرف منتقل نہ ہو، مراد اس سے صرف ایک زندہ روحانیت ہے۔

یہ مرشد صحیح معنی میں مقلد محض ہوتا ہے، استاد ازل کے سبق کو دہرا دینے والا، آئینہ کے عقب میں طوطی ---------- ایجاد واختراع ہرگز اس کا منصب نہیں -------- لیکن اجتہاد جزوی اور استنباط کا دروازہ تو مقلدوں کے ماہرین فقہ اور غیر مقلدوں کے ماہرین حدیث دونوں کے لیے کھلا ہوا ہے، پھر اس رحمت عام کا دروازہ غریب صوفی ہی کے حق میں کیوں بند رہے؟ وہ اپنے تجربات ومشاہدات کی طرف سے آنکھیں بند نہ رکھے گا۔ جس طرح اہل ظاہر اپنے حواس وعقل کو معطل نہیں کر دیتے، وہ نور نبوت ہی کی روشنی میں تدبیریں اور معالجے وقت اور ماحول کی مناسبت سے مرض کی نوعیت اور مریض کے مزاج کے مطابق نکالتا اور بتاتا رہے گا۔ یہ اس کی خودرائی نہ ہوگی، عین اجرائے حکم دین ہوگا۔ یہ بدعت کی نہیں اتباع سنت ہی کی صورت ہوگی۔ البتہ اس کے لیے بھی حدود وقیود ضرور ہیں، جس طرح کہ اہل ظاہر کے لیے احکام کے اجتہاد واستنباط کے لیے قاعدے ہیں، پابندیاں ہیں، یہ نہیں کہ اندھا دھند وہ جس چیز کا چاہے، حکم دے دے، جس عمل کو چاہے ممنوع ٹھہرا دے''۔ (ص:۱۹، ۲۰)

''شاہ ولی اللہ دہلویؒ جو اپنے زمانے میں اس فن کے امام ہوئے ہیں، اپنے رسالے ''القول الجمیل'' میں تحریر فرماتے ہیں کہ بیعت سنت رسولؐ ہے اور بیعت کا اطلاق

صرف بیعت خلافت تک محدود نہیں بلکہ عہد نبوتؐ میں بیعت کی مختلف صورتیں تھیں، مثلاً بیعت خلافت، بیعت جہاد، بیعت توبہ وغیرہ --------- صوفیہ کی مروجہ بیعت، بیعت تقویٰ میں داخل ہے۔ خلفائے راشدینؓ کے زمانے میں اس بیعت کی علحدہ ضرورت نہ تھی، اس لیے کہ ان سے جو بیعت خلافت ہوتی تھی اس میں یہ بیعت بھی داخل وشامل ہوتی تھی۔ اس کے بعد ایک عرصے تک یہ بیعت، بیعت خلافت کے ساتھ التباس واشتباہ کے اندیشے سے ملتوی وموقوف رہی اور گروہ صوفیہ اس بیعت کا قائم مقام خرقے کو سمجھتا رہا، پھر جب ملوک وسلاطین کا دور دورہ پوری طرح ہوگیا، اور خلافت رسولؐ کی بیعت بندی ہوگئی، تو صوفیہ کرام نے بیعت تقویٰ کی سنت مردہ کو پھر سے زندہ کیا --------- آگے چل کر جہاں شاہ صاحب بیعت لینے والے مرشد کے اوصاف وخصائص شمار کرتے ہیں، وہاں ایک خصوصیت یہ بھی بیان کرتے ہیں:

والشرط الخامس ان یکون تصحب المشائخ وتأدب بھم دھراً طویلا واخذ منھم النور الباطن والسکینة وھذا لان سنة اللّٰہ جرت بان الرجل لا یفلح الا اذا رأی المفلحین کما ان الرجل لایتعلم إلابصحبة العلماء وعلیٰ ھذا القیاس غیر ذالك من الصناعات.

یعنی: پانچویں شرط یہ ہے کہ اس کو مشائخ کی صحبت رہی ہو اور اس نے ان سے ایک عرصۂ دراز تک ادب اور قاعدے سیکھے ہوں اور ان سے باطن کا نور اور اطمینان حاصل کیا ہو اور یہ شرط اس لیے ہے کہ عادت اللہ یوں ہی جاری ہے کہ کسی کو مراد اس وقت تک نہیں ملتی جب تک وہ مراد پانے والوں سے نہ مل سکا ہو، اسی طرح جس طرح علم بغیر صحبت علماء کے حاصل نہیں ہوتا، نیز دوسرے ہنر بغیر استاد کے"۔ (ص:۲۱،۲۲)

"عوام کے ذہن میں مرشد کی تعظیم واحترام کا جو مبالغہ آمیز اور شرک سے ڈانڈے ملادینے والا تخیل قائم ہوگیا ہے، اس میں اعتدال پیدا کرنا اور اس کی اصلاح ہی

ضروری ہے۔ شیخ اول تو درجۂ کامل کے ہیں ہی کمیاب-------- اور پھر بالفرض وہ کامل سے کامل ہوں، جب بھی بہر حال معصوم تو نہیں ہو سکتے، مرتبہ عصمت و معصومیت صرف انبیائے کرامؑ کے لیے مخصوص ہے۔ شیخ غلطیاں بھی کرے گا اور اجتہادی غلطیاں تو ممکن ہے کہ کثرت سے کر جائے، دائرہ طریقت و شریعت کے اندر بھی وہ ہر خطا و لغزش سے محفوظ نہیں اور اس کے باہر دنیا کے عام مسائل میں تو اس کی رائے وہی درجہ رکھتی ہے جو دوسرے انسانوں کی۔ لغزشوں بلکہ معصیتوں کا صدور بھی اس سے ناممکن نہیں، بہر حال وہ ایک بشر ہی ہے، غیر معصوم۔ البتہ اس کے فضائل و کمالات کا پلّہ نسبۃً بہت بھاری ہوگا۔ گناہوں کا صدور اس سے کم تر ہی ہوگا۔ کبائر اصرار و تواتر کے ساتھ، اس سے صادر نہ ہوں گے اور بحیثیت مجموعی اس کی بصیرت دینی اور روحانی معاملات میں تقرب الی اللہ کے وسائل و مسائل میں بہت صاف ہوگی۔

خلاصہ چند لفظوں میں یوں سمجھیے کہ:

(۱) حقیقی نائبان رسولؐ اور مصلحین کے زندہ نمونے ہر دور میں موجود رہتے ہیں۔ اجزائے دین میں عملی رسوخ عام سنت الٰہی کے مطابق انہی کی صحبت و معیت سے پیدا ہوتا ہے۔

(۲) اپنے امکان بھر کوشش و تلاش کر کے اپنے کو ان تک پہنچانا اور ان سے عملی تعلیم حاصل کرنا چاہیے۔

(۳) تاہم یہ کوئی درجہ فرض یا واجب کی چیز نہیں، اگر کسی کی رسائی ایسے مصلح تک نہ ہو سکے یا اس پر اپنی طبیعت نہ جمے تو وہ معذور ہے۔

(۴) احکام دین درجۂ ضروری میں اسے جس طرح بھی پہنچ جائیں، بس نجات و مغفرت کے لیے انہی پر عمل کافی ہے۔

(۵) مرشد کا وجود ایک نعمت ہے، البتہ اسے وہ درجۂ اہمیت بھی حاصل نہیں جو اہل غلو نے اسے دے رکھا ہے"۔ (ص:۲۳،۲۴)

تقلید اور حدود تقلید - تعارف

تقلید کے سلسلے میں چند نقطہ ہائے نظر پائے جاتے ہیں۔ ایک طرف وہ حضرات ہیں جو دین پر قائم رہنے کے لیے تقلید ہی کو ضروری سمجھتے ہیں اور عدم تقلید کو سرے سے غلط مانتے ہیں۔ دوسری جانب ایک گروہ ہے جو تقلید کو مطلق تسلیم ہی نہیں کرتا۔ اس گروہ میں شامل افراد اپنے نظریے کی تبلیغ واشاعت میں اتنے جارح وسخت گیر ہیں کہ وہ مقلدوں کے عقائد کو باطل گردانتے ہیں۔ تیسری جانب وہ حضرات ہیں جن کا نظریۂ تقلید توازن و اعتدال پر مبنی ہے۔ وہ افراط یعنی تقلید جامد کو جس طرح نامناسب مانتے ہیں۔ اسی طرح وہ تفریط یعنی عدم تقلید کو بھی خیر امت کے لیے ضرر رساں سمجھتے ہیں۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ تقلید کے ضمن میں اسی آخر الذکر نقطۂ نظر کے نہ صرف حامل تھے بلکہ اس پر عامل بھی تھے۔ ان کو رب کریم نے اعتدال کی نعمت اور توازن کی دولت سے بھرپور نوازا تھا۔ وہ افراط وتفریط کی آلائشوں سے پاک تھے۔ مسئلہ تقلید پر مولانا کا ایک جامع اور معتدل مضمون جو ایک سوال کے جواب میں ہے صدق فاؤنڈیشن لکھنؤ نے کتابچے کی شکل میں شایع کیا جارہا ہے۔ یہ مضمون ۳؍جولائی ۱۹۳۱ء کو ہفتہ وار ''سچ'' لکھنؤ میں شایع ہوا تھا۔ اتنی مدت گزر جانے کے بعد بھی اس کی افادیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔ رب ماجد سے دعا ہے کہ امت کو فروعی مسائل میں پڑنے اور گھرے رہنے سے بچالے۔ آمین۔

مولانا دریابادیؒ تقلید کے سلسلے میں رقم طراز ہیں:

'''' ''مقلدین'' اور ''اصحاب رائے'' کا باضابطہ گروہ تو بعد کو پیدا ہوا ہے، خود عہد صحابہ کرامؓ میں حال یہ تھا، کہ تمام صحابہؓ علم ونظر، واقفیت ومعلومات میں ایک دوسرے کے

مساوی نہ تھے۔ ممتاز ترین صحابہؓ کے درمیان بھی اس حیثیت سے فرق مراتب تھا۔ صحاح میں متعدد روایات اس مضمون کی ملتی ہیں کہ فلاں صحابیؓ کو فلاں مسئلہ سے متعلق کوئی حکم معلوم نہ تھا، انہوں نے اپنے سے عالم تر صحابیؓ سے دریافت کیا، اور جواب پانے پر محض ان کے قول پر عمل شروع کر دیا۔ بغیر اس تحقیق و تفتیش کے کہ اس جواب کا مبنیٰ و ماخذ کیا ہے۔ اور عہد تابعین میں تو اس کی مثالیں اور بھی کثرت سے ملتی ہیں، کہ تابعی نے محض کسی صحابیؓ کے قول کو سند قرار دے دیا ہے۔ ظاہر ہے، صحابیؓ کا قول بجائے خود حجت نہیں ہو سکتا، نہ دوسرے صحابیؓ کے لیے، نہ تابعی کے لیے۔ اور جب کبھی بھی تسلیم کیا جائے گا، تو اسی حسن ظن اور اسی اعتماد کی بنا پر کہ اس قول کا پیش کرنے والا، صاحب دیانت ہے اور کتاب و سنت کا علم رکھنے والا۔ اس اعتماد اور اس حسن ظن کے بغیر دنیا کے علوم و فنون کے کسی شعبے میں بھی چارہ نہیں۔ اس سے کسی طبقۂ انسانی کو مفر نہیں۔ اصطلاح میں اسی فطری اور ناگزیر ضرورت کا نام، یعنی بلا مطالبۂ دلیل، اعتماد و حسن ظن کی بنا پر کسی عالمِ متدین کے قول کو مان لینے کا نام، ''تقلید'' ہے۔

کلام مجید کی بھی متعدد آیات اسی معنی کی جانب رہنمائی کر رہی ہیں۔ کہیں تو انبیائے کرامؑ کے نام لے لے کر ارشاد ہوتا ہے، کہ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ، 'ان کی راہ کی پیروی کرتے رہو۔'' یا یوں، کہ وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا، ''ہم نے انہیں امام بنا دیا، کہ وہ ہمارے حکم کے مطابق لوگوں کو ہدایت کرتے رہیں۔'' اور کہیں انبیاءؑ کی قید اڑا کر مطلق مقبولین، سالکین و خاشعین کے اتباع کی ترغیب دلائی ہے۔ مثلاً وَاتَّبِعْ سَبِیْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَیَّ. ''ان لوگوں کی پیروی اختیار کرو، جو میری طرف جھکنے والے ہیں''۔ اس میں صراحت ہے کہ عوام کو خاشعین کی پیروی اختیار کرنی چاہیے۔ یا پھر مثلاً فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ. ''اگر تمہیں علم نہ ہو، تو اہل علم سے دریافت کر لیا کرو۔'' اس میں عوام کو اہل علم کی تقلید کی ترغیب صاف اور صریح الفاظ میں ہے۔ علیٰ ہذا سورۂ فاتحہ میں صِرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ. کی

تشریح صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ سے کرنے کے معنی ہی یہ ہیں، کہ راہ راست وہی ہے، جو مقبولین کاملین کی راہ ہے اور اس راہ پر چلنا یہی ہے، کہ ان لوگوں کی راہ پر چلا جائے۔ تلاش و تتبع سے بعض اور آیات قرآنی بھی اسی مفہوم پر دلالت کرنے والی مل جائیں گی"۔ (ص: ۹، ۱۰)

"نفس بشری ہر شے میں آسانی اور ہر مسئلے میں سہولت ڈھونڈھتا ہے، تحقیق مسائل اور احکام حقیقی کی دریافت سے، بجز چند تشنگان معرفت کے، اور کسی کو واسطہ نہیں ہوتا۔ بے قیدی کا لازمی نتیجہ عموماً کہ جس کو جہاں جہاں سے موافقت نفس بہم پہنچ سکے گی، بس وہیں سے حصول فتویٰ کی تلاش رہے گی، اور عوام امت پر اصلی حکومت، بجائے احکام شریعت کے، تقاضائے نفس کی مسلط ہو جائے گی۔ روزمرہ کا تجربہ ہے، کہ جب ہم مریض ہو کر کسی طبیب کا علاج شروع کرتے ہیں، تو دوا، پرہیز اور ہر تدبیر میں اسی کی ہدایات کے پابند رہتے ہیں۔ یہ نہیں کرتے، کہ دوا تو ایک کی شروع کی اور جب کسی بد پرہیزی کا جی چاہا، اس کے لیے سارے شہر کے طبیبوں اور ڈاکٹروں، تجربہ کاروں اور نو آموزوں کے پاس دوڑ دھوپ کر کے، کہیں نہ کہیں سے اجازت حاصل ہی کر لی۔ یہ طریق، طریق علاج نہیں، طریق ہلاکت ہوگا۔ "تقلید" میں بھی عامی اس سے زائد کچھ نہیں کرتا، کہ تحفظ صحت دینی کے لیے اپنے تئیں ایک مستند و حاذق طبیب دینی کے سپرد کر دیتا ہے، اور علاج، پرہیز و تیمارداری وغیرہ کے ہر جزیے میں اسی کی ہدایات کا پابند رہتا ہے۔ دین کو اگر بازیچہ بنانا منظور نہیں اور اپنے کو دینی تفریح و تلعب سے بچانا مقصود ہے، تو اپنے کو جزئیات و تفصیلات شریعت میں کسی ایک مستند و ماہر فن، امام یا مجتہد کی ہدایات و احکام کا پابند کر دینا ہی بہتر ہوگا"۔ (ص: ۱۰، ۱۱)

"امت کو اگر ابتری و فساد میں پڑنے سے بچانا مد نظر ہے، تو تقلید عمومی کو محدود و مقید کرنا ہی پڑے گا، اس کے سوا چارہ نہیں۔ جو "غیر مقلد" کہلاتے ہیں، انہیں بھی تقلید مذہب معیّن سے مفر نہیں۔ امام ابو حنیفہؒ و امام شافعیؒ کی تقلید نہ سہی، امام بخاریؒ و امام مسلمؒ کی سہی، محمدؒ و ابو یوسفؒ کی نہ سہی، ابن تیمیہؒ و ابن قیمؒ کی سہی، طحاویؒ کی نہ سہی، شوکانیؒ کی سہی۔

بہر حال اصول بالکل ایک ہے، فرق جو کچھ ہے، وہ اشخاص کا ہے"۔ (ص:۱۲)

"امام صاحب کا ایک طرف تقویٰ وطہارت اور دوسری طرف ان کی فقاہت و فطانت، دوست و دشمن سب کو مسلّم ہے۔ گفتگو جو کچھ چلتی ہے، وہ امام صاحب کے علم حدیث میں۔ منکرین یہ کہتے ہیں اور فاتحانہ لہجہ میں یہ کہہ کر، گویا کسی رازِ سربستہ کا انکشاف کر لیتے ہیں، کہ ابو حنیفہؒ محدث نہ تھے! لیکن گزارش یہ ہے، کہ اس کا دعویٰ کس نے کیا تھا؟ احناف کو یہ تسلیم کر لینے میں ذرا بھی عار نہیں، کہ وہ اپنے امام کی تقلید بہ حیثیت ان کے مجتہد ہونے کے کرتے ہیں، نہ کہ بہ حیثیت محدّث ہونے کے۔ جس معنی میں امام بخاریؒ و امام مسلمؒ محدث گزرے ہیں، اس معنی میں امام ابو حنیفہؒ یقیناً محدث نہ تھے، ٹھیک اسی طرح جیسے ابن جریرؒ و ابن کثیرؒ، بلکہ زمخشریؒ و بیضاویؒ کے مثل، وہ مفسر قرآن بھی نہ تھے، لیکن ان کے باضابطہ مفسر نہ ہونے سے کوئی یہ نتیجہ نکال لے گا کہ وہ قرآن ہی نہیں سمجھے تھے؟ مجتہد کے لیے بس اس قدر کافی ہے، کہ قرآن، سنت و آثار پر اس کی نظر بہ قدرِ ضرورت وسیع ہو اور یہ وصف امامؒ میں بدرجۂ اتم موجود تھا"۔ (ص:۱۵، ۱۶)

"امام صاحبؒ کی تابعیت، یعنی رویت صحابی، ثابت ہے اور بعض نے تو رویت سے بڑھ کر روایت کا بھی دعویٰ کیا ہے۔ چناں چہ متعدد رسائل اس بحث پر موجود ہیں۔ امامؒ پر جہاں جرح و قدح ہوئی ہے، وہاں آپ کے مداحوں اور آپ کے فضل و کمال کی شہادت دینے والوں کی جلالت قدر کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیے۔ امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ، یحییٰ بن معینؒ، علی بن المدینیؒ، عبداللہ بن مبارکؒ، ابن جریجؒ، شعبہؒ، سفیانؒ، حافظ ابن حجرؒ، ابن حجر مکیؒ، ذہبیؒ، نوویؒ، سیوطیؒ، فیروزآبادیؒ، ان میں سے کوئی حنفی نہیں، لیکن امامؒ کے فضائل و مناقب میں رطب اللسان ہے۔ ایسا سلسلۃ الذہب ہر ایک کو تو نصیب نہیں ہو جاتا۔ ان مباحث کی تفصیل "معجم المصنفین" جلد دوم، نیز محقق فرنگی محلیؒ کے مقدمۂ "ہدایہ" و مقدمہ "سعایہ" و مقدمہ "عمدۃ الرعایہ" وغیرہ میں ملے گی۔ "سچ" میں سب کے

دوہرانے کی کہاں گنجایش؟''۔(ص:۱۶،۱۷)

''حکیم الامۃ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ، جو ایک طرف، تقلید شخصی کے جواز و استحباب ہی کے نہیں، بلکہ ہجرت سے دوصدیوں بعد سے اس کے وجوب کے قائل ہیں:

و کان هذا هو الواجب فی ذلك الزمان

یعنی :اور تقلید مذہب معین کی اس زمانے کے بعد سے (یعنی دوصدیوں کے بعد سے)واجب ہوگئی ہے۔

اور وہ یہاں تک فرما گئے ہیں، کہ ہندوستان و ماوراء النہر میں جہاں شافعی، مالکی و حنبلی مذاہب کے نہ مستند علماء موجود ہیں، نہ ان کی کتابیں، ہر عامی پر :

وجب علیه ان یقلد لمذهب ابی حنیفة و یحرم علیه ان یخرج من مذهبه لأنه لینبذ یخلع من عنقه رقبة الشریعة و یبقی سدی سهلا. (الإنصاف فی بیان اسباب الإختلاف. باب ٤)

یعنی :واجب ہے تقلید امام ابوحنیفہؒ کی اور حرام ہے اس کے لیے اس مذہب سے باہر نکلنا، اس لیے کہ اس کے حق میں اس کے معنی یہی ہوں گے کہ وہ شریعت کا پھندا اپنی گردن سے نکال پھینکے گا اور خود آزاد و بے قید ہوکر رہ جائے گا''۔(ص:۲۰،۲۱)

ندوۃ العلماء کا پیام فرزندان دار العلوم کے نام۔تعارف

مولانا عبد الماجد دریابادیؒ کو دورِ حاضر کی عظیم دینی اصلاحی اور تعلیمی تحریک، تحریک ندوۃ العلماء اور اس کے دار العلوم سے گہرا تعلق تھا۔ وہ مسلم معاشرے پر اس کے ٹھوس اور دیرپا اثرات سے اچھی طرح واقف تھے۔ ان کو فرزندان دار العلوم کی قابل صد رشک خدمات کا دل سے اعتراف تھا۔ اس کا اظہار ان کے زیرِ نظر خطبات سے بہ خوبی ہوتا ہے۔ گو کہ انہوں نے دار العلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم نہیں حاصل کی لیکن اساتذہ ندوہ اور طلبائے ندوہ سے ان کے تعلقات یگانگت اور محبت ومودت کے ہمیشہ رہے۔ اس کے اعتراف میں دار العلوم کے طلبہ قدیم نے ۱۹۲۵ء میں اپنا ایک باضابطہ جلسہ کر کے انہیں اعزازی 'ندوی' بنالیا اور ان کا نام طلبہ قدیم کے رجسٹر میں لکھ لیا تھا۔

اس مجموعے میں شامل پہلا خطبہ مورخہ ۲۴/دسمبر ۱۹۳۲ء کو مولانا عبد الماجد دریابادیؒ نے پڑھا تھا۔ وہ اس وقت انجمن طلبائے قدیم کے سالانہ جلسے میں صدر استقبالیہ تھے۔ دوسرا خطبہ مولاناؒ نے مذکورہ انجمن کے سالانہ جلسے کی صدارت کرتے ہوئے ۲۱/دسمبر ۱۹۴۰ء کو پڑھا تھا۔ اور تیسرا خطبہ انہوں نے ''جمعیۃ الاصلاح'' کے توسیعی خطبات کے جلسے کی صدارت کرتے ہوئے ۳۰/ستمبر ۱۹۶۷ء کو پڑھا تھا۔ اس جلسے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم کو توسیعی خطبہ پیش کرنا تھا لیکن وہ بوجوہ تشریف نہ لاسکے۔ ان کا خطبہ ان کی عدم موجودگی میں پڑھا گیا۔

اول الذکر دو خطبوں کا مجموعہ دارالعلوم کے ۸۵ سالہ جشن تعلیمی (منعقدہ ۱۹۷۵ء) کے موقع پر جناب حبیب احمد صاحب قدوائی (متوفی ۲۰۰۰ء) (مولانا دریابادی کے برادرزادے اور خویش) اور ان کے دوست مولانا حسین شمس علوی صدر ادارہ فروغ اردو ہند، لکھنؤ نے شایع کیا تھا۔ مدت سے یہ نایاب تھا۔ صدق فاؤنڈیشن لکھنؤ نے دونوں خطبے مع تیسرے خطبۂ صدارت کے شایع کیے ہیں۔ یہ تینوں خطبے ''سچ''، ''صدق'' اور ''صدق جدید'' سے نقل کیے گئے ہیں۔

سطور ذیل میں ان علمی، تاریخی اور ادبی خطبات کے کچھ اقتباسات درج ہیں:

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کتاب کے ''پیش لفظ'' میں تحریر فرماتے ہیں:

''مخدومی مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی مدظلہ ضابطے سے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے فاضل و تعلیم یافتہ نہیں۔ خوش قسمتی سے اگر ایسا ہوتا تو یہ اس شہرۂ آفاق تعلیم گاہ کے لیے باعث نازش و افتخار اور اس کے ذمہ داروں کے لیے سرمایۂ مسرت و انبساط ہوتا۔

لیکن ان کے اس درس گاہ اور اس کے فضلاء و ابنائے قدیم، بلکہ اس کے ایک عظیم رہنما اور اس کے مایۂ ناز فرزندوں کے ''معلم اول'' علامہ شبلی نعمانی سے ایسے گہرے اور مخلصانہ تعلقات و روابط رہے ہیں اور ان میں اور سید الطائفہ مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالباری ندوی، مولانا مسعود علی ندوی، ڈاکٹر حکیم سید عبدالعلی حسنی ندوی (سابق ناظم ندوۃ العلماء) سے ایسے عزیزانہ و برادرانہ تعلقات اور ایسی یگانگت و مودت رہی ہے کہ ان کو اس علمی و فکری خاندان کا ایک فرد اور بزم شبلی کا ایک رکن رکین کہنا صحیح ہوگا۔ ان کا اس درس گاہ سے اتنا دیرینہ تعلق رہ چکا ہے اور وہ سید صاحب، مولانا عبدالباری صاحب اور مولانا مسعود علی صاحب سے اس طرح شیر و شکر اور ندوے کی بہت سی خصوصیات کے اس طرح حامل رہے ہیں کہ نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کو (جن

کی حیثیت ایک سرپرست خاندان کی سی تھی) یہ خیال ہوا کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے باقاعدہ فارغ ہیں اور انہوں نے لکھنؤ میں اجلاس ندوۃ العلماء کے خطبہ صدارت میں مولانا عبدالباری ندوی کے ساتھ ان کا نام لیا۔ اسی بنا پر طلبۂ قدیم کی انجمن نے ان کو ایک مرتبہ اپنے سالانہ جلسے کا صدر استقبالیہ اور ایک مرتبہ صدر اجلاس منتخب کیا، جو نہ صرف ان کی طرف سے اعتماد و استناد بلکہ یگانگت و اتحاد کا اعلان تھا۔ گویا ان کو اعزازی طور پر ''ندوی'' تسلیم کرلیا گیا اور ابنائے قدیم نے اپنی مہر تصدیق اس پر ثبت کردی۔

ان دو تاریخی موقعوں پر مولانا نے جو خطبے پڑھے وہ ان کے طرز تحریر اور ادب و انشاء کی بہترین خصوصیات کے حامل تھے۔ وہی زور قلم، وہی آمد، بے تکلف مسجع فقرے جو آورد سے خالی ہیں، وہی ادبی و تاریخی تلمیحات اور رعایتیں جو ان کی انشا پردازی کا جز بن گئی ہیں، وہی اس تحریک و ادارے کی افادیت اور اس کے بانیوں کی اصابت رائے اور فراست پر یقین، جو ان کے قلبی تعلق اور ذہنی اتحاد کی دلیل ہے۔ ان کی بہت سی تحریروں کی طرح ان کو جب پڑھیے ایک لطف تازہ اور ایک لذت بے اندازہ، معلوم ہوتا ہے کہ یہ تحریریں برسوں کی پرانی نہیں، شاداب پھولوں کی طرح اب بھی ان میں تازگی و رعنائی، جوانی و برنائی ہے''۔ (ص:۵،۶)

مولانا دریابادی ''ایک نام کے ندوی کا پیام ندوے کی برادری کے نام'' میں تحریر فرماتے ہیں:

''اللہ کی رحمت اور سلامتی، ہم پر اور آپ پر، آنے والوں پر اور بلانے والوں پر، اور ان پر، جو دور دور سے کھنچ کھنچ کر زحمتیں اٹھا کر آئے اور ان پر، جنہوں نے پرانی یاریوں اور دوستیوں کی کمندیں پھینک پھینک کھینچا اور گھسیٹا! مسافتوں کی دوری قلوب کی کشش کے سامنے گرد، موسم کی سردی دلوں کی گرم جوشیوں کے آگے سرد! آج شرق و غرب، شمال و جنوب میں خزاں کا پہرہ۔ اس چہار دیواری کے اندر فصل بہار کا دور دورہ۔ ایک عالم اپنے مصائب میں مبتلا و مایوس، آپ کی محفل مبارک اور صدر محفل ''مسعود''۔ (صدر جلسہ

مولانا مسعود علی ندوی مہتمم دارالمصنفین، اعظم گڑھ تھے)۔

رحمت وسلامتی آج کے مہمانوں پر اور میزبانوں پر۔ اس مکان کے پرانے مکینوں پر، اور ان کے نئے جانشینوں پر۔ رحمت ان پر جو یہاں رہے اور پلے، پڑھے اور بڑھے، سیکھے اور کھیلے۔ رحمت ان پر جنہوں نے رکھا اور پالا، پڑھایا اور بڑھایا، سکھایا اور کھلایا! جو بگڑے ہوئے آئے تھے۔ وہ یہاں آکر بنے اور سدھرے، جو کچھ نہ تھے وہ یہاں رہ کر خدا جانے کیا کچھ ہو گئے۔ رحمتیں اس مکان کے در و دیوار پر۔ رحمتیں اس چمن کے صحن و سبزہ زار پر۔ رحمت ان پر جنھوں نے اس رحمت وسلامتی کی یہ سبیل لگادی۔ رحمت اس کے پینے والوں پر، رحمت کے اس پلانے والوں پر، رحمت جوانان جرعہ نوش پر۔ رحمت پیران مئے فروش پر!''۔ (ص:۷،۸)

''ندوہ جس وقت عالم وجود میں آیا، دارالعلوم کی بنیاد جس دم پڑی، دیوبند کا قابل صد قدر اور مستحق ہزار فخر مدرسہ موجود تھا۔ رام پور تھا، سہارنپور تھا، فرنگی محل تھا اور دینی و علمی مرکز موجود تھے ندوہ کی ضرورت پھر بھی باقی تھی۔ ندوہ خود مستقل اور نئی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے آیا کسی معاصر ادارے کی شاخ بننے نہیں آیا۔ حسن بصری وجنید بغدادی، بخاری و مسلم، ابوحنیفہ وشافعی رحمۃ اللہ علیہم اجمعین، سب کے دور کے بعد ابوالحسن اشعری اور ابوبکر باقلانی، ابوحامد غزالی اور فخر الدین رازی، شاہ ولی اللہ دہلوی اور رحمت اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کی جگہ بہر حال خالی تھی ------ لیکن عرصے تک خالی نہیں رکھی جاسکتی تھی۔

تشکیک وارتیاب، دہریت والحاد، فرنگیت و مادیت، دجالیت و یاجوجیت کا بے پناہ سیلاب بڑھا ہوا چلا آرہا تھا، مبارک تھیں وہ آنکھیں، جنہوں نے اس کو دیکھا، بھانپا۔ مبارک تر تھے وہ ہاتھ، جو فوراً بند کے باندھنے میں لگ گئے۔ فِرق اسلامی کے باہمی تفرقے اب تقویم پارینہ ہو چکے تھے۔ اب معاملہ ہاتھ میں لگی ہوئی پھانسوں اور پیر میں گڑے ہوئے کانٹوں کے نکالنے کی حد سے گزر چکا تھا۔ اب وقت دل، دماغ اور جگر، اعضائے رئیسہ کے بچاؤ کا تھا۔ اب حملہ اس عظیم الشان وہیبت ناک قوت کا شروع ہو چکا تھا جس کی اژدر دہاں شعلہ فشاں

توپوں کے ہدف براہ راست دین کے سفینے تھے اور اہل ایمان کے سینے"۔ (ص:۹)

مولانا اپنے دوسرے خطبے "ایک نام کے ندوی کا دوسرا پیام ندوے کی برادری کے نام" میں رقم طراز ہیں:

"ندوہ یا دار العلوم ندوہ، نام در و دیوار کا نہیں، اینٹ و چونے کی عمارت کا نہیں، دفتر نظامت کے کاغذات اور رجسٹروں کا نہیں، کتب خانے یا اقامت خانے کا نہیں، نام ہے چند مقاصد کا، ایک متعین پروگرام کا، ایک بلند نصب العین کا۔ آپ اگر ندوی ہیں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ آپ نے ندوے کے اس پیام کو قبول کر لیا۔ اس آواز کے آگے اپنا سر جھکا دیا۔ ندویت کوئی مادّی ڈپلوما یا کاغذی سند نہیں۔ نام ہے اس نسبت کا، اس رشتے کا، اس رابطۂ قلب کا، جو آپ نے مقاصد ندوہ کے ساتھ قائم کر لیا ہے۔ ندوی ہوتے ہی آپ کے جز و زندگی بن گئے یہ مقاصد ندوہ، اور فرض ہو گیا آپ پر ان مقاصد پر اعتقاد و عمل، ان کی تبلیغ و ترویج، ان کی نشر و اشاعت، اب آپ لوگوں سے ملیں گے ان کے لیے، لڑیں گے ان کے لیے، کھنچیں گے ان کے لیے، جھکیں گے ان کے لیے، تنیں گے، سنیں گے، غرض یہ کہ جئیں گے ان کے لیے!

مقاصد کی فہرست کچھ بہت طویل نہیں، پھیلانے کی جگہ سمیٹنے پر اور بسط کے بجائے ایجاز پر آیے، تو کُل دو لفظوں میں ادا کر سکتے ہیں: اسلام کی خدمت اور دین کی نصرت! توحید کی حرارت اور ناموس رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی غیرت! اسی کی شان سے جینا، اسی کی آن پر مرنا فَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ. یہی مقصد ہے اور یہی مدعا۔ یہی قبلہ مقصود اور یہی نظر کا منتہا۔ باقی جو کچھ ہے اسی متن کی شرح اور پھر شرح کا حاشیہ۔ درس و تدریس کے مشغلے، عمارتوں کے سلسلے، تصنیف و تالیف کی الماریاں، وعظ و تذکیر کی سرگرمیاں، سب اسی مقصود کے ماتحت اور اسی کے تابع۔ سب اسی مطلوب کے وسائل اور اسی کے ذرائع۔

دین کی نفس خدمت میں یہ نہیں کہ ندوہ منفرد ہو۔ دین کی خدمت ندوے کے

وجود میں آنے سے پہلے بھی ہو رہی تھی، اب بھی ندوے کے حدود سے باہر ہو رہی ہے۔ دہلی، لکھنؤ، دیوبند، سہارن پور وغیرہ وغیرہ کی درس گاہیں پہلے بھی معطل نہ تھیں، اب بھی خاموش نہیں ہیں۔ کہیں تجوید سکھائی جا رہی ہے، کہیں رجال پر جرح وتعدیل ہو رہی ہے کہیں سے فقہ کے مفتی نکل رہے ہیں اور کہیں دیہات کے لیے مبلغ ومناظر ڈھل رہے ہیں۔ یہ سب خدمتیں اپنی اپنی جگہ اہم ہیں اور مستحق اجر بھی قابل قدر بھی۔ لیکن ندوی کا دائرۂ عمل ان سب سے کچھ الگ سا ہے۔ اس کا مقابلہ ہے وقت کے سب سے پُر قوت اور سب سے پُر شوکت فتنے سے، ڈنک مار کر تڑپا دینے والے بچھوؤں سے نہیں، بلکہ مسلم نگل جانے والے اژدہے سے! اس کا کام ہتھیلیوں میں گڑی ہوئی پھانسیں اور تلووں میں چبھے ہوئے کانٹے نکالنا نہیں، اس کا کام ہے جسم ملت کو محفوظ رکھنا سر کے صدمے سے، قلب کے اوپر حملے سے۔ فتنہ کا نام دجالیت رکھیے یا افرنگیت، بہرحال ہے وہ فتنۂ قیامت! ترکی اس کا شہید، ایران اس کا قتیل، مصر اس کا شکار، ہندوستان میں اس کے پھیلنے کے راستے بے شمار۔ کہیں وہ آ رہا ہے یونی ورسٹیوں، کالجوں، اسکولوں کی راہ سے، کہیں قدم جما رہا ہے مختلف کانگریسوں، کانفرنسوں کے بھیس میں۔ اخبارات اور رسالے اس کے نقیب، سنیما اور ریڈیو اس کے وکیل۔ کہیں وطن پرستی کا نقاب اس کے چہرہ پر پڑا ہوا، کہیں وہ ''تجدّد'' کے پردے میں جلوہ نما۔ کہیں لاطینی حروف کا پروپیگنڈہ، کہیں شور نسائیت اور بے پردگی کا برپا۔ غرض خدا معلوم کتنے اس کے نام ہیں اور کتنے مظاہر۔ سچے ندوی کی زبان جب کھلے گی اسی حملے کے جواب میں، اس کا قلم جب اٹھے گا اسی حریف کی تردید میں، مقابلہ جب ہوگا اسی عدو مبین سے، اسی الدالخصام سے!

ندوے کی تاریخ دیکھ جایئے قدیم ترین ناظم مولانا شاہ محمد علی مونگیریؒ تھے، مسیحیت کی تردید میں دفتر کے دفتر اس وقت لکھ ڈالے جب دل ودماغ مرعوب تھے دانایان فرنگ کی دانائی اور حکمت سے۔ اور باستثنائے شاذ کسی میں نہ ہمت تھی فرنگیت اور فرنگیوں

کے مقابلے میں آنے کی۔ آفریں آپ کے اس قدیم ترین ندوی کے اس عزم مجاہدانہ پر، اس ہمت مردانہ پر!

شبلی مرحوم کے دور میں آیے ان کا تو اوڑھنا بچھونا ہی تھا اسی حریف سے زور آزمائی کرنا۔ سوال یہاں شبلی کے جوابات کی قوت وضعف کا نہیں صرف ان کے مطمح نظر کا ہے۔ تاریخ ہو، سوانح عمری ہو، ادب ہو اور تو اور شاعری ہو، کوشش ہر جگہ یہی رہتی ہے کہ اسلام کا بول بالا ہو اور دین کا چہرہ روشن سے روشن تر نظر آئے۔ کہیں اورنگ زیب سے بدگوئیوں کا طعنہ دور کر رہے ہیں، کہیں مامون الرشید کا دربار سجا رہے ہیں، کہیں فاروق اعظمؓ کی آستاں بوسی کی تیاریاں ہیں، کہیں غزالیؒ، نعمان ابی حنیفہؒ اور مولانا رومؒ کی سوانح حیات سنا رہے ہیں۔ کلامی رنگ سب سے جھلکتا ہوا۔ حد یہ کہ جب فارسی شاعری اور شاعروں کے خاص تذکرے ''شعر العجم'' پر قلم اٹھاتے ہیں تو اس کی تمہید میں یوں زمزمہ سنج ہوتے ہیں۔

''اسلام ایک ابر کرم تھا اور سطح خاک کے چپہ چپہ پر برسا لیکن فیض بقدر استعداد پہنچا۔ جس میں جس قسم کی قابلیت تھی اسلام نے اس کو اور چمکا دیا۔ ترک شجاع تھے، شجاع تر ہو گئے۔ ایرانی ہمیشہ سے تہذیب و معاشرت اور علوم و فنون میں ممتاز تھے، اسلام نے ان کو ممتاز تر کر دیا۔''

اور آخری تصنیف سیرت النبیؐ جس کی تمت بالخیر سے قبل خود مصنف کا خاتمہ بالخیر ہو گیا، اس کی کلامی حیثیت تو اس کی تاریخی حیثیت سے زیادہ نمایاں ہے''۔ (ص: ۱۹تا۲۳)

''آپ کے قدیم ارکان میں کاکوری کے منشی اطہر علی مرحوم نے جس ہمت و پامردی سے صوبے کی طاغوتی حکومت کا مقابلہ کیا، اس کی نظیر اس وقت کی تاریخ میں ملنی آسان نہیں۔ بعد کے ارکان میں ایک نام نامی شیخ مشیر حسین قدوائی مرحوم کا ہے۔ انگریزی میں رسالوں، پمفلٹوں، کتابچوں کا ایک انبار لگا گئے ہیں، سب کے سب مسائل اسلامی ہی کی حمایت و نصرت میں۔ اور آخر عمر میں تو بالشویزم اور اسلام پر ایک ضخیم و معرکۃ الآرا کتاب لکھ

کرا پنی ندویت کا حق ادا کر گئے۔ پھر آپ کے ایک سابق شیخ مولانا امیر علی مرحوم ومغفور کی خدمات دینی کوئی بھلانا چاہے بھی تو کیوں کر بھلا سکتا ہے؟ ''ہدایہ'' اور ''عالم گیری'' جیسی ضخیم کتابوں کا نہ صرف مکمل ترجمہ بلکہ شرح بھی اور ''فتح الباری'' کے ضخیم مجلدات کے بیش تر حصوں کو اردو میں منتقل کر جانا اور پھر ۳۰ جلدوں کی طویل وعریض وضخیم تفسیر ''مواہب الرحمٰن'' اور اس کے مقدمے میں جدید مسخ شدہ ذہنیت سے تخاطب، یہ کارنامے ایسے ہیں کہ بجائے ایک فرد کے، اگر ایک جماعت پر تقسیم کر دیے جائیں تو جماعت بھر کے فخر کے لیے کافی ہیں''۔ (ص:۲۳)

''اعظم گڑھ ہی کے ایک گوشے میں، ایک چھوٹے سے قصبے میں، خدمت قرآن کا جو کام انجام پا چکا یا اب انجام پا رہا ہے اور وہاں کی زندگی کی قابل رشک صفائی اور سادگی، یہ سب آپ کے ندوے ہی کا فیض ہے۔ اور اس کے پڑوس کا قصبہ نگرام بھی کس طرح آپ کے ندوے ہی کی علمی نورانیت سے جگمگا رہا ہے۔ حیدر آباد کی اہم علمی، دینی، تصنیفی زندگی میں ندوے کا جو ہاتھ ہے وہ کس سے پوشیدہ ہے؟ جواں مرگ عبدالرحمٰن نگرامی جیسے جواں صالح، جامع علم وعمل فرزند کیا ہر مدرسے کے نصیب میں ہر روز آتے رہتے ہیں؟ دکن، ممبئی، دہلی، پنجاب، بہار، یوپی، بنگال، ہندوستان کے مختلف علاقوں کی تعلیمی اور تدریسی زندگیوں میں آپ کے دارالعلوم کا عنصر کہاں موثر نہیں؟ صحافت جہاں کہیں بھی ندویوں کے ہاتھ میں ہے، خصوصاً علی گڑھ اور ممبئی میں، اپنی متانت وشرافت کا امتیاز قائم کیے ہوئے ہے۔ جامعہ از ہر جیسی دنیائے اسلام کی ممتاز ترین درس گاہ پر جو گہرا اور عظیم الشان نقش، آپ کے ایک بھائی ابھی حال میں ہی چھوڑ کر گئے ہیں۔ وہ ہمارے اور آپ کے فخر کے لیے بس ہے۔ دین کی تڑپ اور تبلیغ دین کی دھن کی مجسم مثال دیکھنی ہو تو اللہ انہیں نظر بد سے محفوظ رکھے اور ان کی اخلاقی صلاحیتوں کو پختہ تر کرے۔ اسی مجمعے میں علی میاں کو دیکھ لیجیے۔ خود دارالعلوم اور مجلس ندوہ کو، کہنا چاہیے کہ اس وقت ملک میں عرصے سے آپ ہی کی برادری کے لوگ چلا رہے ہیں۔ ناظم ندوہ، ندوی، معتمد تعلیم، ندوی، مہتمم

دارالعلوم، ندوی وقس علیٰ ہذا۔ پھر مدرس کی جگہ مدرس، تاجر کی جگہ تاجر، طبیب کی جگہ طبیب، ایڈیٹر کی جگہ ایڈیٹر، غرض اجتماعی زندگی کا کون سا شعبہ ہے جہاں آپ کے بھائی بندوں کو ایک نمایاں اور امتیازی حیثیت حاصل نہیں؟ اور ندویت ان سب میں مشترک۔ بہت سے ایسے بھی ہیں جنہیں براہِ راست اسلام کی خدمت کے موقعے حاصل نہیں، یہ اپنے مختلف عہدوں اور منصوبوں سے اہل اسلام کی خدمت کر کے، بالواسطہ اسلام ہی کے خادموں کی فوج میں داخل ہیں۔ مقصود ان مثالوں کے پیش کرنے سے ان ناموں کے یاد دلانے سے، اپنی جماعت کی بڑائی جتلانا نہیں، اپنوں کو چمکانا نہیں، تحدیث نعمت اور منعم کے ادائے شکر کے ساتھ اپنے کو ان فرائض کی طرف اور زیادہ متوجہ کرنا ہے"۔ (ص: ۲۴، ۲۵)

"ترتیب کے لحاظ سے چوتھی اور آخری، لیکن اہمیت کے اعتبار سے سب سے مقدم گزارش یہ ہے کہ اپنی خودی کو خود فراموشی سے نہ بدلیے، اپنی خودی کو عزیز، اپنی ندویت کو ہمہ وقت بیدار رکھیے۔ ندویت نام ہے قلم سے، زبان سے، قلب سے، جہاد فی سبیل اللہ کا، فرنگیت سے کفر کا، اپنے پر ایمان واعتقاد کا۔

اے اسیر رنگ پاک از رنگ شو
مومن خود کافر افرنگ شو
دانی از افرنگ و از کار فرنگ
تا کجا در قید زنار فرنگ

آپ کے درس ندویت کی بائے بسم اللہ بھی یہی تھی اور تائے تمت بھی یہی۔ یہی مبتدا اور یہی منتہا۔ چاہیے کہ یہی آپ کا مقصد وجود رہ جائے، یہی اس کی غایت زندگی بن جائے۔ زبان پر جاری یہی قال رہے، دل پر طاری یہی حال رہے۔ اللہ کی وسیع دنیا میں چلیے پھریے، ملیے جلیے، لیکن خیال یہ جمار ہے اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے کہ آپ ہیں اللہ کے سپاہی۔ پتلے بن جایے غیرت دینی کے، پیکر ہو کر رہ جایے، حرارت ایمانی کے۔ بگڑ جایے

اس سے، جو آپ کے دین کا تمسخر کرے، لڑ پڑیا اس سے، جو آپ کے آقا و سردار صلی اللہ علیہ وسلم کے ناموس سے گستاخی کی جرأت کرے۔ آنکھیں نکال لیجیے اس کی، جو آپ کے قرآن کی طرف تیکھی نظروں سے دیکھے۔ تعلقات عمر بھر کے توڑ لیجیے اس بدبخت سے، جو ارتداد کی راہ کھولنا چاہے۔ یہی آپ کی جماعت کا سب سے بڑا تمغۂ امتیاز ہے اور سب سے بڑا شرف و افتخار۔

کریم و کارساز مالک و مولیٰ! چلا اپنی مرضیات پر ہم سب کو، ہمارے بڑوں کو اور چھوٹوں کو، ہمارے دوستوں کو، عزیزوں کو، ہمارے رفیقوں کو، شریکوں کو۔ لبریز کر دے ہمارے سینوں کو اپنے دین کی عصبیت سے، اپنے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کی غیرت سے۔ دنیا ٹل جائے تجھ سے بغاوت پر، غداری پر، ہم کو استوار رکھ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اور اپنی کتاب کی وفاداری پر۔ جییں تو تیری عظمت کے نعرے لگاتے ہوئے، دم توڑیں تو تیری توحید کی شہادت دیتے ہوئے، جی کر اٹھیں تو تیرے نام کا کلمہ پڑھتے ہوئے۔ رفیق اور ساتھی ساتھ چھوڑتے رہیں، ہٹتے رہیں، کٹتے رہیں، ٹوٹ ٹوٹ کر دشمنوں سے ملتے رہیں، پر ہمارا قدم نہ ڈگمگائے، ہماری ہمتوں میں، وفاداریوں میں فرق نہ آئے۔ جب وہ ناگزیر وقت آئے کہ سارے سہارے بودے نکلیں اور سارے آسرے دغا دے جائیں تو اس وقت بھی دل کے اندر بسا ہو تیرے قرآن کا بتایا ہوا دین اور روح کی گہرائیوں میں رچا ہو تیرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا آئین۔ اور لب و زبان پر آخری سانس کے ساتھ"۔ (ص:۲۸، ۲۹)

باب سوم

مولانا عبدالماجد دریابادی- مفسر اور مفسر گر

قرآن کریم قیامت تک آنے والے تمام انسانوں کے لیے زندگی گزارنے کا کامل ومکمل ہدایت نامہ ہے۔ اس کی ہدایات وتعلیمات کے مطابق جو زندگی گزاری جائے وہی اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ ہوگی اور جو اس کے متضاد ومخالف ہوگی وہ رب کائنات کو ناپسند ہوگی۔

خدائے رحمٰن ورحیم کی یہ آخری کتاب رحمۃ للعالمین خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر فرشتہ خداوندی حضرت جبرئیل علیہ السلام کے واسطے سے ۲۳ برس کی مدت میں نازل ہوئی۔ یہ اسلامی شریعت کا اولین اور بنیادی ماخذ ہے اس لیے اسلام کے صدر اول ہی میں اس کے احکام ومعانی، دقائق وغوامض وغور وتفحص اور ان کی شرح وتفسیر کرنے کا کام شروع ہوگیا تھا۔ رسول اکرمؐ کے سچے اور اچھے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو دین اسلام کے اولین داعی ومبلغ تھے اس کتاب ہدایت کے بہترین شارح وترجمان تھے۔ ان نفوس قدسیہ نے اپنے محبوب رسول اکرمؐ سے الکتاب کی تعلیمات وہدایات علمی وعملی دونوں طرح سے حاصل کرکے بندگان خدا کو ان سے روشناس کرایا۔ ترجمانی وتفسیر کلام الٰہی کا مقدس کام عہد بہ عہد ہوتا رہا۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی مقدس جماعت میں سے حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی مرتضیٰ، حضرت عبداللہ ابن عباس، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت ابی بن کعب، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابوموسیٰ اشعری اور حضرت عبداللہ ابن زبیر رضی اللہ عنہم تفسیر قرآن کے سلسلے

میں مشہور ہوئے۔ (ملاحظہ ہو "التفسیر والمفسرون" جلد اول، ص:۶۴، از ڈاکٹر محمد حسین الذہبی، مطبوعہ مصر، سن طبع ۱۴۰۵ھ)

سب سے زیادہ تفسیری اقوال رئیس المفسرین ترجمان القرآن حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے مروی ہیں۔

خوش قسمت ہیں وہ اہل علم جن کو یہ توفیق الٰہی الکتاب کی ترجمانی، تشریح اور تفسیر کی سعادت حاصل ہوئی۔ ان باتوفیق بندگان رب العالمین میں مایہ ناز مفسر قرآن اور ممتاز ادیب وصحافی مولانا عبدالماجد دریابادی کا اسم گرامی قابل ذکر ہے جنھوں نے انگریزی واردو دونوں زبانوں میں کلام الٰہی کی ترجمانی وتفسیر کی۔

دینی خدمات اور علمی فتوحات میں مفسر دریابادیؒ کا سب سے درخشاں اور تا قیام قیامت باقی رہنے والا کارنامہ تفسیر ماجدی (انگریزی اور اردو) ہے۔ دونوں زبانوں میں کلام الٰہی کی ترجمانی وتشریح پر مبنی یہ تفسیریں اس مایہ ناز مفسر کے اخلاص، حسن نیت، صحیح قرآن فہمی، تدبر فی الآیات، تمسک بالسنہ، جمہور کے عقائد ومسلک کی مستند ترجمانی، اسلام سے والہانہ شیفتگی، رحمٰن دنیا اور رحیم آخرت کی حقانیت پر بھرپور یقین، رحمۃ للعالمین خاتم الانبیاء سیدنا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم فداہ ابی وامی کی صداقت پر کامل اعتماد، مطالعے کی وسعت، فکر کی رسائی، نقد ونظر کی گیرائی، مشاہدے کی گہرائی، اسلوب کی رعنائی، زبان وبیان کی دل کشی، منطقی طرز استدلال، حکیمانہ بصیرت اور خطیبانہ حرارت کا روشن نمونہ ہیں۔

مفسر دریابادی کے ترجمے اور تفسیر کی چند نمایاں ترین خصوصیات یہ ہیں:

☆ ترجمہ زبان اور انداز بیان کے لحاظ سے نہایت عمدہ۔

☆ تفسیر میں جمہور کے عقائد کی ترجمانی۔

☆ آیتوں کی ترجمانی وتفسیر میں غیر معذرت خواہانہ انداز۔

☆ اصل مصادر اور بنیادی مآخذ سے براہ راست استفادہ۔

☆ اردو اور انگریزی زبان وادب پر حاکمانہ عبور کے ساتھ ساتھ عربی زبان وادب سے بھی اچھی طرح واقفیت۔

☆ مذاہب عالم خصوصاً یہودیت اور مسیحیت پر عمیق نظر، ان کا تقابلی مطالعہ، ان کے اہم علمی، تحقیقی، ادبی، ثقافتی اور تہذیبی کارناموں کی بھرپور معلومات۔

☆ کلام ربانی کی ترجمانی وتشریح میں ادعائیت اور تفسیر بالرائے سے کامل اجتناب۔

☆ ترجمے اور تفسیر کے مطلوبہ علوم کا مستند اور قابل تعریف علم۔

☆ حوالوں اور مراجع کا مکمل اہتمام۔

☆ قدیم ماخذ تک بلاواسطہ لائق ستایش رسائی اور جدید معلومات سے قابل صدرشک آگاہی۔

ایسی گوناگوں خصوصیات وامتیازات کی حامل تفسیر کے بارے میں اکابر علمائے کرام کی رائے اور تبصرے ذیل میں درج ہیں:

علامہ سید مناظر احسن گیلانیؒ نے تفسیر ماجدی کے مطالعے کے بعد مولانا دریابادی کو یہ مکتوب تحریر فرمایا:

''تفسیر ماجدی کی دوسری قسط روح افزا اور دیدہ افروز ہوئی۔ مطالعہ میں مشغول ہوگیا، کیونکہ کافی اہم سورتوں سے اس کا تعلق تھا... تفسیر ماجدی میرے نزدیک تو موجودہ صدی میں قرآن کی ایسی خدمت ہے جس کی قدروقیمت کا اندازہ اس وقت ہمارے مولویوں کو ہو یا نہ ہو لیکن زمانہ جیسے جیسے آگے کی طرف بڑھتا جائے گا، اسی قسم کی تفسیریں مسلمانوں میں جگہ حاصل کرتی جائیں گی۔ اقاصیص وروایات والی کتابوں کا زمانہ ختم ہوگیا، ہمارے علماء انہی کے عادی ہیں۔ ان کو اندازہ ہی نہیں ہے کہ قرآن کو دنیا اب کس طرح سمجھنا چاہتی ہے۔ خدا کی بات خدا ہی کی بات کی حیثیت سے سمجھ میں آئے، مطالبہ اس کا بڑھ رہا ہے، لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ روایتوں کے بغیر قرآن کے سمجھانے اور سمجھنے کی کوئی

دوسری راہ ہی نہیں ہے۔ بحمد اللہ آپ کا کام ہر لحاظ سے کامیاب اور عہد حاضر کے تقاضوں کی تکمیل کے ساتھ سلف کی راہ سے بال برابر بھی الگ نہیں ہوا ہے۔ میرے لیے تو قدم قدم پر اس تفسیر میں نئے معلومات کا ذخیرہ ہی ملتا چلا جاتا ہے، خدا کرے آیندہ حصے بھی جلد سامنے آجائیں''۔

علامہ گیلانی کے مکتوب کے بعد مولانا دریابادیؒ لکھتے ہیں:

''ایک حقیر و بے بضاعت کی سعی و کاوش ہی کیا، لیکن بہرحال اگر اللہ کے کلام کی کچھ صحیح و مناسب حال ترجمانی ہوسکی ہے تو یہ شاید ایک بڑی حد تک خود مولانا اور انہی جیسے اللہ کے نیک بندوں کی دعاؤں اور حوصلہ افزائیوں کا نتیجہ ہے۔ یہ جلد سورۃ المائدہ سے لے کر سورۃ البرأۃ کے خاتمہ تک ہے اور تیسری جلد جو سورۂ نحل کے خاتمہ تک ہے(۱)۔ سننے میں آیا ہے کہ وہ بھی شائع ہوگئی ہے........ عام مولوی صاحبان کے جمود اور خالص تقلیدی ذہنیت پر تو کیا عرض کیا جائے، لیکن اللہ کی اس نعمت کا شکر کس زبان سے ادا کیا جائے کہ اس حقیر سے کام کو اس نے وقت کے ایک نہیں متعدد صاحب نظر و مستند علمائے دین کی نگاہ میں بلند و معتبر کر دکھایا ہے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور علامہ سید سلیمان مرحوم، مولانا محمد اویس نگرامی (استاذ تفسیر دارالعلوم ندوہ) تو خیر ندوی ہی ہیں اور فاضل گیلانی بھی سالہا سال انگریزی دانوں سے گہرا سابقہ رکھنے سے ندوی ہی ہوگئے ہیں۔ خوش قسمتی یہ ہے کہ مولانا ظفر احمد عثمانی تھانوی ثم پاکستانی اور مولانا محمد طیب صاحب دیوبندی جیسے قدیم خیال کے بزرگوں کے دلوں میں بھی ہر طرح محبت ہی ڈال دی ہے۔ (ملاحظہ ہو: ہفتہ وار صدق جدید لکھنؤ، جلد نمبر ۵، شمارہ نمبر ۱، ۳ر دسمبر ۱۹۵۴ء)

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند اس تفسیر کے متعلق اپنی گراں قدر رائے یوں ظاہر کرتے ہیں:

''تفسیر ماجدی حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کی شاہ کار کتاب ہے

جس میں تمام علم دوست طبقوں بالخصوص نوتعلیم یافتہ نوجوانوں کے لیے ان کی نفسیات کے مطابق کافی سامان فراہم کردیا گیا ہے۔ تفسیر کی پاکیزہ زبان، بلیغ تعبیر، جامع مضامین ومطالب اور قرآنی حقائق کی سہل ممتنع انداز سے تفہیم اس تفسیر کے خاص امتیازات ہیں۔

........مجھے تفسیروں میں دو چیزوں کی جستجو اور تلاش زیادہ رہتی تھی۔ ایک یہود ونصاریٰ سے متعلقہ آیات میں قرآن نے جن تاریخی پہلوؤں کی طرف اشارے کیے ہیں ان کی بقدر ضرورت تاریخی تفصیل کہ اس کے بغیر قرآن حکیم کا وہ مطمح نظر پورا سامنے نہیں آسکتا جو ان آیات سے متعلق ہے۔ دوسرے یہ کہ توراۃ وانجیل اور قرآن حکیم کے مقاصد کا تقابلی انداز سے موازنہ کہ اس کے بغیر قرآنی مقاصد کی بالادستی اور برتری سامنے نہیں آسکتی تھی۔ اس جلیل القدر تفسیر میں کتاب کھولتے ہی پہلی نظر میں یہی دو مقصد سامنے آگئے اور عرصۂ دراز کی تشنگی اکدم بجھتی نظر آئی۔ اس لیے میں اپنے اس ذہنی نقطۂ نظر سے انہی دو پہلوؤں کو تفسیر کے امتیازی پہلو سمجھنے پر مجبور ہوگیا۔ مولانا ممدوح نے جس کمال ایجاز بیانی سے ان تاریخی اور علمی تفصیلات کے دریا کو کوزے میں بند کرکے پیش فرمایا ہے وہ بلاشبہ انہی کا حصہ ہے۔ تفسیر کے دوسرے پہلو، بلیغ تفہیم، مطالب قرآنی کی واضح تقریرات، اس کے علمی مکنونات کو بہ آسانی منظر عام پر لاکر رکھ دینا مسائل کے ساتھ موثر دلائل وغیرہ بلاشبہ تفسیری کمالات ہیں لیکن خود تفسیر کے مبانی کو کھول دینا جن پر تفسیر ہی معلق ہو بلاشبہ امتیازی کمال ہے''۔ (ملاحظہ ہو: تفسیر ماجدی نقد ونظر، ص: ۳۷و۳۸)

مولانا محمد اویس نگرامی ندویؒ سابق شیخ التفسیر دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ رقم طراز ہیں:

''مفردات قرآن کی تحقیق، نحوی مشکلات پر تنبیہ، ادبی لطائف کا ذکر، کلامی مباحث کی ضروری تشریح، تاریخی واقعات پر مستند معلومات، آیات سے مستنبط مسائل کی طرف اشارات، یہ امور اس تفسیر کی اہم خصوصیات میں سے ہیں۔ زبان کی سلاست اور روانی ان سب سے ماسوا ہے۔ پورے وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اس دور میں جو اہم

علمی خدمات انجام پائی ہیں یہ تفسیر ان میں ایک ممتاز درجہ رکھتی ہے اور ان شاء اللہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ، علماء اور مدارس عربیہ کے منتہی طلبہ، سب کے لیے مفید اور بے حد کارآمد ثابت ہوگی''۔ (ملاحظہ ہو حوالۂ بالا)

مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ مدیر ماہ نامہ برہان دہلی کی رائے:

''مولانا کی تصنیفی زندگی کا آغاز ایک فلسفی اور اردو شعر و ادب کے ایک نقاد کی حیثیت سے ہوا۔ مطالعے کے دھنی اور رسیا، نظر میں وسعت اور ذہانت و فطانت خداداد، اس زمانے کے باکمال ارباب قلم کی معیت و صحبت، پھر سب سے بڑی بات یہ کہ انشا و تحریر کا ایک منفرد اسلوب، ان سب چیزوں نے مل جل کر عنفوان شباب میں ہی اردو زبان کا ایک ممتاز ادیب اور مصنف بنا دیا۔ مولانا نے تذکرہ و سوانح، شعر و ادب، تاریخ و فلسفہ اور اجتماعی مسائل، ان سب پر بہت کچھ لکھا اور اچھے سے اچھا لکھا لیکن آپ کا سب سے بڑا کارنامہ، جو بقائے دوام کا ضامن ہے وہ انگریزی اور اردو میں ترجمہ و تفسیر کلام مجید ہے۔

.... تفسیر ماجدی کے بعد جن حضرات نے قرآن مجید کی تفسیر یا اس کی تفہیم کے سلسلے میں ان موضوعات پر لکھا ہے اس میں انہوں نے درحقیقت مولانا کی ہی خوشہ چینی کی ہے۔ مولانا کے خامۂ زرنگار سے جو مضمون نکل گیا سدا بہار ہو گیا، لیکن علمی، تحقیقی اور ادبی حیثیت سے تفسیر ماجدی مولانا کا وہ عظیم الشان کارنامہ ہے جس کی آب و تاب وقت گزرنے کے ساتھ اور بڑھے گی اور آئندہ نسلیں شکر گزاری کے ساتھ انہیں یاد کریں گی''۔ (ملاحظہ ہو: حوالہ مذکور، ص: ۴۳، ۴۴)

مولانا محمد منظور نعمانیؒ مدیر ماہ نامہ الفرقان لکھنؤ تحریر کرتے ہیں:

''مولانا نے اتنا لکھا کہ ان کے معاصرین میں شاید ہی کسی نے اتنا لکھا ہو، لیکن ان کا سب سے بڑا کارنامہ ان کی تفسیر قرآن ہے۔ چوں کہ مولانا کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور خاص کر یہود و نصاریٰ کی تاریخ اور توراۃ و انجیل وغیرہ صحف قدیم کی شروح اور ان سے

متعلق کتابوں کے مطالعے کا انھوں نے خاص اہتمام فرمایا تھا، اس لیے ان کی تفسیر میں بہت سی ایسی چیزیں مل جاتی ہیں جو دوسری تفسیروں میں نہیں ملتیں اور قرآن پاک کے سمجھنے میں ان سے بڑی مدد اور رہ نمائی ملتی ہے''۔ (ملاحظہ ہو: حوالہ سابق، ص: ۴۵)

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ رقم طراز ہیں:

''اس کارِ عظیم کو انجام دینے کے لیے مولانا عبدالماجد دریابادی رحمۃ اللہ علیہ نے کمر ہمت باندھی اور انگریزی اور اردو میں اپنے تفسیری نوٹس کے ذریعے اس خدمت کو انجام دیا۔ اس کام کی تکمیل کے لیے ہمارے علم میں وہ موزوں ترین آدمی تھے۔ اس لیے کہ وہ جدید علوم میں بصیرت رکھتے تھے، ان کو مطالعے کا شوق نہیں بلکہ عشق تھا۔ ان کی نظر میں غیر معمولی وسعت اور ثقافت میں تنوع تھا، وہ جدید طبقے کی نفسیات اور ذہنی ساخت سے واقف تھے، علم کے تیز رفتار رواں دواں قافلے سے وہ کبھی پچھڑنے نہیں پائے۔ اور اس تفسیری خدمت کے دوران میں تو انہوں نے خاص طور پر اس کا اہتمام رکھا کہ کوئی ایسی کتاب ان کی نظر و مطالعے سے بچنے نہ پائے جس سے قرآن مجید کے بیانات کی تصدیق میں کچھ بھی مدد ملتی ہو۔ سالہا سال کی اس کوشش و مطالعے، اور عرق ریزی کا نتیجہ ان کی انگریزی اور اردو کی تفسیر ہے۔

''تفسیر ماجدی'' اپنی بعض خصوصیات میں منفرد ہے اور تمام تفسیری ذخیرے کی موجودگی میں اس کی بہر حال ضرورت تھی۔ قرآن مجید کے بیسیوں مقامات ایسے ہیں کہ ان میں قرآن کا اعجاز اور وحی محمدیؐ کی صداقت پورے طور پر اس وقت تک عیاں نہیں ہو سکتی جب تک کہ ان آیات کا تاریخی پس منظر سامنے نہ ہو اور جن اقوال و عقائد کی تردید یا نفی کی گئی ہو، ان کی حقیقت و اصلیت اور ان کی اس دور میں اہمیت و مقبولیت و عمومیت معلوم نہ ہو، اس سلسلے میں مولانا عبدالماجد صاحب نے ایک نہایت قابل قدر خدمت انجام دی

ہے، جس کا شکر یہ ان سب لوگوں پر واجب ہے جو مغربی زبانوں سے براہ راست واقفیت نہ رکھنے کی وجہ سے ان ماخذوں سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے، یا ان کے پاس اتنا وقت اور ایسا وسیع کتب خانہ نہیں ہے۔ قرآنی واقعات وقصص اور مقامات وامکنہ، نیز اشخاص واقوام اور مذاہب وفرق سے متعلق انہوں نے اتنا مواد جمع کر دیا ہے جو یکجا نہیں مل سکتا، پھر جہاں تک میری نظر پڑی ہے، وہ مسلک سلف سے ہٹے نہیں ہیں۔

ہمارے محدود علم میں (اور یہ بات وسیع سفروں اور سیاحتوں، یورپ اور امریکہ کے سفروں اور وہاں کی بہت سی علمی کوششوں سے واقفیت کے بعد لکھی جارہی ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے ہندوستان کے ایک محقق اور فاضل یگانہ اور خادم دین مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کو توفیق دی کہ وہ تقابلِ مذاہب اور تقابلِ صحف سماوی کا منظم، وسیع اور مخلصانہ مطالعہ فرمائیں اور کم سے کم انگریزی میں شایع ہونے والی تنقیدی، احتسابی وتقابلی کتابوں، موسوعات، انسائیکلو پیڈیاز اور وقتاً فوقتاً شایع ہونے والے مضامین ومباحث کا مطالعہ جاری رکھیں اور ان کے حوالے ونشان دہی سے بدیہی حقائق کی طرح قرآن مجید کے اعجاز اور اس کی محفوظیت اور تورات وانجیل کے تحریفات، خارجی اضافات اور ذات وصفات خداوندی کے خلاف بیانات اور نسبتوں سے پردہ اٹھائیں۔ یہ ایک خادمِ دین مترجم ومفسر قرآن کا وہ کارنامہ اور اس کے اخلاص وبلند ہمتی کا شاہ کار ہے، جس میں راقم حروف کی نظر میں ان کا اس عہد میں نہ صرف ہندوستان بلکہ کسی اسلامی ملک میں بھی کوئی ہم سر اور نظیر نظر نہیں آتا"۔ (ملاحظہ ہو: مقدمہ تفسیر ماجدی جلد اول، شایع کردہ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ)

مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندویؒ معتمد تعلیم ندوۃ العلماء لکھنؤ تفسیر ماجدی کی خصوصیات کے سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں:

"تفسیر ماجدی کی انفرادیت کا چوتھا رخ یہ ہے کہ یہ تفسیر مفسر گر ہے۔ اگر کسی ایک کتاب میں کسی کو دیکھنا ہو کہ قدماء نے کیا لکھا ہے اور کن الفاظ میں لکھا ہے، وہ اس کو تفسیر ماجدی میں پالے گا۔ محققین کی تازہ سے تازہ تحقیقات معلوم کرنا ہو تو اس کا مکمل مواد اس

تفسیر میں پائیں گے۔ایک لفظ کے اگر متعدد معانی مختلف مفسروں نے بیان کیے ہیں، اگر ان کو کوئی یک جا رکھنا چاہے تو اس کو اس تفسیر میں مل جائے گا۔نحوی ترکیب کے کسی گوشے یا شوشے میں الجھن پیش آرہی ہو تو تفسیر ماجدی میں اس کا حل ہے ــــــ واعظانہ اسلوب اور دل کو نرم کرنے والے اور قلب کی سختی کو موم بنانے والے واقعات جو روح المعانی آلوسی میں ملتے ہیں، وہ بھی یہاں موجود ہیں۔انداز بیان تفسیر فلسفیانہ اور علمی موشگافیاں کرنے والوں کے جیسا خشک نہیں بلکہ اس میں زبان کی آب اور طرز بیان کی تب وتاب بھی ہے۔ایسی مضمون آفرینی نہیں ہے جو کسی صاحب ذوق کے ذوق پر گراں ہو، نیز زبان وادب کی چاشنی پر معانی کو قربان نہیں کیا ہے اور نہ کوئی ایسی بات لکھی ہے جو سلف کے اقوال سے متعارض ہو"۔(ملاحظہ ہو:تفسیر ماجدی نقد ونظر، ص:۷۱-۷۲)

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ تحریر فرماتے ہیں:

"مولانا عبدالماجد دریابادی رحمۃ اللہ علیہ اپنے علمی سفر میں اس علم خالص سے جو دینی حقائق کو تسلیم کرنے سے گریز رکھتا ہے گزر کر اس علم تک پہنچے جو دینی حقائق کو بھی تسلیم کرتا ہے، پھر مزید اس سے آگے بڑھ کر دینی حقائق کو اوّلیت اور فوقیت دینے کی منزل تک پہنچے، پھر مزید ترقی کر کے انہوں نے اس کو اپنے فکر واعتقاد کا اوڑھنا بچھونا بنالیا۔ اتنے مراحل سے گزرنے سے ان میں کسی مخالف مذہب صاحب علم کے علم سے خواہ وہ کتنا بڑھا ہوا ہو مرعوبیت نہیں رہی۔وہ فلسفے کے بھی طالب علم رہے تھے اور اخلاق واجتماع کو بھی انہوں نے اپنے مطالعے وتحقیق کی جولان گاہ بنایا تھا، پھر اس سے ترقی کر کے وہاں تک پہنچے جہاں محدود علمی دائروں میں پھنس کر رہ جانے کا خطرہ بھی نہیں رہا اور جہاں سے فلسفہ واخلاق واجتماع کی کمزوریاں بھی ان کی نظر کی زد میں رہیں۔وہ اگر ایک طرف علوم دینیہ سے اشتغال رکھنے والے شخص کی معلومات میں اضافہ کرتے ہیں، تو دوسری طرف عصری ذہن کو جو علم کے معروضی مطالعے تک محدود رہتا ہو، متاثر کرتے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے قلم کو ایک خاص اثر پزیری اور ان کی تحریر کو رعنائی حاصل رہی جس کے زور سے جب وہ کوئی عام اور سہل عنوان اختیار کرتے تو اس میں بھی لطف پیدا کر دیتے تھے، چناں چہ عام ثقافتی اور سماجی موضوعات پر ان کی تحریریں بڑے شوق و ذوق سے پڑھی جاتی تھیں اور اس میں ان کے فقروں اور نکتہ آفرینیوں سے لطف و استفادے کا ایک باب کھل جاتا ہے، لیکن قرآن مجید کو جس کا کلام معجز بیان عظیم و پُر وقار زبان اور فصیح و بلیغ عبارت کا کامل وصف رکھتا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ اس کو عظیم تقدس و عظمت حاصل ہے، مولاناؒ نے اس کی ترجمانی میں ادب کی بے باکی اور عبارت کی اثر انگیزی کو احتیاط کے حدود سے نکلنے نہیں دیا ہے، بلکہ قرآن مجید کے الفاظ و عبارت کی روح کو سمجھنے اور سمجھ کر پوری امانت داری کے ساتھ اس کے مفہوم کو ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس طرح مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر قرآن اپنی ایک انفرادیت رکھتی ہے، اس سے ایک عصری تعلیم کا حامل، ایک عام ثقافت کا مالک اور علوم دینیہ کا ایک طالب علم سب ہی کو یکساں فائدہ حاصل ہوتا ہے۔

تفسیر ماجدی کا یہ عظیم کام متعدد اہم خصوصیات کا حامل ہے۔ اس کا امتیاز دوسری تفسیری کتابوں پر خاص طور پر یہ ہے کہ اس کے مصنف نے صرف عربی تفاسیر کے مطالعے و واقفیت سے ہی کام نہیں لیا بلکہ عصر جدید کی تحقیقات و معلومات سے واقفیت اور یہودی و مسیحی کتابوں سے تائیدی و تصدیقی مواد کا حصول اور اس کے ذریعہ قرآنی معلومات کی تقویت و شہادت کا بھی پورا فائدہ اٹھایا۔ امید ہے کہ یہ تفسیر مصنف رحمۃ اللہ علیہ کے لیے بڑا ذخیرۂ آخرت بنے گی۔ (ملاحظہ ہو: تفسیر ماجدی نقد و نظر، ص: ۷۷ تا ۷۹)

تفسیر ماجدی (انگریزی ۴ جلدیں اور اردو ۷ جلدیں) کے نظر ثانی و اضافہ شدہ ایڈیشن مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، ندوۃ العلماء لکھنؤ میں دست یاب ہیں۔ اسی طرح ایک جلد میں ملخص انگریزی تفسیر شایع کردہ صدق فاؤنڈیشن لکھنؤ بھی مجلس میں موجود ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ

ادیب، ادیب گر

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی پیدائش اس دور میں ہوئی جو اپنی عقلیت پسندی کے لیے مشہور تھا۔ وہ بھی اس فضا سے متاثر ہوئے اور تشکیک وارتیاب کے میدان میں مدتوں سراب گردی کرتے رہے۔ لیکن انہوں نے بالآخر اسلام کے سایۂ عاطفت میں پناہ لی۔ اس کے بعد وہ ایک مصلح اور معلم اخلاق کے روپ میں نمایاں ہوئے۔ انہوں نے اپنے اخلاقی صحیفوں ہفتہ وار ''سچ''، ''صدق'' اور ''صدق جدید'' کے ذریعے ملت کی اصلاح کا کام انجام دیا۔ ان کی تحریروں میں سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ادب کی ہر صنف میں ان کی اسلامیت پوری تابندگی سے بے دار ہے۔ تفسیر اور سیرت نبوی تو خالص دینی موضوعات ہیں، تنقید وتبصرے میں بھی ان کی یہی خصوصیت خاص طور پر نمایاں ہے۔ ادب کے سلسلے میں وہ ادب برائے ادب نہیں برائے اصلاح کے قائل تھے۔

مولانا دریابادیؒ نے بتوفیق الٰہی خوب لکھا اور اس طرح لکھا کہ مثنوی مولانا رومؒ کا یہ شعر ذرا سی لفظی ترمیم ''در مناجاتم'' کی جگہ ''در مقالاتم'' کے بعد ان کے حال کا غماز ہے۔

در جگر افتادہ ہستم صد شرر
در مناجاتم بہ بیں خون جگر

یعنی: میرے جگر میں صدہا چنگاریاں دبی ہوئی ہیں اور میری مناجات کو دیکھو اس

سے خون جگر ٹپکتا ہوا ملے گا۔

مولانا دریابادیؒ نے برسوں قبل یہ لفظی ترمیم مولانا عثمان فارقلیطؒ سابق مدیر روز نامہ الجمعیۃ نئی دہلی کے لیے کی تھی۔

مولانا دریابادی علمی و تصنیفی دنیا میں اپنے ''محسن اول اور استاد کامل'' علامہ شبلی نعمانی پر تحریر کردہ اپنے لائق مطالعہ مضمون ''شبلی: انسان، مصنف، مصنف گر'' میں تصنیف و تالیف کے سلسلے میں چند اہم اور بنیادی اصول تحریر کرتے ہیں:

''تصنیف و تالیف جب خود ایک مستقل آرٹ ٹھہرا تو آرٹسٹ یا فن کار کے لیے لازم ہے کہ اسے ناظرین یا تمکین کی طبیعت پر، جبلت پر، نفسیت پر پورا عبور حاصل ہو۔ عبارت دقیق ہو، ثقیل نہ ہو۔ سلیس ہو، سپاٹ نہ ہو۔ سنجیدہ ہو، خشک نہ ہو۔ عام فہم ہو، عامیانہ نہ ہو۔ لطیف ہو، رکیک نہ ہو۔ ٹھوس ہو، ٹھس نہ ہو۔ فکر انگیز ہو، مگر بور کرنے والی نہ ہو۔ پرزور ہو، مگر پُرشور نہ ہو''۔ (ملاحظہ ہو: ص ۲۹۱، انشائے ماجدی)

مولانا دریابادی کی ادبی و انشائی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے ماہ نامہ معارف کے فاضل مبصر (م، غالباً مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی) رقم طراز ہیں:

''اردو زبان و ادب میں مولانا کی حیثیت امام و مجتہد کی ہے، ان کا فطری ذوق ادب و انشا ہے اور وہ ان کی طبیعت میں اتنا رچا اور بسا ہوا ہے کہ ان کی کوئی تحریر بھی اس سے خالی نہیں ہوتی، عطر کسی چیز کا بھی ہو اس کی زمین ہمیشہ چنبیلی کے پھولوں کی ہو گی، اسی طرح مولانا کی خالص مذہبی، تبلیغی اور اصلاحی تحریریں بھی ادب میں بسی رہتی ہیں، اور عروس ادب کا جمال ''حجاب شرعی'' میں بھی نہیں چھپتا، مگر اس کا اصلی کمال ادبی مضامین میں نظر آتا ہے، اور یہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ زبان و ادب کا یہ ذوق اقلیم ادب پر حکمرانی، زبان کا یہ لطف اور ادب و انشا کی یہ لطافتیں اب کہنہ مشق ادیبوں میں بھی خال خال نظر آتی ہیں''۔ (تبصرہ بر ''انشائے ماجدی'' حصہ دوم مشمولہ ماہ نامہ معارف اعظم گڑھ، بابت ماہ جون ۱۹۶۲ء، عدد ٦، جلد ۸۹)

زیرِ نظر مضمون میں مولانا دریابادیؒ کے خامہ صدق نگار کی چند تصنیفات کے کچھ اقتباسات پیش ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے بے شمار بندے حج کرنے جاتے ہیں۔ مولانا دریابادیؒ نے بھی توفیق ایزدی سے حج کیا۔ اس حج کا سفر نامہ جو ''سفر حجاز'' کے نام سے شایع ہوا اپنی خصوصیات و محاسن کے اعتبار سے انشائے ماجد کا بہترین نمونہ ہے۔ مولاناؒ نے اس کے دیباچہ میں لکھا ہے :

''کعبہ کی تجلیات ربوبیت آج بھی وہی، مدینہ کے انوار رسالت آج بھی وہی، بندوں کے سروں میں سودائے عبدیت وہی، افراد امت کے دلوں میں ہوائے شوق وہی۔ کتاب اصلاً نمونہ ٹھہری خوشی و تاثرات کا۔''

خشیت الٰہی اور گناہوں کے احساس نے حج کے اس ماجدی سفر نامہ میں ایک انوکھی تاثیر پیدا کر دی ہے۔ پڑھتے جایے اور آپ کو محسوس ہوتا جائے گا کہ لکھنے والا رحمت خداوندی کی طلب میں کس قدر بے چین ہے۔ مولانا تحریر کرتے ہیں :

''شان کریمی کے حوصلے دیکھنا کیسے نامہ سیاہ کو نوازا جا رہا ہے۔ کس ننگ خلائق کو سرفراز کیا جا رہا ہے............ مولیٰ ہر بے کس کی لاج تیرے ہاتھ میں ہے! ہر مفلس کا آسرا تیرا ہی دست کرم ہے، تو اپنے در سے محروم نہ واپس کرنا............ بیت کے ساتھ رب البیت کے انوار جمال کی بھی جھلک اپنے ظرف و بساط کے لائق نصیب ہو! مُردوں کو جلانے والے مالک! مایوسوں کو خوش خبری دینے والے مولیٰ! بے کسوں کی دستگیری کرنے والے آقا! دلوں کے زخم پر مرہم رکھنے والے پروردگار! تجھ سے بھاگا ہوا تیرا نافرمان غلام تیرے اور تیرے حبیبؐ کے آستانے پاک پر سر رکھنے کو حاضر ہو رہا ہے۔ دعاؤں کا قبول کرنا تیرے ہی ہاتھ ہے اور دعاؤں کی توفیق دینا بھی تیرے ہی ہاتھ میں۔''

مولانا دریابادیؒ کی سیرت نگاری کا ایک نمونہ۔ یہ اقتباس ان کی کتاب ''ذکر

رسولؐ ' سے لیا گیا ہے۔

'' مکہ کے بے کس و بے کس یتیم، غار حرا میں مراقبہ کرنے والے گوشہ نشین! دیکھ لی تیرے مرتبے کی بلندی دیکھ لی۔ تیری شان محبوبیت کا نظارہ کرلیا۔ خادموں اور غلاموں ہی نے نہیں، منکروں اور حاسدوں، بد باطنوں اور کور چشموں تک نے تیرے آفتاب اقبال کی چمک دیکھ لی۔ جو تجھ سے ٹکرایا مٹادیا گیا، توڑ دیا گیا، پاش پاش کردیا گیا۔ جو تیرے سامنے جھکا نوازا گیا، سرفراز ہوا اور اپنی مراد کو پہنچا۔ ابوجہل اور فرزند خطاب دونوں تیرے حق میں یکساں تھے۔ ابوجہل نے تجھ سے دشمنی کی، اپنے آپ سے دشمنی کرلی۔ عقل و دانش، نیک نامی و اقبال مندی، آفتاب و ماہتاب، زمین و آسمان سب اس کے دشمن ہوگئے۔ فرزند خطاب نے اپنا سر تیرے آگے جھکا دیا سب اس کے آگے جھک گئے۔ خزانے جھکے، فوج و لشکر جھکے، اقبال و حشم جھکا، ناموری و اقبال مندی جھکی، شام و ایران، مصر و عراق کے تخت و تاج جھکے، ایک عالم کا عالم صولت فاروقی کے آگے جھک گیا۔ (صفحہ ۸۴)

مولانا دریابادیؒ نے ''حکیم الامت-نقوش وتاثرات'' اور ''محمد علی-ذاتی ڈائری کے چند ورق'' کے نام سے دو کتابیں لکھ کر اردو کے سوانحی ادب میں گرانقدر اضافہ کیا ہے۔

ایک اقتباس ''حکیم الامت-نقوش وتاثرات'' سے، جو رقت آفرینی اور حسرت سامانی میں اپنی مثال آپ ہے۔ یہ موقع ہے مسترشد دریابادیؒ کا مرشد تھانویؒ کے مزار پر حاضری کا:

''تھانہ بھون کی حاضری اس ۱۵ برس کے عرصہ میں خدا جانے کتنی بار ہوچکی تھی۔ آج کا سفر ان سارے سفروں سے کتنا مختلف تھا! ہر بار کتنا اشتیاق ہوتا تھا، کیسا قوی اور کامل یقین کہ دکان کھلی ہوئی ہے مطب گرم ہے، جاتے اور پہنچتے ہی مرہم شفا ہاتھ میں ہوگا۔ ہر درد کی دوا، ہر فکر و غم سے تشفی! آج رت بدلی ہوئی تھی، آج قسمت پلٹی ہوئی تھی۔ دکان بند، مطب اجاڑ، شفا کے بجائے حسرت شفا! دوا کی جگہ دوا کی یاد! مکین کے عوض صرف مکان! ....خوش گوار یادوں کا محفوظ رہ جانا بھی اللہ کی کتنی بڑی رحمت ہے!

۱۵ برس کا خوب جانا پہچانا ہوا، پچاسوں بار کا چڑھا اترا ہوا اسٹیشن آج کچھ اجنبی

ساتھا۔ ہر بار حضرت کا کوئی خادم اسٹیشن پر عزت افزائی کے لیے موجود ہوتا تھا اور ایک آدھ بار تو حضرت نے کرم کی حد کردی تھی کہ بہ نفس نفیس تشریف لے آئے تھے۔ آج یہ سب خواب وخیال تھا۔ اسٹیشن سے مزار کا فاصلہ ہی کتنا، پورے دو فرلانگ بھی تو نہیں۔ اور مزار؟ آہ مزار! نہ کوئی بلند گنبد، نہ کوئی کلس دار قبہ، نہ چار دیواری، نہ ''آستانہ'' نہ جنگلہ، نہ کٹہرا۔ ایک اوسط درجے کی وسعت کا باغ۔ ایک سمت میں ایک مختصر پر فضا عمارت۔ وسط باغ میں چند گز مربع کا ایک مسطح تختہ اور وہی اللہ کے اس شیر کی خواب گاہ! نہ شامیانہ نہ چھت، صرف آسمان کی کھلی ہوئی چھت کے نیچے ایک نیچی سی کچی تربت! سادگی کی تصویر، صاحب قبر کی بے نفسی کا آئینہ! نہ لوح نہ کتبہ، نہ پھول نہ چادر۔ چند قدم کے فاصلے پر وصل بلگرامی مرحوم اور دوسرے مخلصین پیشوائی کے شوق میں پہلے ہی سے پہنچے ہوئے۔ شیخ کی قبر ان قبروں سے بھی پست!'' .... (صفحہ ٦١١)

سوانح نگاری کے باب میں مولانا دریابادیؒ کی دوسری لائق رشک علمی کاوش ''محمد علی-ذاتی ڈائری کے چند ورق'' سے ایک اقتباس :

''شب برأت ایک خیر وبرکت والی رات ہے۔ کسے خبر تھی کہ شب، شب قیامت یا نمونۂ شب قیامت بھی بن سکتی ہے۔ مسلمان تو اس رات کو جاگ جاگ کر گزارتے ہیں۔ کون کہہ سکتا تھا کہ اب کی اسی رات کو ان کا نصیبہ سلا دیا جائے گا۔ زندگیاں مانگتے ہیں، صحت کے لیے گڑگڑاتے ہیں، کسے خیال تھا کہ عین اس وقت اسے اٹھا لیا جائے گا جس کے وجود سے ملت اسلامیہ کا وجود تھا۔ جس کی زندگی ساری قوم کی زندگی تھی، اور جس کی موت اللہ کا نام جپنے والوں کی موت، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کلمہ پڑھنے والوں کی موت ہے۔ اس پچھلے زمانے میں مسلمانوں پر کیا کیا نہیں گزری۔ کیسے کیسے اکابر اٹھا لیے گئے۔ ہندوستان کے اندر اور ہندوستان کے باہر کیا کچھ جھیلنا نہیں پڑا۔ انگریزوں نے رگیدا، ہندوؤں نے دبایا، ترکوں پر ''اتحادیوں'' کا نرغہ ہوا، شریف نے بغاوت کی، مدینہ کی بستی تباہ ہوئی، مکہ لٹا، خلافت مٹی، افغانستان تہ وبالا ہوا، عراق میں خاک اڑی، مصر کا سردار اٹھ

گیا، شام میں آسمان رویا، فلسطین میں زمین تھرائی، یہ سب کچھ ہوا اور ہوتا رہا۔ ایک محمد علی کا دم ہر زخم کے لیے مرہم تھا۔ ہر تازہ صدمے کے وقت دل کو ذرا تسکین ہوتی تھی تو اس خیال سے کہ کچھ بھی چلا جائے محمد علی تو ہم میں موجود ہے۔ آہ! شعبان ۱۳۴۹ھ کی شب مبارک کو یہ آخری سہارا بھی چھن گیا۔ اور جس پاک و بے نیاز نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ منادی کردی تھی کہ "وما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل أفائن مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم" اس کے فرشتوں نے بندوں تک محمد ﷺ کے ایک وفادار غلام محمد علی کے لیے بھی یہی صدا پہنچادی۔" (صفحہ ۵۶۴-۵۶۵)

ناظرین با تمکین یہ بات بخوبی جانتے ہوں گے کہ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے صحیفوں "سچ، صدق، صدق جدید" کا افتتاحی کالم 'سچی باتیں' کتنا مشہور تھا۔ ان کی یہ "سچی باتیں" دینی، علمی، اخلاقی، ادبی اور معاشرتی موضوعات کی جامع ہوتی تھیں۔ ان میں فکر و تدبر، عبرت و موعظت کے بیش قیمت عناصر ہوتے تھے۔ انہی سچی باتوں کا ایک نمونہ ملاحظہ فرمائیے:

"زمین خشک، مردہ بے جان پڑی ہوتی ہے۔ جب "آسمان" سے پانی برستا ہے، اسی وقت ہر طرف تازگی و شادابی پھیل جاتی ہے، سبزہ لہلہانے لگتا ہے، پھول کھلنے لگتے ہیں، اور ذرہ ذرہ میں گویا جان پڑ جاتی ہے۔ زمین پر تاریکی چھائی ہوتی ہے، ہر چیز اندھیرے کے حجاب میں لپٹی ہوتی ہے جب "آسمان" پر آفتاب طلوع ہوتا ہے اور اس کی کرنیں زمین پر پہنچتی ہیں تو ہر شے روشن ہو جاتی ہے، ہر طرف نور پھیل جاتا ہے، کوئی چیز چھپی ہوئی یا دھندلی نہیں رہ جاتی۔ اور ذرہ ذرہ جگمگانے لگتا ہے۔ آفتاب جب چھپ جاتا ہے، تو زمین پھر بے نور رہ جاتی ہے اور سارا منظر بے روپ، بھیانک، اور بے رونق ہو جاتا ہے۔ جب "آسمان" پر چاند اور تارے طلوع ہوتے ہیں، تو یہ بدمنظری پھر دور ہو جاتی ہے، اور آنکھوں کے سامنے زینت، رونق، اور خوش نمائی کا ایک سماں پھرنے لگتا ہے۔ درخت جب خشک ہو جاتے ہیں، سبزہ جب جل جاتا ہے، زمین جب پیاسی ہو کر تپنے لگتی ہے،

دریاؤں کے لبوں پر جب ریت کی پپڑیاں جم جاتی ہیں، تو آسمان ہی کی بارش، اپنے فیض وکرم سے ان سب کو سیراب، سب کو تروتازہ اور سب کو شاداب کر دیتی ہے۔ اگر آسمان کی (یا اس کے بجائے ہیئت جدیدہ کا جو بھی اصطلاحی لفظ رکھا جائے) یاری و دست گیری قدم قدم پر سہارا نہ دیتی رہتی، تو نہ آج زمین موجود ہوتی، نہ زمین کی دلچسپیاں اور نہ خوشنمائیاں، نہ زینتیں اور رونقیں، نہ آرائشیں اور آسائشیں۔'' (سچی باتیں، جلد اول، صفحہ ۱۱۱)

توحید بیانی کا یہ پیرایہ کس قدر جان دار اور موثر ہے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے طلبائے قدیم کے سالانہ جلسے میں مولانا نے جو خطبہ دیا وہ ''ندوۃ العلماء کا پیام فرزندان دارالعلوم'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''رحمتیں اس مکان کے در و دیوار پر۔ رحمتیں اس چمن کے صحن و سبزہ زار پر۔ رحمت ان پر جنہوں نے اس رحمت و سلامتی کی یہ سبیل لگا دی۔ رحمت اس کے پینے والوں پر، رحمت اس کے پلانے والوں پر، رحمت جوانان جرعہ نوش پر، رحمت پیران مے فروش پر!'' (صفحہ ۷)

نواب مرزا شوق لکھنوی کی مثنوی ''زہر عشق'' پر تبصرہ کا اختتام یوں کرتے ہیں:

''مشرق کے بدنام سخن گو، اردو کے بدنام شاعر رخصت! تو درد بھرا دل رکھتا تھا تیری یاد بھی درد والوں کے دلوں میں زندہ رہے گی، تو نے موت کو یاد رکھا، تیرے نام پر بھی موت نہ آنے پائے گی۔ تو نے غفلتوں اور سرمستیوں کی داستان کو خوب پھیلایا، شائد کسی کی رحمت بے حساب پر تکیہ کر کے۔ لیکن انہی غافلوں اور سرمستوں کو موت وانجام کی یاد دلا کر بھی خوب رلایا۔ کسی کی عظمت بے پایاں کا خوف کر کے۔ عجب کیا کہ خدائے آمرزگار، اس عالم کا ستار اور اس عالم کا غفار تیری خطاؤں اور لغزشوں کو اپنے دامن عفو و مغفرت کے سائے میں لے لے اور تیرے کلام کے درد و عبرت، تیرے بیان کے سوز و گداز کا اجر بھی تجھے عطا کرے۔ اپنی ہی رحمت بے نہایت کی مناسبت سے، اپنے ہی کرم بے حساب کے حساب سے!'' (انشائے ماجد، صفحہ ۱۳۹)

مشہور ادیب مولانا ابوالکلام آزادؒ کے سلسلے میں لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے نشر اپنی تقریر میں مولانا دریابادیؒ نے ان کو درج ذیل الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا :

''ادب عالیہ یا کلاسکس کی اصطلاح تو اردو میں بعد کو چلی ہے۔ باقی یہ کلاسکل یا عالی قدر ادب تو مولانا کا جیسے حصہ تھا۔ ان کے قلم کا شروع ہی سے ایک امتیازی خاصہ تھا۔ تیور مردانہ، لہجہ شریفانہ، ترکیبوں میں جزالت، الفاظ میں جلالت، تشبیہوں میں جدت، استعاروں میں ندرت، خیال میں بلندی ، بیان میں صفائی، مطالب فکر انگیز، اسلوب ولولہ خیز، نثر ہر جگہ ادیبانہ، کہیں خطیبانہ، خطابت کا مزاج شاہانہ، عبارت کی سطح کہیں حکیمانہ، کہیں حاکمانہ، حکمت کی جگہ حکمت، ظرافت کی جگہ ظرافت، حکایت غم وحزن ہو یا داستان سرور ونشاط، لطافت وشادابی سطر سطر سے عیاں اور آمد اور بے ساختہ پن لفظ لفظ سے نمایاں۔ مطالعہ میں گہرائی، مشاہدہ میں گیرائی، بات میں بات پیدا کرنے کا وہ سلیقہ اور معمولی جزئیات سے دور رس نتائج نکالنے کا وہ ملکہ کہ دھوکہ حضرت رومیؒ کی مثنوی کے دفتروں کا ہونے لگے۔'' (نشریات ماجد، جلد دوم، صفحہ ۱۷)

اخذ واقتباس کے ان مختلف نمونوں سے مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے مجد علمی اور انشائے ماجدی کا پوری طرح اظہار ہوتا ہے۔

اپنی ابتدائی عمر کے چند برسوں میں عبدالماجد فلسفی کے نام سے مشہور دبستان شبلی کے اس ذہین طالب علم پر رب ماجد کا خصوصی فضل یہ ہوا کہ اپنی عمر کے پختہ دور میں بندۂ ماجد خانقاہ اشرفی کا دلق پوش ہو کر اسلامی ادب کی اشاعت کرتا ہوا دنیائے فانی سے رخصت ہوا۔

مولانا دریابادیؒ کے مسحور کن اسلوب اور مجتہدانہ طرز نگارش کو سمجھنے کے لیے ان کی تفسیر، ''تفسیر ماجدی'' ''سفر حجاز'' ''ذکر رسولؐ'' ''حکیم الامت۔نقوش وتاثرات'' ''محمد علی۔ذاتی ڈائری کے چند ورق'' ''انشائے ماجد'' ''نشریات ماجد'' ''معاصرین'' اور ''آپ بیتی'' وغیرہ کا مطالعہ از حد مفید ہوگا۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ

صحافی، صحافی گر

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فن صحافت میں ایک طرز نو کے بانی ہیں۔انہوں نے جس وقت صحافت میں قدم رکھا اس وقت اردو صحافت کے آسمان پر ایک سے بڑھ کر ایک آفتاب و ماہتاب موجود تھے۔ان کی تابانی اور ضوفشانی سے مطلع صحافت جگمگا رہا تھا۔

بیسویں صدی مسیحی کا ہندوستان زبردست ہیجانی اور التہابی دور سے گزر رہا تھا۔ برطانوی استبداد اور فرنگی استعمار نے پورے ملک کو اپنے شکنجے میں لے رکھا تھا۔آفریں ہے اردو صحافیوں کی ہمت مردانہ پر کہ وہ وطن عزیز کو دشمن کے پنجۂ ستم سے آزاد کرانے کے لیے کمر بستہ ہو گئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خاں، مولانا حسرت موہانی اور مولانا عبدالماجد دریابادی نے اردو صحافت میں ایک نئے آہنگ اور جرأت و بے خوفی کے اسلوب نو کی طرح ڈالی۔اردو صحافت نے خلافت کی بقا اور وطن عزیز کی آزادی کے سلسلے میں ناقابل فراموش قائدانہ کردار ادا کیا ہے۔

مولانا دریابادی کے معاصر صحافیوں میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خاں، خواجہ حسن نظامی، جالب دہلوی، مولانا حسرت موہانی وغیرہ ہیں۔ یہ وہ اسمائے گرامی ہیں جو بغیر کسی تلاش و تفحص کے نوک قلم پر آ گئے، ورنہ اس زمانے کے صحافیوں کی فہرست بڑی طویل ہے۔

مولانا دریابادی اپنے معاصرین میں انفرادی حیثیت اور بالکل الگ شناخت کے مالک تھے۔ وہ امتیازی شان کے حامل صحافی تھے۔ دریاباد کی یہ مشت خاک آسمان صحافت پر نیر تاباں بن کر چمکی۔ مولانا ایک ایسے صدق نگار اور صداقت شعار صحافی تھے جنہوں نے آیت ربانی "والذی جاء بالصدق وصدق به اولئك هم المتقون" (زمر: ۳۳) (ترجمہ: اور جو لوگ سچی بات لے کر آئے اور (خود بھی) اس کو سچ جانا تو یہی لوگ تو پرہیز گار ہیں) کو اپنا نصب العین بنا رکھا تھا۔

انہوں نے ہفتہ وار ''سچ'' لکھنؤ کے اولین شمارے (۲ رجنوری ۱۹۲۵ء) میں رب کریم کے حضور میں ''سچ کی مناجات'' کے عنوان سے یہ دعائیں مانگی تھیں :

''اے اپنے گم راہ بندوں کو راہِ ہدایت دکھانے والے مولیٰ، اے دلوں کی گہرائیوں پر نظر رکھنے والے آقا، اور اے سب سے بے نیاز مگر سب پر رحم وکرم کرنے والے مالک! تو واقف ہے کہ ''سچ'' کس غرض سے نکالا جارہا ہے، تجھ پر روشن ہے کہ اس کے کارکنوں کی کیا نیت ہے۔ یہ کام تیرے ان چند بندوں نے اپنے سر لیا ہے جو ہر طرح ضعیف وناتواں عاجز ودرماندہ ہیں۔ جو نہ دولت رکھتے ہیں نہ سرمایہ، نہ وجاہت رکھتے ہیں نہ قوت، نہ کوئی پارٹی رکھتے ہیں نہ کوئی گروہ، نہ انہیں اپنے علم وفضل کا دعویٰ ہے، نہ زہد وعبادت کا، نہ تقویٰ وطہارت کا انہیں محض تیرے لطف وکرم کا سہارا ہے، وہ صرف تیرے فضل وعنایت پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ ان کا پہلا اور پچھلا آسرا صرف تیری رحمت کاملہ ہے۔

دنیا میں ''سچ'' نام ہے صرف تیرا، صرف تیری ہی ذات وصفات کا۔ سچ صرف تو ہے، تیری ذات ہے، تیری ہی صفات ہیں، تیرا ہی کلام ہے، تیری ہی عبادت ہے، تیری ہی معرفت ہے، تیری ہی شریعت ہے، تیری ہی طریقت ہے، تیرا ہی نام ہے، تیری ہی یاد ہے، تیرا ہی ذکر ہے۔ سچ کو ست، ٹروتھ، حق، صدق، حقیقت، غرض جس دوسرے لفظ سے ظاہر کیا جائے تیرا ہی اسم پاک مراد ہوگا۔

اے سچائی کا بول بالا کرنے والے سچے معبود، اے سچ کو سرافرازی بخشنے والے پاک پروردگار، اے حق وحقیقت کو سربلند کرنے والے خدا، ہم کو توفیق عطا کر کہ ہم سچ بولیں، سچ برتیں اور سچ پر عمل کریں۔ خود اپنی زندگی کو سچ کے ماتحت رکھیں اور سچ کو دوسروں تک پہنچائیں اور ان میں پھیلائیں۔ تو علیم وبصیر اس سے واقف ہے کہ ہمارے قویٰ محدود، ہمارے عقلیں ناقص، ہمارے نفس ہم پر غالب ہیں۔ تیری بارگاہ میں یہ عاجزانہ التجا ہے کہ ہماری بصیرتوں کو صاف کر، ہماری عقلوں کو روشن کر، ہماری فہم کو صحیح بنا، ہمارے دلوں کو خلوص سے لب ریز کردے کہ ہمارے قلم، ہماری زبان، ہمارے اعضاء وجوارح سے جو کچھ ادا ہو وہ صرف تیرے ہی واسطے ہو۔''

رب ماجد کی بارگاہ میں بندہ ماجد کی یہ مناجات مقبول ہوئی اور دنیا اس کی گواہ ہے کہ مولانا تا زندگی اپنے قلم صدق رقم سے سچ اور حق کا پیام دیتے رہے۔

مولانا نے ۱۹۰۴ء میں جب کہ ان کی عمر بارہ برس کی تھی ''اودھ اخبار'' لکھنؤ میں ایک مضمون لکھ کر اپنی صحافت اور مضمون نگاری کا آغاز کیا۔ اس کے بعد انہوں نے ملک کے انگریزی اور اردو کے مشہور اور مقتدر اخباروں اور جریدوں میں مذہبی، علمی اور ادبی مضامین بہ کثرت لکھے۔ انہوں نے ۱۹۲۵ء میں لکھنؤ سے ہفت روزہ جریدے ''سچ'' کا اجرا کیا جو کچھ مدت کے بعد ''صدق'' اور پھر ''صدق جدید'' کے نام سے ان کی وفات ۶ رجنوری ۱۹۷۷ء تک بڑی پابندی سے نکلتا رہا۔ مؤخر الذکر جریدہ ان کی وفات کے بعد بھی کئی برسوں تک جاری رہا۔ مولانا دریابادی کی تقریباً پون صدی کی مدت مدید پر محیط صحافتی خدمات کا تذکرہ کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔

مولانا دریابادی نے قابل رشک دینی اور علمی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنی بے مثال ریاضت اور اخلاص سے صحافت کو باخدا بنا دیا۔ مولانا کے نزدیک صحافت پیشہ نہیں عبادت تھی، مشغلہ نہیں مشن تھی۔ وہ صحافت میں منافقت، اشتعال انگیزی،

فتنہ پروری، سنسنی خیزی، ریاکاری، فضیحت، خوشامد، سطحیت، بزدلی اور دوسرے رذائل کی آمیزش کے بالکل قائل نہیں تھے۔

مولانا نے جب قلم اٹھایا تو انہوں نے دکھادیا کہ صدق نگاری، صداقت شعاری اور راست بازی اپنے اندر کتنی کشش رکھتی ہے۔ صداقت قرطاس وقلم کی آبرو ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ اردو صحافت میں مولانا کی آمد سے اس کو وقار اور اعتبار حاصل ہوا ہے۔

مولانا نے اردو صحافت کو ''احتجاجی صحافت'' کے خول سے نکال کر اسے ''تعمیری صحافت'' کا دیدہ زیب پیراہن عطا کیا۔ انہوں نے اپنے قلم کو معاشرے کی اصلاح، فرد کی تربیت، کردار سازی اور ذہن سازی کے لیے وقف کردیا تھا۔ ان کا افتتاحی کالم ''سچی باتیں'' اتنا مقبول اور مشہور ہوا کہ بلا شائبہ تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ بیسویں صدی مسیحی کی اردو صحافت میں اس کی مثال نایاب نہیں کم یاب تو ضرور رہی ہے۔

کام یاب صحافی بے باکی و بے خوفی اور ہمت و جرأت کا پیکر ہوتا ہے۔ یہ بات اپنی کامل شکل میں صداقت شعار اور صدق نگار صحافی مولانا عبدالماجد دریابادی کی شخصیت میں پوری طرح جلوہ گر تھی۔ وہ ابطال باطل اور احقاق حق کے سلسلے میں کوئی سمجھوتہ نہیں کرتے تھے۔

مولانا دریابادی کے وجود سے اسلامیان ہند کا وجود تھا۔ ان کی زندگی پوری ملت کی زندگی تھی۔ ان کے ہفتہ وار جریدے جو ظاہری زیب وزینت اور دنیاوی چمک دمک سے یک سر عاری ہوتے تھے مسلمانان ہند بلکہ کل عالم اسلام کی ڈھال تھے۔ وہ درۂ احتساب تھے جو اپنے عہد کے ہر اسلام دشمن اور مسلم آزار فیصلے اور اقدام پر زور شور سے برستے تھے۔

فرنگی استعمار اور برطانوی استبداد نیز آزادی وطن کے بطن سے تقسیم ملک کا آب زلال پینے کے بعد اس مرد حق آگاہ نے جس ہمت، جرأت، حوصلے، بے باکی، بے خوفی، صدق نگاری اور بے لوث انداز میں غلط چیزوں پر انگشت نمائی کی، اس نے مولانا کو ان

کے معاصرین کے مقابلے میں امتیازی شان عطا کی۔ اس ضمن میں انہوں نے نہ صلے کی پروا کی، نہ ستایش کی تمنا کی، نہ سرکار کی درباداری کی، نہ ارباب اختیار کی قصیدہ خوانی کی اور نہ کسی ملامت گر کی ملامت کی پروا کی۔ وہ تازیست دل پرخوں کی ایک گلابی سے سرشار رہے۔ انہوں نے جو کام کیا وہ محض رحمٰن دنیا اور رحیم آخرت کی رضا کے لیے کیا۔

حق کے پرستار، صدق کے علم بردار، اسلام کی حمیت وحمایت کے قابل صدرشک جذبے سے سرشار اس عظیم صحافی نے اپنے صحیفوں کے ذریعے متعدد محاذوں پر جہاد کیا۔ ان محاذوں میں ذات وصفات باری تعالیٰ، ناموس رسول اکرمؐ اور اسلامی شریعت کی حفاظت، قرآن کریم، حدیث شریف اور صحابہ کرامؓ کی مدافعت، اسلامی تہذیب، تمدن وثقافت کی صیانت، شرک ومظاہر شرک سے تنفر، الحاد وتشکیک کی بیخ کنی، فتنہ انکار حدیث کا مقابلہ، ردشیعیت، رد بدعات، اصلاح معاشرہ، اسلام دشمن اور مسلم آزار لٹریچر کی مخالفت، اباحیت نوازی اور فحاشی کی ہر شکل سے مقابلہ آرائی، اخلاق وکردار کی بے وقعتی، اقدار صالحہ کی بے حیثیتی، تجدد، تہند اور تفرنج کی بے حقیقتی، آزادی وطن کی حمایت اور اردو کے غصب شدہ حقوق کی بازیابی جیسے موضوعات نمایاں ہیں۔

مولانا نے نیاز فتح پوری، نذیر نیازی، مرزا عظیم بیگ چغتائی، سجاد ظہیر، رشید جہاں، حافظ اسلم جے راج پوری، شاہد احمد دہلوی، خواجہ حسن نظامی، یگانہ چنگیزی اور جوش ملیح آبادی کی اسلام مخالف، مذہب بے زار اور اخلاق سوز تحریروں اور سینٹ گبریل اسکول، رنگون (برما، موجودہ میانمار) کی میگزین میں بارگاہ رسالتؐ میں گستاخانہ مواد کی اشاعت کا بھرپور نوٹس لیا۔ بسا اوقات ملت وقوم اور حکومت وقت سے ان کو سزا دلوائی۔

معروف صحافی حیات اللہ انصاری سابق بانی مدیر روزنامہ قومی آواز لکھنؤ (متوفی ۱۹۹۹ء) اپنے مضمون ''ممالک متحدہ آگرہ واودھ میں اردو'' میں ہفتہ وار پرچوں پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا دریابادی کے ہفتہ وار صدق، لکھنؤ کے متعلق لکھتے ہیں:

''صحافت کے اعتبار سے 'صدق' لکھنؤ بہت عمدہ پرچہ ہے۔ ہر بات میں لذت، باتوں باتوں میں گہری بات، حریف کے زبردست وار کو مسکرا کر خالی دے جانا، اس کے مضبوط پہلو کو بتا کر کم زور پہلو پر ہاتھ مار دینا، سنجیدہ بحثوں میں لطیف متانت، یکسانیت ضروری ہوتی ہے، مگر 'صدق' یک قلمی پرچہ ہے اور یک قلمی پرچے میں یہ بات ہوتی ہی ہے۔ اس کی صحافی ٹکنیک کا مطالعہ بہت سے پرچوں کے لیے مفید ہو سکتا ہے''۔ (ملاحظہ ہو: ص ۱۲۵، ۱۲۶۔ سہ ماہی 'اردو' دہلی جنوری ۱۹۴۴ء)

سرکردہ مورخ جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن سابق مدیر ماہ نامہ معارف اعظم گڑھ (متوفی ۱۹۸۷ء) مولانا کی صحافت اور ان کے صحیفوں کو یوں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں:

''انھوں نے 'سچ' اور 'صدق' نکال کر اپنے کو شیر دل بلکہ کفن بردوش صحافی بھی ثابت کیا۔ حکومت کا دبدبہ، قانون کا شکنجہ، انقلاب کا کوئی ہچکولہ ان کے قلم کی آزادی کو نہ روک سکا۔ مسلمانوں کے غم خوار، غم گسار اور دم ساز بن کر ان کے سیاسی الم ناک حوادث پر خون کے آنسو روئے۔ ان کی سیاسی کام یابی اور فتح پر اپنی مسرت و شادمانی کا اظہار دل کھول کر کیا۔ خواہ ان کی یہ تحریریں حکومت کی پالیسی کے خلاف ہی کیوں نہ ہوتیں۔ 'سچ' اور 'صدق جدید' میں 'سچی باتیں' لکھ کر ایمان، ایقان، اور عرفان کے موتی بکھیرتے رہے۔ اس انداز کی تحریر اب مدت مدید تک کوئی اور نہ لکھ سکے گا۔ اسی کے ساتھ اسلامی طرز فکر کی راہ چھوڑنے والوں کے خلاف خم ٹھونک کر میدان میں اترتے، کردار کو نیلام کی بولی پر بھینٹ چڑھانے والوں کے نہاں خانے میں پہنچ کر شب خون مارتے، اپنی تحریروں کی ناوک فگنی سے تجدد پسندوں کے کلیجوں کو چھلنی کرتے رہے۔ ان کے اخبار کا ایک شعر، ایک جلی سرخی، ایک زہریلا فقرہ ان کے حریفوں کے پورے مضمون پر بھاری ہوتا۔

ان کا چھوٹے سائز کا ہفتہ وار اخبار 'سچ' یا 'صدق جدید' کل آٹھ صفحے پر مشتمل

ہوتا۔ اس کو شروع سے آخر تک خود ہی لکھتے، جو ان کے قلم کی صاعقہ پاشی کی دلیل ہوتی۔ اس میں کبھی تو اعظ، کبھی فقیہ، کبھی مجتہد، کبھی مردِ مومن، کبھی مفسرِ قرآن، کبھی متکلمِ اسلام، کبھی نقاد، کبھی سیاسی مبصر اور ہاں کبھی قلم کے افراسیاب، کبھی اسلوب کے جمشید اور کبھی زورِ بیان کے رستم بن جاتے۔ وہ اپنی آخری عمر میں خوش ہوں گے کہ علم، ادب اور فن کا ایک انبار نہیں بلکہ گل و گلزار اگا کر زندگی ختم کر رہے ہیں''۔ (ملاحظہ ہو: ۲۰۲، ۲۰۳، بزمِ رفتگاں حصہ دوم)

مولانا دریابادی اردو صحافت کے متعلق تحریر کرتے ہیں:

''اُردو صحافت محض اُردو زبان کی صحافت نہیں، اردو کلچر کی مظہر و ترجمان ہے، اُردو محض ایک زبان کا نام نہیں، اُردو کلچر یا تہذیب خود ایک مستقل چیز ہے۔ اُردو تہذیب کا آئینہ ہے اور اس آئینے کی ساری جلا صرف ایک لفظ شرافت کے اندر مضمر ہے۔

حیدرآبادی تہذیب، لکھنوی تہذیب، اسی جوہر شرافت کی یادگار تھی۔ وہ جب مٹتی ہے تو ہر شریف کو اس کے مٹنے کا رنج ہوتا ہے۔

ٹھیٹھ مذہبی عقائد کا تعلق عالم غیب سے ہوتا ہے، لیکن یہ تہذیبی شرافت ایسے چیز ہے جو اسی دنیا میں بندوں کا دل بندوں سے جوڑے رہتی ہے۔ اور جب اس تہذیب کا جنازہ اٹھتا ہے تو ماتم داروں میں سب سے آگے شرافت ہی ہوتی ہے''۔ (ملاحظہ ہو: سیاحت ماجدی، ص:۱۶۶)

مولانا دریابادی نے صحافت میں جس طرزِ نو کی اساس ڈالی اس کو 'ماجدی صحافت' کہا جا سکتا ہے۔ 'ماجدی صحافت' کے اصول اور اس کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں؟ یہ جاننے کے لیے خود مولانا ہی کی ایک چشم کشا اور بیش قیمت تحریر ملاحظہ ہو۔ اس کے مطالعے سے یہ معلوم ہوگا کہ معیاری صحافت کے اصول اور ضابطے کیا ہیں؟ ایک صحافی کو اپنے فرایض کی انجام دہی میں کن امور کی پابندی کرنا چاہیے؟ صحافت جیسے فن شریف میں کن نکتوں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے؟ یہ مضمون ایک استفسار کے جواب میں ہے جو مورخہ ۲۹؍ مارچ ۱۹۶۸ء

کو صدق جدید' لکھنؤ میں ''ہفتہ وار صحافت کے آداب'' کے عنوان سے شایع ہوا ہے:

(۱) مقصود خدمت دین وملت رکھیے۔ عام خدمت خلق بھی اسی کے تحت میں آجاتی ہے۔

(۲) وطن کا بھی بڑا حق ہوتا ہے۔ جس طرح حق پڑوس کے، استاد کے اور اہل خاندان کے ہوتے ہیں۔ البتہ مسلمان ''پرستار'' وطن کا نہیں ہوسکتا۔ عبودیت کا یہ خصوصی تعلق تو صرف ذات حق کے لیے مخصوص ہے۔ اس کی مخلوق میں سے کسی کے حصے میں نہیں آسکتا۔

(۳) خبر برائے خبر کا روز ناموں میں جو بھی درجہ ہو، ہفت روزہ میں تو یہ ایک تقریباً مہمل چیز ہوگی۔ ہفت روزہ میں اپنے تبصرے سے یا کم سے کم خبر کی سرخی ہی سے ہر خبر کو با مقصد بنا کر پیش کیجیے۔

(۴) پبلک کے جذبات کی محض نمایندگی پر ہرگز اکتفا نہ کیجیے۔ پبلک کے مذاق اور جذبات کی اصلاح کی کوشش بھی ہمیشہ جاری رکھیے۔

(۵) اپنی مقبولیت اور مرجعیت کا خیال کسے نہیں ہوتا؟ ایک حد تک یہ خیال بالکل قدرتی ہے لیکن اس جذبے کو ہمیشہ حدود کے اندر رکھیے اور اپنے اوپر غالب ہرگز نہ آنے دیجیے۔

(۶) صحافت ایک قسم کی تجارت نہیں ایک قسم کی عبادت ہے۔ بس اسی کو نصب العین بنا کر ہمیشہ اپنے سامنے رکھیے۔

(۷) دوسروں کا احتساب ہر پبلک معاملے میں ضرور کیجیے، لیکن اپنے کو کبھی احتساب سے بالا نہ خیال کیجیے۔ احتساب نفس کو سب پر مقدم رکھیے۔

(۸) بلا وجہ معقول کے، کسی کی دل آزاری کیا معنی، دل شکنی بھی گوارا نہ کیجیے اور مروت کے بھی حدود قائم کر لیجیے۔ ان سے آگے قدم نہ رکھیے۔

(۹) ملک کی اکثریت کا اور حکومت وقت کے قانون کا ضرور لحاظ رکھیے۔ حتی الامکان راہ سلامت روی کی اختیار کیجیے، لیکن مرعوبیت اور احساس کم تری کی حد تک ہرگز

نہ پہنچ جائے۔ صلح وسازگاری دوسری چیز ہے اور بزدلی اور خوشامد بالکل دوسری۔

(۱۰) بلاوجہ نہ کسی سے الجھیے، نہ خواہ مخواہ تکرار پیدا کیجیے، لیکن دوسری طرف جھکیے اور گریے بھی نہیں۔

(۱۱) پبلک تنقید آزادی سے کیجیے، لیکن ذات پات پر اتر آنے سے اپنے کو اہتمام کے ساتھ بچائیے۔ کسی کے نسب پر، وطن پر یا شکل وصورت پر طنز کرنا سب ذاتیات ہی کی شکلیں ہیں۔

(۱۲) مزاح، شگفتگی، خوش طبعی، علامتیں شرافت نفس کی ہیں اور تفضیح، تضحیک اور پھکڑ بازی علامتیں دنائت اور سفلہ پن کی۔ اس فرق عظیم کو ہمیشہ نظر میں رکھیے۔

(۱۳) آپ بھی بہر حال انسان ہی ہیں اور سارے بشری جذبات رکھنے والے۔ غصے سے آپ بھی بھڑک اٹھتے ہیں۔ ایسے موقع پر نفس کو قابو میں رکھنا ہی آپ کی بلند کرداری کی دلیل ہوگی۔

(۱۴) دیانت کے امتحان بھی اس راہ میں سخت سخت آتے رہتے ہیں۔ اپنے کو بچانے کا اہتمام خاص رکھیے۔

(۱۵) غلطی کا امکان ہر بشر کی طرح آپ کے لیے بھی ہے۔ غلطی کا علم ہو جانے پر اس کے اعتراف سے، اسے واپس لینے سے، اس پر معذرت کرنے سے، ہرگز شرمایئے، جھجکیے نہیں۔

(۱۶) جس طرح زبان سے نکلی ہوئی ایک ایک بات محل گرفت ہو سکتی ہے۔ اس طرح قلم سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ بھی جرح کی زد میں آسکتا ہے۔ خیال کیجیے اور ڈرتے رہیے اُس وقت سے، جب آپ کا سارا دفتر آپ کے سامنے ہوگا اور آخری اور حقیقی عدالت میں اس کے ایک ایک لفظ پر سوال ہو رہا ہوگا۔

مولانا دریابادی تا زندگی ان بیش قیمت اصولوں پر عمل پیرا رہے اور ان کے اخبار

(سچ، صدق اور صدق جدید) بھی انہی اصولوں پر گامزن رہے۔

یہ اصول وضوابط فن صحافت کے طلبہ کے لیے بہترین معلم ہیں۔ جو صحافی ان سولہ ماجدی صحافتی آداب کی رعایت کرے گا وہ یقیناً ایک کامیاب اور قابل تقلید صحافی ہوگا۔ گو کہ مولانا دریابادی نے مذکورہ بالا آداب ہفتہ وار صحافت کے تحریر کیے ہیں لیکن اپنی افادیت اور اہمیت کے باعث ہر قسم کے صحافیوں کے لیے یہ زریں اصول بہترین رہ نما کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان اصولوں کو فن صحافت کا ضابطہ اخلاق کہا جا سکتا ہے۔

یہ کتاب

’’اس وقت میرے پیش نظران سے متعلق ایک اہم پیش کش انہی کے خاندان کے نورچشم، مولانا نعیم الرحمٰن صدیقی ندوی کی ہے جوانہوں نے ’’نقوش ماجدی‘‘ کے نام سے ترتیب دی ہے، جس میں مولانا دریابادی کے مختصر سوانح کے ساتھ ان کی تصانیف کی ایک جامع فہرست اور بعض اہم تصانیف کا تعارف و جائزہ اوران کے علمی مآثر پر بعض مضامین کا انتخاب ہے۔

امید ہے اس معتبر کتاب سے جوانہی کے گھر کے ایک علمی ذوق رکھنے والے فرد کے قلم سے نکلی، لوگ مستفید ہوں گے، اورنوجوانوں کی شخصیت سازی میں بھی یہ کتاب مفید ثابت ہوگی۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور مبارک کرے۔ آمین‘‘۔

(حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ، از ’’مقدمہ‘‘)

’’بہ اعتبار صنف یہ مولانا دریابادیؒ کی سوانح ہے کہ اس کے مطالعے سے مولاناؒ کی شخصیت، فکروفن اور کتابیات کی مکمل اور مستند تصویر سامنے آجاتی ہے۔ مولاناؒ پر مزید مطالعے کے لیے مآخذ اور حوالوں کی نشان دہی اس پر مستزاد۔

لکھنؤ کے امتیازات متعدد ہیں۔ یہ مشہور عطریات کے لیے بھی رہا ہے۔ ’’نقوش ماجدی‘‘ ایسا عطر مجموعہ ہے جس میں مولاناؒ کے علمی کمالات اور خود مصنف کے جذبۂ اخلاص اور حسن ترتیب کا عطر بھی کھنچ آیا ہے۔ اللّٰھم زد فزد۔‘‘

(پروفیسر عبدالرحیم قدوائی، از ’’دیباچہ‘‘)

’’مولانا عبدالماجد دریابادی کے فقید المثال علمی، ادبی اور مذہبی اکتسابات کو یاد کرنا اپنے ماضی کی روشن اور بلیغ وراثت سے خود کو حسی سطح پر مربوط کرنا ہے اور ناسپاسی ہوگی اگر عزیزی نعیم الرحمٰن صدیقی کی تازہ ترین تصنیف ’’نقوش ماجدی‘‘ کی تحسین نہ کی جائے کہ انہوں نے مابعد جدید دور میں جب صداقت بھی ایک اضافی شے تصور کی جانے لگی ہے، مرد حق آگاہ اور عالم بے بدل پر ایک مبسوط کتاب لکھی ہے، ان کی یہ کاوش تعارفی بھی ہے اور تجزیاتی بھی اور مولانا دریابادی کی قاموسی شخصیت کے مختلف ابعاد کا معروضی طور پر احاطہ کرتی ہے‘‘۔

(پروفیسر محمد شافع قدوائی، از ’’پیش لفظ‘‘)

Publisher
SIDQ FOUNDATION
Khatoon Manzil, Haider Mirza Road, Golaganj, Lucknow-18
www.sidqfoundation.com E-mail:info@sidqfoundation.com
E-mail: nrsiddiqui@rediffmail.com Mob.: 9335929670